Mirat-ul-Haqq

Allama F.S.Taj

مراۃ الحق

علامہ ایف۔ ایس۔ تاج

Mirror of Truth

Mirat-ul-Haq

BY

Allama F.S.Taj

مراۃ الحق

از

علامہ ایف۔ایس۔تاج

۱۹۵۹

فہرست مضامین

مضامین

مضامین	صفحہ	مضامین	صفحہ
حمد		(۴) عقل اور مذہب	
(حسن عقیدت (ایمان کی بھلائی		مذہب کی ضرورت	
سوءعقیدت		مذہب کا کام	
(۱)ویدانت		عقل کا کام	
آتمانیتہ مکت		عقل کا دائرہ عمل	
گیان		ارتقائے عقل	
مکتی ازروئے ویدانت		عقل اور موالید ثلاثہ	
انجیلی نجات		عقل کی عدم صحت	
(۲)رُوح کے متعلق عقائد		(۵)الہام کی ضرورت	
رُوح مرکب امتزاجی		جوڑا اور ترقی	
رُوح قدیم و قائم بالذات		عقل الہام کی متقاضی ہے	
رُوح مخلوق وحادث		الہام اور باطنی شریعت	
(۳)تزکیہ نفس (نفس کو پاک کرنا) وریاضت بدنی		شخصی مذہب	
		قومی مذہب	

شریعت کا مرکز		رُوح القدس کا نزول اور مذہب الٰہی کی انتہائی کمالیت	
عہد عتیق مختص بالقوم اور مختص بالزمان تھا		مسیحیت غیر اقوام میں	
توریت میں ایک عالمگیر نئے عہد کی خبر۔۔		مسیحیت ہند میں	
نئے عہد کے بانی کے متعلق مفصل خبریں		لوگ مذہب سے کیوں بیزار ہیں؟	
عہد عتیق وعہد جدید کے بانیوں کی باہمی مشابہت الہام اور مذہب الٰہی کی تدریجی۔		مذہبی بیزاری کا علاج	
کمالیت		مسیحیت کی مخالفت	
(٦)عالمگیر مذہب		**(٧)معیار الہام**	
عہد جدید کی بنیاد عہد عتیق پر		معجزہ	
توریت کا تجزیہ		پیشینگوئی	
احکام خاص		نیک سیرتی	
قربانیاں		مطابقت بہ الہام ما قبل	
ختنہ		مسیح کا اقرار	
سبت		**(٨۔)تجسم الٰہی**	
ظاہری طہارت		موجودات اور خُدا کا علم	
حلت وحرمت		الہام اور خُدا کا علم	
روزہ		ایک سعیدہ خواہش	
عیدیں		مظہر اور خُدا کا علم	
طریق عبادت		ایک بدیہی مثال	

	قدرت واختیار		احکام عام
	گناہ کے نتائج		محبت
	(۱۰)نجات		قدوسیت
	اختیاری طریقہ		تمام انبیاء کرام پر فضیلت
	جبری طریقہ		ایک اعتراض کا جواب
	ناسخ		کیا تجسم خُدا کی کسر شان ہے؟
	تزکیہ نفس (نفس کو پاک کرنا)		مسیح کامل اِنسان
	اعمال حسنہ		مسیح کن معانی میں خُدا کا بیٹا ہے؟---
	توبہ محض		مسیح اِنسان اور خُدا کا برزخ کامل----
	عدل ورحم		کلام مجسم کی تین صورتیں
	قسری ملاپ		تجسم کے فوائد
	طبعی ملاپ		**(۹)گناہ**
	نجات بالکفارہ		آغاز گناہ
	خلاصہ مطلب		ایک اعتراض کا جواب
	ایک اعتراض کا جواب		گناہ کیا ہے؟
	نجات کے مدارج		گناہ کی علت
	کفارہ مسیح کی وسعت بلحاظ تاثیر		گناہ ہمہ گیر ہے
	ابدی زندگی اور ابدی سزا		کیا گناہ اِنسان ک اصلی فطرت ہے؟
	آخری التماس		طبعی موروثی گناہ
			متعدی گناہ

التماس

معزز ناظرین! بندہ نے یہ کتاب "مراۃ الحق" طالبانِ راہِ حق کی راہنمائی وہدایت کے لئے تصنیف کی ہے۔ مراۃ آئینہ کو کہتے ہیں۔ جس طرح اِنسان آئینے میں اپنی شکل وصورت کی اصلیت کو دیکھتا ہے۔ اُسی طرح میری یہ کتاب مُتلاشیان جادہ حق کو خُدا کا جمال دکھائے گی۔ لیکن جیسے گلِ چشم (وہ شخص جس کی آنکھ میں پُھلی یا سفیدی ہو) کے لئے آئینہ کا وجودِ عدم (نیستی، نہ ہونا) برابر ہے۔ اسی طرح وہ لوگ " جن کی عقلوں کو اس جہان کے خُدا (ابلیس) نے اندھا کر دیا ہے" مراۃ الحق سے مستفیض (فائدہ اُٹھانے والا) نہ ہو سکیں گے۔ اس کتاب کی تیاری میں چند کتب اور پُرانے اخبارات سے بھی امداد لی گئی ہے۔ چونکہ جابجا عقلی دلائل سے حقائق کو ثابت کیا گیا ہے اور اکثر احباب کلامِ مقدس کے حقائق وسائل کو عقلی دلائل وبراہین (بُرہان کی جمع۔ دلیلیں) سے ثابت کئے جانے سے سخت بیزار ہوتے ہیں۔ اس لئے عرض ہے کہ ایسے اصحاب مندرجہ ذیل اُمور پر ضرور غور کریں تاکہ اُن کی غلط فہمی دُور ہو جائے۔

اوّل: یہ کائنات خُدا کا فعل ہے۔ اور کلام اللہ خُدا کا قول۔ لہٰذا اُس کے ہی فعل سے اُس کے کلام کو ثابت کرنا کوئی عیب نہیں بلکہ جائز ہے۔

دوم: دُنیا کی چیزیں آسمانی چیزوں کا عکس اور نقل ہیں (عبرانیوں ۸: ۵؛ ۹: ۲۳؛ ۱۰: ۱) اس لئے نقل سے اصل کو ثابت کرنا ناجائز نہیں۔ بلکہ بطورِ استدلالِ انی (نیزے کی نوک پر پرکھی جانے والی دلیل) لابُدی (لازمی) وضروری ہے۔

سوم: ساری شرعِ الٰہی کے خُلاصہ کا اوّل جُزیہ ہے کہ "تُو خُداوند اپنے خُدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل سے محبت رکھ"۔ پس یہ خُدا کو عقل سے پیار کرنا ہے۔ سگانِ دُنیا (دُنیا سے محبت رکھنے والے) اِسی عقل کو ناجائز طور پر استعمال کرکے فوائد حاصل کرتے ہیں اور ہم اپنی عقل سے خُدا کا جلال ظاہر کرتے ہیں۔

چہارم: حقائق غیر مرئی(وہ جس کو دیکھا نہ جاسکے)اور دقائق(دقیقہ کی جمع، باریکیاں) لطیفہ روحانیہ کا ثبوتی تصور محسوسات ومرئیات(وہ چیزیں جو دیکھی جاسکیں)ہی سے ہو سکتا ہے۔اس لئے نادیدنی رُوحانی حقیقتوں کو مرئیات کے پیرائے میں ظاہر کرنالازمی ہے۔

پنجم: سب سے زیادہ قابل لحاظ امر یہ ہے کہ خُدا باپ اور خُداوند مسیح نے تشبیہوں اور تمثیلوں میں کلام کیا۔ ملاحظہ ہو(زبور ۷۸: ۲؛ ہوسیع ۱۲: ۱۰اور متی ۱۳: ۳۴؛ مرقس ۴: ۳۳۔ ۳۴)۔اور خُداوند مسیح نے فرمایاکہ "جب میں نے تُم سے زمین کی باتیں کہیں اَور تم نے یقین نہیں کیا۔توا گرمیں تم سے آسمان کی باتیں کہوں توکیوں کریقین کروگے ؟(یوحنا۳: ۱۲)" واضح ہوکہ میں فلاسفر نہیں منطقی نہیں،ایک محدود قابلیت کامالک ہوں لیکن خُداوند مسیح کی طاقت سے یہ خدمت انجام دے رہاہوں۔

اس تصنیف کے تہیہ سے پیشترہی میرا جسم صحت اَور علالت (بیماری) کے برزخ(مصیبت اورآرام کادرمیانی درجہ) میں پھنسا ہوا تھااور یہی اطمینان سوزاورہمت شکن حالات اس خدمت میں بہترین صورت میں انجام دہی کے مانع(روکنے والا، ممانت) رہے۔

اس لئے التجاہے کہ میری نادارِی صحت کوملحوظ رکھتے ہوئے اس مصائب ونقائص سے چشم پوشی (درگزرکرنا،دیکھ کرٹال جانا)فرمایئے۔ خیال رہے کہ محض تردیدی جذبات(ردکرنے والے جذبات)میری اس خامہ فرسائی(لکھنا) کے متحرک نہیں ہوئے۔اگرچہ بعض جگہ خاص ضروریات کے ماتحت تردیدوتنقید واجب سے بھی کام لیناپڑاہے۔کاش! خُداوند کریم میرے نیک مقصد کو پورا کرے۔اُمید کامل ہے کہ اس کے مطالعہ سے بہت لوگ اپنی روحوں کی سعادت(بھلائی)حاصل کریں گے۔آمین

نیازکیش۔ایف۔ایس تاج

اے۔پی مشن لدھیانہ

مراۃ الحق

حمد: ہر طرح کی تعریف وتوصیف اور حمد وتمجید کی حقدار وہی ذاتِ بیچون وبیچگون (بے مثال، اللہ تعالیٰ) ہے جوادراک وفہم (عقل سے دریافت کرنا) اِنسانی سے بعید (دور، پرَے) اور وارء الوراء ہے۔ جس کے الطاف واکرام (مہربانیاں) میں حیث الاجتماع (بڑی گروہ) تمام افراد عالم پر شبانہ روز (بلاناغہ) مشترک ومساوی طور (ہر ایک پر) پر ظاہر ہوتے ہیں۔ جس کی بے قیاس محبّت منصہ (محبت کی جلوہ گا) شہود (شاہد کی جمع، اہل تصوف کی اصطلاح میں وہ درجہ جس میں جلوہ حق بلکہ ہر شے عین حق نظر آئے) پر طرح بطرح آشکارا ہوتی رہتی ہے۔ فطرت کے ذرے ذرے میں اُس کا نور حقانیت (خدا کی طرف منسوب ہونا، صداقت) جلوہ فگن (نور ڈالنے والا) ہے۔ اُس نے اِنسان خاطی وعاصی (گنہگار) کی شقاوت قلبی (دل کی سختی) اور کور باطنی (ناسمجھ) کے اندفاع (دفع کرنا، دور کرنا) وازالہ (دور کرنا، مٹانا) کے لئے اپنے اکلوتے بیٹے خُداوند مسیح کو جسم میں بھیجا اور اُس کے پاک کفارہ کے طفیل اِنسان کی مصیبت وگناہ کا چارا فرمایا۔ اور مریضانِ گناہ کے بہتے ہوئے آنسو پونچھے جس کے باعث ہم اُس کے فضل کے تخت کے سامنے دلیری سے جاسکتے ہیں۔ اُس کی تمجید خُداوند مسیح میں ابدالا آباد ہوتی رہے۔ آمین۔

حسن عقیدت (ایمان کی بھلائی)

:ابتدائی زمانوں میں جب کہ اِنسان بالکل سیدھا سادھا تھا۔ اور اُس کے قلبِ ظلمانیہ وفطرت محجوبہ پر آفتابِ عالم وتہذیب کے برق وش (بجلی کی طرح شوخ) پرتَو (سایہ، چمک) نہیں پڑتے تھے۔ اخلاق وتہذیب کو کسی ذہن ودل میں باریابی (بارگاہ میں حاضری) حاصل نہیں ہوئی تھی۔ ظلمت وتاریکی کے سمندر میں جُہل ونادانی کی طغیانیاں (سیلاب، زیادتی) تھیں۔ اور ہر طرف جہالت آمیز سادگی کے آثار نظر آتے تھے۔ اُس وقت بھی اِنسان کے وجدانیات (جاننے اور دریافت کرنے کی قوت) میں دو حقیقتیں صاف اُبھری ہوئی جگہ رکھتی تھیں۔

اوّل۔ اپنے آپ کو فطرتی طور پر کمزور وبیکس تصور کرنا۔

دوئم۔ کسی دستگیر (ہاتھ پھیلانے والا) وحاجت روا (ضرورت پوری کرنے والا) کی ضرورت کو بزور (جبراً) محسوس کرنا۔

ان ہی دو حقیقتوں کی بناء پر اگر اُس کو کوئی حاجت روا یا دستگیر خواہ وہمی ہو پیش کیا گیا۔ تو اُس نے بطیبِ خاطر (خوشی خوشی سے) اُس کی پرستش کی۔ اُس وقت اِنسان مِثل ایک طِفل کمسِن (کم عمر بچہ) کے فطرتی طور پر عجائبات کا مشتاق تھا۔ اور غیر مرئی (وہ جس کو دیکھا نہ جاسکے) اور وہمی اشیاء کی پرستش کے لئے ایک دم تیار ہو جاتا تھا۔ اُس وقت اِنسان میں ایک طرح کی حسن عقیدت (ایمان کی بھلائی) پائی جاتی تھی۔ ان زمانوں میں علماء نے اُس کے حسن عقیدت (ایمان کی بھلائی) اور سریع الاعتقادی (ایمان میں جلدی کرنے والا) سے ناجائز فائدہ اُٹھایا۔ اِسی زمانہ میں آندھی، آگ، پانی، بارش، آفتاب

مہتاب اور رعد (بجلی کی کڑک) وغیرہ کی پرستش شروع ہوئی۔ چونکہ یہ اشیاءِ انسانی طاقت سے بالا تھیں اورانسانی جدوجہد اُن کے مقابلہ میں قطعی بے سُود (بے فائدہ) تھی۔اس لئے اِنسان نے سمجھ لیا کہ یہ کوئی اعلیٰ اور قادر ہستیاں ہیں۔ جن کے سامنے ہم بالکل کمزور و مجبور ہیں۔اسی طرح فطرت کی اٹل اشیاء کی طاقت وقدرت سے مرعوب و مجبور ہو کر یہ حسن عقیدت (ایمان کی بھلائی) اُن میں پیدا ہوئی کہ ان فطرت کی طاقتوں کو دیوتا تصور کرکے اُن کی رضا جوئی (دوسروں کو خوش کرنے والا) اور حصُول خوشنودی کے لئے اُن کے آگے قربانیاں چڑھانی شروع کردیں۔تاکہ وہ اُن کے ایثار وعبودیت (بندگی) سے خوش ہو کر اُن کے دامانِ مرادکے مقصود کے موتیوں سے بھردیں۔اور ہر قسم کی غارت گری وتباہ کاری سے باز رہیں۔اور جب کہیں بارش کی زیادتی سے فصلوں، مویشیوں، کھیتوں اور مکانوں کا نقصان ہو جاتا تھا تو سمجھتے تھے کہ اَندر دیوتا ناراض ہے۔اور اگر آندھی یا آگ سے کچھ نقصان ہوتا تھا تو مارُوت اور اگنیؔ دیوتا کی ناراضگی کے قیاس لگاتے تھے۔اور ہر ممکن کوشش سے اُن کے قہر وغضب کو روکنے کے لئے اور اُن کی خوشنودی کی خاطر گائے، بچھڑے، گھوڑے بلکہ اِنسان تک کو بے دریغ (بغیر رنج اور افسوس کے) قربان کردیتے تھے اور سوم رَس دیوتوں کے اَکل وشرب کے لئے رکھ دیتے تھے۔اس قسم کی فطرت پرستی اور خُدا کی قدرت کے مظاہرات وآثار کی پوجانہ صرف ہندوستان ہی میں ہوتی تھی بلکہ ایک زمانہ کہ ایسی جہالت اور خوش اعتقادی ہمہ گیر (ہر وقت پکڑے رہے) تھی اور کوئی ملک یا قوم اس سے آزاد نہ تھی۔ مصری اُمیرس واسس تھا۔ تھاتھ۔ کھیم۔ پتھا اور میض اور متبرک سانڈ کے پوجاری تھے۔اسی طرح یونان۔ایران۔کارتھیج۔بابل۔ نینوہ۔ سریہ۔ روم۔ امریکہ اور جرمنی وغیرہ تمام ممالک میں اُلو۔بیل۔ وینس۔ جیوپیٹر۔بعل۔عستارات۔ہرکیولیس۔آطیس۔سٹارٹی۔ایڈونس۔بیکس اور اپالو وغیرہ کی پرستش بڑے زوروں پر تھی۔اور تاحال ایسی باطل پرستی کا بقیہ دنیا کے تمام حصص (حصہ کی جمع) میں کم وبیش موجود ہے۔ بائبل مقدس میں بھی اُس زمانہ کی وحشیانہ رسوم کا کئی جگہ صاف ذکر موجود ہے۔ مثلاً طفل کشی (بچوں کا قتل)۔اور ''وادیوں میں چٹانوں کے شگافوں کے نیچے بچوں کی ذبح کرتے ہو''؟(یسعیاہ۵۷: ۵)۔پھر بچوں کو آگ میں جلانا" اور اُنہوں نے توفت کے اُونچے مقام بن ہنوم کی اُونچی وادی میں بنائے تاکہ اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو آگ میں جلائیں" (یرمیاہ۷: ۳۱)۔"تم خُداوند اپنے خُدا کے لئے ایسا نہ کرنا۔کیونکہ جن جن کاموں سے خُداوند کو نفرت اور عداوت ہے وہ سب اُنہوں نے اپنے دیوتاؤں کے لئے کئے ہیں۔ بلکہ اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو بھی اپنے دیوتاؤں کے نام پر آگ میں ڈال کر جلادیتے ہیں" (استثنا۱۲: ۳۱)۔

زمانے نے ایک کروٹ بدلی۔کچھ انقلاب پیدا ہوا۔ تعلیم وتہذیب نے ان کے مجسموں کی پرستش کو باعث ثواب سمجھا۔

سوءِ عقیدت اب زمانے نے ایک اور کروٹ بدلی۔ عقل وعلم کے ترقی کرنے سے مارُوجل (سراب) اَور رسّی کے سانپ سے خیال اُٹھ گیا۔پہلے رسّی کو سانپ اور مارُوجل (سراب) اور سراب کہنے لگے۔پہلے انسان کی سریع الاعتقادی (ایمان میں جلدی کرنے والا)۔ کور باطنی اور حسن عقیدت (ایمان کی بھلائی) کا یہ حال تھا کہ اراکین فطرت کو تعظیم الٰہی کی جگہ دیتا اور خُدا کی دستکاریوں وصناعیوں (کاریگری) کو پوجا کرتا تھا (رومیوں۱: ۲۱۔۲۳؛ یرمیاہ۲: ۱۲)۔اب یہ حال ہوگیا کہ خُود خُدائی کا دعویٰ کر بیٹھا۔اور خُود کو خُدا سمجھنے لگا۔ جیسے ویدانتیوں، ہمہ اوستیوں اور صوفیوں وغیرہ کے خیالات ہیں۔لازم تو یہ تھا کہ انسان کی عقلی وعلمی ترقی خُدا کی صحیح پہچان پر منج (بے نور) ہوتی۔اور جس طرح تالاب کے پانی پر کائی (پانی کا جالا، گہرا سیاہی مائل سبز رنگ) کے چھا جانے سے آفتاب کا عکس اس میں نظر نہیں آتا پر بادتُند (تیز ہوا) کے پُرزور جھونکے کائی کو پانی کی سطح سے ہٹا کر ایک کنارے پر جمع کردیتے، اور پانی کے صاف ہونے سے سورج کا عکس اس میں بالکل صاف اور بے داغ نظر آتا ہے۔اسی طرح عقل وعلم اس جہالت اور تاریکی

کے پردہ کو جو قلوب انسانی پر محیط تھا اُٹھا کر آئینہ دل کو اس قدر مُصفّٰا (پاک صاف) کر دیتے کہ خدا کی معرفت وحقیقت کی معصوم تجلی اس میں انعکاس (عکس جھلکنا) فرماتی، اور عرفان الٰہی کی لاانتہا نورانیت اور سحر آفرین تجلی ظلمت کدہ دل پر مسلط ہو کر انسانی خود غرضی کی تاریکی کو نگل جاتی اور وہ خودی وخود نمائی کو عقیدت الٰہی کی قربان گاہ پر بھینٹ کر دیتا۔ لیکن افسوس کہ "اگرچہ انہوں نے خُدا کو جان تو لیا مگر اس کی خُدائی کے لائق اس کی بڑائی اور شکر گزاری نہ کی بلکہ باطل خیالات میں پڑ گئے۔ اور ان کے بے سمجھ دلوں پر اندھیرا چھا گیا۔ وہ اپنے آپ کو دانا جتا کر بے وقوف بن گئے" (رومیوں ۱: ۲۱۔۲۲)۔

اور اسی طرح سوءِ عقیدت (ایمان کی خرابی) کا خیال پیدا ہو گیا۔ غیر اقوام کے علاوہ مسیحیوں نے بھی لوگوں کو مردُم (انسان) پرستی پر مجبور کیا۔ مثلاً پوپ کا مغفرت نامہ (معافی نامہ) خود کو مستجمع جمیع کمالات (تمام خوبیوں کو ایک جگہ جمع کرنا) ومنبع حسنات (بھلائی کا چشمہ) اور خداوند مسیح کا قائم مقام بنانا۔ جذباتِ سفلیہ (پستی کے جذبات) اور خواہشات ذمیمہ (برائی کی خواہش) کی مہمان نوازی کی خاطر زرِ کثیر کے حرص سے مغلوب ہو کر جنت جیسی اعلیٰ جگہ کا حق دلانے کے فضول دعاوی (دعویٰ کی جمع)۔ اپنی تعظیم وتوقیر (عزت) کی بے جا خواہش۔ اب سوءِ عقیدت (خراب ایمان) اور تفریط (کوتاہی، کسی کام میں کمی ہونا) پرستش نے صحائف مُطہرہ (پاک ہونے کا آلہ) کو ان کے درجے سے گرا دیا۔ پہلے تو خوش اعتقادی کا یہ عالم تھا کہ قرطاس (کاغذ) پرستی اور توہمات وعجائبات کو گھڑ گھڑ کر مذہب کا جُزو بنا دیا تھا۔ اب ایسی تنزل (زوال) کی حالت ہو رہی ہے کہ کلامِ مقدس کی بالکل توقیر نہیں کرتے اور علم وحکمت دُنیوی کے ترقی کرنے سے خُدا اور مذہبی حقائق کو محفل عقلی وعملی رنگ میں دیکھنے کے خواہاں ہیں۔ حالانکہ روحانی حکمت اور دُنیاوی حکمت میں بعد المشرقین ہے۔ "مگر نفسانی آدمی خدا کے روح کی باتیں قبول نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ اس کے نزدیک بیوقوفی کی باتیں ہیں۔ اور نہ وہ انہیں سمجھ سکتا ہے کیونکہ وہ روحانی طور پر پرکھی جاتی ہیں" (۱۔کرنتھیوں ۲: ۱۴؛ ایوب ۲۱: ۱۴۔۱۵)۔ دراصل ہاتھ میں پانچ اُنگلیاں ہونا خُوبی میں داخل ہے۔ اگر چار ہوں تو عیب ہے اور اگر چھ ہوں تو بھی عیب ہے۔ اگر تیر اتیر اصل نشانہ خطا ہوا۔ لین لین ہی رہنا درست ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں خواہ وہ اُمور (امر کی جمع، بہت سے کام) جسمانی سے متعلق ہو یا روحانی سے اعتدال (نہ کمی نہ زیادتی) اور میانہ روی (ہر کام مناسب طریق پر) نہایت ضروری ہے۔ افراط وتفریط (کمی بیشی) کی مورت خواہ کسی صورت میں پوجی جائے۔ ہر حال میں نتائج بجائے خوشگوار ہونے کے غیر مُفید ومضرت رساں (فائدہ مند اور نقصان دینے والی) ثابت ہوں گے۔ اعتدالِ فطرت کا ناسخ (لکھنے والا، منسوخ کرنے والا) منسوخ ہے۔ اور اس کے خلاف عمل کرنے سے ہر پہلو سے تشویشناک آثار ونتائج کا ظہور بطور لازم وملزوم کے لابدی (ضروری) ہے۔ حسن عقیدت (ایمان کی بھلائی) اور سوء عقیدت میں افراط وتفریط (کمی بیشی) ہے۔ اس لئے ان ہر دو خیالات کا باطل اور ناقابل تسلیم ہونا بدیہی (وہ بات جس میں دلیل کی حاجت نہ ہو، ظاہر)۔ عقیدہ ویدانت (ہندوؤں کے فلسفے اور دینیات کا ایک نظام جس میں ذات الٰہی پر بحث کی گئی ہے) بھی چُونکہ سوءِ عقیدت (خراب ایمان) کا نتیجہ ہے۔ اس لئے اس جگہ اُس کو معرض بحث میں لانا ضروری ہوگا۔ لہٰذا اب ہم مختصر طور پر مسئلہ ویدانت (ہندوؤں کے فلسفے اور دینیات کا ایک نظام جس میں ذات الٰہی پر بحث کی گئی ہے) کی کھوج کریں گے۔

(۱)

ویدانت

جملہ مذاہب کے معتقدات (اعتقاد رکھنے والا) اِس امر میں اتفاق کُلی رکھتے ہیں کہ تمام نوع اِنسان کی طبائع (طبیعت کی جمع) کو کسی نہ کسی طرح سے عرضِ گناہ عارض (لاحق ہونے والا) ہے۔ اور استقرائی (تلاش کرنا، پیروی کرنا) طور پر بھی گناہ کی ہمہ گیری مسلم الثبوت ہے۔ مسئلہ گناہ پر پوری بحث ہم آگے چل کر مناسب مقام پر کریں گے۔ سردست عقیدہ ویدانت (ہندوؤں کے فلسفے اور دینیات کا ایک نظام جس میں ذات الٰہی پر بحث کی گئی ہے) کے مطابق گناہ اور نجات پر مختصر طور پر لکھیں گے۔ ویدانتی لوگ گناہ کو اگیان اودیا اور بھرم وغیرہ ناموں سے پکارتے ہیں۔ اور اُن کے مسلمات کے مطابق گناہ یا پاپ ایک اعتباری محض اور عدمی شے ہے۔ اور خارج میں اُس کی کوئی حقیقت نہیں۔ اور اُس کو محض اگیان یا بھول ہی مانتے ہیں اور گیان پراپتی (علم حاصل کرنے) کو برہم پراپتی کا سبب مانتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ برہم (خالق کائنات) میں سے پرکرتی یا مایا پیدا ہوئی۔ اور پرکرتی نے ہی برہم کو اپنے جال میں پھنسالیا۔ جیسے مکڑی میں سے جالا نکلا اور اُسی نے مکڑی کو پھنسار کھا ہے۔ یہ جگت نتھیار (خواب و وہم) ہے اور برہم ست (حقیقت) ہے۔

دراصل برہم اور مایا (مادہ پرکرتی) کا جو خیال ہے وہ بائبل کی تخلیق آدم وحوا کا ایک بگڑا ہوا اور کسی قدر صاف عکس ہے۔ ہم مان لیتے ہیں کہ آدم برہم تھا اور حوا مایا پرکرتی ہے۔ اور حوا نے آدم میں سے بالکل نکل کر آدم کو ہی اپنے فریب میں پھنسالیا۔ اور اس طرح سے گناہ دُنیا میں آیا اور سب آدمیوں میں پھیل گیا۔ اور تمام آلام (الم کی جمع، رنج وغم) ومصائب گناہ کا نتیجہ ہیں۔ اور پھر وہ مانتے ہیں کہ اگیان (جہالت) کی تاریکی سے نکل کر گیان (علم) کو حاصل کرنا ہی مکتی یا براہم پراپتی ہے۔ اور اس طرح جیو اور مادہ برہم میں لین یا ابھید ہو جاتا ہے۔ جس طرح صوفی لوگ بھی آخری منزل کو فنافی اللہ ہونا مانتے ہیں۔ یعنی جیو (روح) اور برہم میں کسی قسم کا تغیر وتفاوت (تبدیلی اور فاصلہ) نہیں رہتا۔ بلکہ التصاق تام (پورا) ہوتا ہے۔ اور دُوئی (جُدائی) کے پردہ کے ہٹ جانے سے ایسا ہی ہوتا ہے جیسے ایک حباب یا قطرہ سمندر میں غائب ہو کر اپنے خصوصی امتیاز کو کھو دیتا اور اُسی کا رُوپ ہو جاتا ہے۔ دراصل وہ برہم سے اُوپر کسی اعلےٰ ہستی یا خالق کے قائل ہی نہیں ہیں۔

ہم مانتے ہیں کہ جس طرح گناہ کے باعث اِنسان کی خُدا سے جدائی ہوئی اُسی طرح گناہ سے مخلصی حاصل کرکے اِنسان آدم والی ابتدائی پاکیزہ حالت پر بحال ہو کر پھر تقرب الٰہی (خُدا کی قربت) حاصل کرتا ہے۔ لیکن ہم نجات دہندہ اور نجات یابندہ کی ہستیوں میں امتیاز کے قائل ہیں۔ اور خالق ومخلوق کو جُدا جُدا متمائز ہستیاں مانتے ہیں۔ یعنی نجات کی حالت میں ہم خُدا کی عین ذات نہیں ہو جاتے۔ بلکہ اوصاف ملکوتیہ (فرشتے، صوفیوں کی اصطلاح میں عالم ارواح) کے باعث خُدا کی مشابہت قریبی رکھتے ہیں۔ جیسے ابتدا میں خُدا نے آدم کو اپنی صورت پر ذی (مالک، رکھنے والا) ارادہ پاک اور فعل مختار بنایا۔ اُسی طرح دوبارہ شبیہ اللہ کے ساتھ ظلی (پناہ، سایہ) طور پر ہماری مشابہت ہو جاتی ہے۔ نہ یہ کہ برہم میں لین ہو جاتے ہیں۔ "جب مسیح جو ہماری زندگی ہے ظاہر کیا جائے گا تو تم بھی جلال میں اُس کے ساتھ ظاہر کئے جاؤ گے" (کلسیوں ۳: ۳۔ ۴)۔ ویدانتیوں کا خیال ہے کہ برہم ہی خالق اور برہم ہی مخلوق ہے۔ مگر اُن کا یہ خیال نادرست ہے کیونکہ خالق ومخلوق۔ فاعل ومفعول اور صانع ومصنوع (بنانے والا اور بنایا ہوا) میں کوئی امتیاز نہیں رہتا۔ یا تو خالق ومخلوق اور کارن وکارج (کام کاج اور سبب) مترادف الفاظ ہوں گے۔ جس طرح پیار ومحبت۔ اور رنج وغم مترادف اور ہم معنی الفاظ ہیں اور یہ

سراسر محال ہے۔ جس طرح ضارب (مارنے والا) کے بغیر مضروب (ضرب کھایا ہوا) والد کے بغیر پسر (لڑکا) اور کاتب (لکھنے والا) کے بغیر مکتوب (لکھا ہوا) کا وجود محال ہے۔ اُسی طرح صانع کے بغیر مصنوع اور کارن کے بغیر کارج کا ہونا ناممکن و محال ہے۔ ورنہ کارن وکارج وغیرہ توہمات (توہم کی جمع، وہم، شک) کا ذخیرہ ہوں گے۔

دوم۔ یہ لازمی امر ہے کہ فاعل کا وجود مفعول سے مقدم ہو اور مفعول کے فاعل کے ارادہ میں تو قدیم (پُرانا) ہو سکتا ہے۔ لیکن وجود خارجی کے اعتبار سے مفعول اور فاعل آنِ واحد میں کبھی نہیں ہو سکتے۔ اگر یُوں ہونا ممکن ہو تو پھر کوئی کسی فعل کا فاعل نہیں ہو سکتا۔ ضرور ہے کہ فاعل مقدم (پہلے) اور مفعول موخر (آخر) ہو۔

سوم۔ برہم ست اور جگت متھیا کا خیال بھی ابتدائی سوءِ عقیدت (خراب ایمان) اور کورانہ فلسفہ کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ متھیا شیٔ ست شئے کا جُز نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ کسی شیئے کا اپنے نقیض (مخالف) میں سے برآمدہ ہونا محال ہے۔ سورج میں سے تاریکی، شہد سے تلخی اور سفید میں سے سیاہی کبھی نکل نہیں سکتی۔ اسی طرح ست برہم میں سے متھیا جگت کا برآمد ہونا ناممکن و محال ٹھہرا۔ ویدانتیوں (ویدانت کے ماننے والے) کا یہ خیال ہے کہ جیسے ایک ہی سوت سے مختلف الوان واشکال کے کپڑے بنتے ہیں۔ اور اُن کے مختلف نام رکھے جاتے ہیں مگر اُدھیڑنے پر وہی سُوت کا سوت رہ جاتا ہے۔ اسی طرح ایک ہی برہم ہے جو جگت کی بو قلموں (مختلف رنگوں والا) اشیاء میں جُدا جُدا معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ اشیاء مختلف ناموں سے پکاری جاتی ہیں مگر ہے "سروم کھلودم برہم" لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ سونے کی ایک اینٹ ہے اُس کو ڈھال کر مختلف اطوار اور اشکال کے زیورات بنا کر اُن کے متفرق نام رکھے جاتے ہیں۔ تاہم وہ سونا زیورات کی صورت میں تبدیل کر دینے سے بھی سونا ہی رہے گا۔ پیتل نہیں بن جائے گا اور نہ ہی متھیا ہو گا۔ کیونکہ ست میں سے است کبھی برآمد نہیں ہو سکتا۔ پس ثابت ہوا کہ برہم ست ہے تو جگت بھی ست ہے۔ گرنتھ صاحب کی گواہی بھی یہی ہے کہ "آپ ست کیا سب ست"۔

علاوہ ازیں اگر سچ مُچ ویدانت (ہندوؤں کے فلسفے اور دینیات کا ایک نظام جس میں ذات الٰہی پر بحث کی گئی ہے) کے خیال کے مطابق یہ دُنیا محض وہمی وخیالی ہو تو چاہیے کہ اگر آگ کو پانی کہا جائے تو وہ پانی ہو جائے۔ اور اسی طرح اگر دن کو رات کہہ دیا جائے تو فوراً رات ہو جائے۔ لیکن ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ پس عالم کی حقیقت ثابت ہے۔ اور جگت متھیا اور برہم ست کے مسئلہ کا ابطال (باطل ہونا، جھوٹ) ظاہر ہے۔

چہارم۔ عقیدہ ویدانت (ہندوؤں کے فلسفے اور دینیات کا ایک نظام جس میں ذات الٰہی پر بحث کی گئی ہے) کے مطابق خُدا کا مرکب ماننا پڑتا ہے کیونکہ تمام جمادات۔ نباتات حیوانات اور ارواح کا اُسی میں سے برآمد ہونا ثابت کرتا ہے کہ تمام مادی وغیرہ مادی اشیا برہم کے اجزا ہیں۔ اوّل تو مادی وغیرہ مادی آپس میں ایک دوسرے کے اجزاء نہیں ہو سکتے۔ اور پھر برہم کے اجزا ماننے سے برہم کو ترکیب لازم آتی ہے۔ اور شے مرکب اول تو حادث (فنا ہونے والی) ہوتی ہے اور برہم کا حدُوث (وجود میں آنا) ایک اور خالق کو گنجائش دیتا ہے۔ جو اُس سے قدیم ہو کر اُس کی بھی علّت (وجہ، سبب) ٹھہرے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ مرکب ہونا کوئی اعلیٰ صفت نہیں چاہتا۔ ترکیب ادنیٰ اجسام کا خاصہ ہے۔ رُوح اعلیٰ وجود ہے اور وہ غیر مرکب ہے۔ جسم ادنیٰ شے ہے اور یہ مرکب ہے۔ پس برہم کا مرکب ہونا اُس کے متنزل اور ادنیٰ ہونے کی دلیل ہے۔

پنجم۔ویدانت(ہندوؤں کے فلسفے اور دینیات کاایک نظام جس میں ذات الٰہی پر بحث کی گئی ہے)کے مطابق برہم کو سگُن(ذی صفات)اور نرِ گن(بے صفات)ماناجاتاہے۔یعنی جب اُس کا تعلق تین گنوں ست۔رج۔تَم سے ہوتو وہ سگُن ہوتاہے اور جب ان تین گنوں سے جدا ہو تو وہ نرگُن ہوتاہے۔لیکن اُن کا یہ نظریہ بھی دیگر خیالات کی طرح خلافِ عقل ہے۔ذات اور صفات آپس میں لازم ملزوم ہیں۔ذات مجموعہ صفات ہے۔جس طرح صفات کا وجود بغیر موصوف کے محال ہے۔اُسی طرح موصوف کا وجود بلاصفات ممکن نہیں۔برہم کو سگن اور نرگُن ماننے کے یہ معنی ہوئے کہ وہ ذی صفات بھی ہے اور لاصفات بھی۔اس طرح واحد ذات میں دو نقیضوں کا اجتماع جائز ٹھہرا کر خُدا کی ہستی سے منکر ہیں۔یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک ہی وقت میں ایک شخص عالم بھی ہو اور لاعالم بھی۔زندہ بھی ہو اور مرُدہ بھی۔موصوف کے بغیر صفت اور صفت کے بغیر موصوف کا وجود قطعی محال و ممتنع(منع کرنے والا)ہے۔مثلاً آگ ذات ہے اور حرارت اُس کی صفت۔اگر حرارت نہ رہے تو آگ کی ذات کا انکار لازم آئے گا اور اگر آگ نہ ہو تو حرارت کا وجود کہاں رہے گا۔پس لامحالہ ایک ہی خُدا سگُن اور نرگُن دونوں نہیں ہوسکتا اور محض نرگن بھی نہیں ہوسکتا۔کیونکہ بے صفات شئےاعتباری محض اور عدمی ہوگی نہ کہ نفس آلامری(نفس آلامر سے منسوب،وہ حالات واقعی جنہیں دوست دشمن سب نے ماناہے)اور حقیقی۔پس یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ خُدا ذی صفات(سگُن)ہے۔اس لئے کہ وہ حقیقی وجود ہے۔اس لئے بھی کہ مخلوقات جو اُس سے صادر ہوئی وہ ذی صفات ہے۔(رومیوں ۱:۱۹سے ۲۰)۔اگر خالق کو بے صفات(نرگن)مانا جائے اور اُس کی مخلوقات کو ذی صفات(سگن)تو ایک نقیض(مخالف)کو دوسرے نقیض کی علت ماننا پڑے گا۔اور یہ محال ہے۔لہٰذا خُدا الٰہ۔ذی صفات اور حقیقی وجود ہے اور ویدانت(ہندوؤں کے فلسفے اور دینیات کا ایک نظام جس میں ذات الٰہی پر بحث کی گئی ہے)کا عقیدہ سراسر باطل ہے۔

ششم۔رہا یہ خیال کہ جو کچھ نظر آتاہے سب برہم ہے۔اس کے متعلق یہ اُمور قابل غور ہیں کہ جب کہ کوئی اِنسان اپنے جسم،رنگ،شکل وصورت،خدوخال،صحت وسُقم،عادات وخصائل اور حُسن وقبح میں کسی دوسرے اِنسان سے مناسب ومطابقت تام(پورا)نہیں رکھتا۔بلکہ ہر انسان میں ایک دُوسرے سے نمایاں امتیاز پایا جاتاہے۔اور جس کے باعث ہم ماں باپ،بہن بھائی،حاکم محکوم اور دوست ودشمن کو جُدا جُدا پہچانتے ہیں۔اور ان امتیازات کے باعث ہر ایک کی شخصیت دوسروں سے جداگانہ نظر آتی ہے اور اس کے علاوہ ہم اپنی شخصیت کے متعلق "میں" کا احساس ہونے پر دیگر افراد سے خود کو ممتاز سمجھتے اور اپنی شے کو "میری" کہتے اور اپنی اشیاو مقبوضات کو دیگر افراد کی اشیا سے عزیز رکھتے اور اُن کے کھو جانے پر افسوس کرتے ہیں تو کس صورت میں تمام خلقت ایک برہم ہوسکتی ہے؟زید کے مبروص(کوڑھی)ہونے سے بکر کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ایک کو گیان ہونے سے سب کو گیان نہیں ہوتا۔ایک سانپ کو مار دینے سے تمام سانپوں کا زہر دُور نہیں ہوتا۔تو بھلا اس خیال کی صحت کی کیا دلیل ہوسکتی ہے کہ **"سروم کھلودم برہم"** بلکہ اس خیال میں ایک بھاری قباحت(خرابی)یہ ہے کہ بہن،بیٹی،ماں،زوجہ،خالہ اور دادی وغیرہ رشتوں میں کوئی فرق نہ رہنے کے باعث ان سب کو ایک ہی نگاہ سے دیکھنا پڑے گا۔اور تمدنی وخاندانی زندگی میں سخت مشکلات پیش آئیں گی۔اور ان تمام رشتوں ناطوں کا باہمد گر(ایک دوسرے کے ساتھ۔آپس میں)ممتاز صُورت قائم رہنا بھی اس عقیدہ کے ابطال کی ایک مسکت(خاموش کرانے والا)دلیل ہے۔

ہفتم اور اگرفی نفسہ (اپنی ذات میں، دراصل) یہ تمام جگت ایک ہی برہم ہے۔ توذات پات اور اُونچ نیچ کے مکروہ و ناشائستہ خیالات اور اعلیٰ وادنیٰ کے امتیازات کے کیا معنی ہیں؟ ویدانتی بھگتوں کو تو کتّے، بلیوں، گدھوں اور کوؤں کے ساتھ کھانے پینے سے بھی پرہیز جائز نہیں۔ اگرچہ یہ کہ اچھوتوں کے ساتھ چھو جانا بھی زندہ درگور ہونے کا مصداق (وہ چیز جو کسی کی صفائی ثابت کرئے، گواہ) بنا ہوا ہے۔ اگر سرب جگت کو برہم ثابت کرنے بیٹھے تھے تو پہلے ان معمولی ابتدائی باتوں کی تو اصلاح کر لیتے اور کم از کم چُھوت چھات کے قلعہ کو تو پہلے سَر کر لیتے۔ اگر ویدانت (ہندوؤں کے فلسفے اور دینیات کا ایک نظام جس میں ذات الٰہی پر بحث کی گئی ہے) کی یکتائی کی تعلیم کی مثال سوائے ویدانت کی دُنیا کے اور کسی بھی مذہب میں موجود نہیں۔ لیکن اگر برہم گیانیوں کے عملی پہلو کو دیکھا جائے تو اُن کی سی امتیاز پسندی اور باہمد گر (ایک دوسرے کے ساتھ) نفرت وجدائی کے خیالات کی کثرت کی مثال بھی کافہ انام (آدمیوں کا گروہ، سب لوگ) پر اور کسی مذہب میں ہرگز ہرگز نہ ملے گی۔ گویا یکتائی تو صرف زبان کے لئے ہے اور جدائی عمل کرنے کے لئے۔ یہ تو اُس شخص کا سا حال ہوا کہ جس کے گھر میں تو افلاس (بھوک، غربت) کی وجہ سے چوہے بھوکے مرتے ہوں اور زبان سے رٹتا پھرے سونا سونا۔ اگر ان بھلے آدمیوں سے کوئی پوچھے کہ صاحب! ایسی زبردست یکتائی کی تعلیم اور پھر ان امتیازات کے معنی؟ تو جواب یہ ہوتا ہے کہ ابھی ہم اگیانی (لاعلم) ہیں۔ جب گیان (علم) ہو جائے گا تو امتیازات (امتیاز کی جمع، فرق) نہ رہیں گے۔ اول تو ہمیں آج تک کوئی ویدانتی پُورن گیانی نہیں ملا۔ اگر کوئی ہزار میں سے ایک ہوگا تو گیان کی مشین کی سُست رفتاری پر شک کی گنجائش نہیں۔ دُوسری بات یہ ہے کہ جو شخص یہ اقرار کرتا ہے کہ ابھی مجھے پورا گیان نہیں ہوا جب ہو جائے گا تو امتیازات کو چھوڑ دوں گا۔ تو اُس کے اس اقرار ہی سے ثابت ہے کہ وہ ان امتیازات کی قباحت سے آگاہ ہے اور اُنہیں مٹانا بھی چاہتا ہے تو بھلا اس سے زیادہ گیان اور کیا ہوتا ہے۔ سب زبانی جمع خرچ ہے اور حقیقت ندارد (کورا، خالی)۔ اپنی اخلاقی کمزوریوں کی پردہ دری کے لئے اگیانی بن جاتے ہیں۔ ایسی تعلیموں نے ملک کی ذہنیت کو غایت (آخر، انجام) درجہ پست کر رکھا ہے۔ اور جب تک ان خیالات کی جان کا فاتحہ نہ پڑھا جائے گا ہم حقیقی اخلاق شائستگی۔ تمدنی (مل کر رہنے کا طریقہ) آزادی اور رُوحانی ترقی سے بے نصیب رہیں گے۔ شُکر کا مقام اور ہماری خوش قسمتی ہے کہ مسیحیت نے اس قلعہ بطلان (ضائع ہونا) پر بمباری کرنے کے لئے میدان کارزار (لڑائی، جنگ) میں ڈیرے ڈال لئے ہیں اور صرف مسیحیت نے ہند میں تمدنی اصلاحات اور مساوات کی تحریکوں کو جنم دیا ہے جس کی تقلید (پیروی) پر آج آریہ، سکھ اور مسلمان جُھکے ہوئے ہیں۔

ہشتم۔ پھر کوئی ان ویدانت (ہندوؤں کے فلسفے اور دینیات کا ایک نظام جس میں ذات الٰہی پر بحث کی گئی ہے) یوں سے یہ تو پوچھے کہ کسی شیر چیتے اور سانپ وغیرہ سے خائف و سہمگیں (خوف زدہ ہونا) ہو کر کیوں بھاگے جب کہ وہ اُسی کا رُوپ ہے۔ کوئی دویت نہیں۔ اس واجبی اجابت (مقبولیت، رفع حاجت) کا جواب اکثر ہمیں یہ دیا جاتا ہے کہ بھرم کے آگے بھرم بھاگتا ہے۔ یا یوں کہیں کہ بھرم سے ڈر کر بھرم بھاگ جاتا ہے نہ کہ ویدانتی۔ اس مضحکہ خیز جواب سے ہمیں ہنسی آتی ہے۔ اول اس لئے کہ شیر اور ویدانتی دونوں حقیقی اور خارجی وجود ہیں کہ نہ وہمی۔ اور پھر دونوں برہم۔ دُوسرے یہ کہ وہم سے وہم کیسے ڈر کر بھاگ سکتا ہے؟ دُوسرے الفاظ میں اُس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک وہم دُوسرے وہم کو دُور کر سکتا ہے۔ حالانکہ یہ صریح باطل (صاف جھوٹ) ہے۔ دو اشیا جو اپنی خاصیت میں ایک ہی ہیں وہ ایک دُوسرے کی مدافعت (دفع کرنا، روک) نہیں کر سکتیں۔ مثلاً سردی سردی کو اور گرمی گرمی کو اور تاریکی تاریکی کو کبھی دُور نہیں کر سکتی۔ کوئی بھی خاصیت اپنی متضاد خاصیت کے وسیلے دُور کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا وہم وہم سے ڈر کر بھاگ نہیں سکتا۔ بلکہ ویدانتی شیر سے ڈر کر بھاگتا ہے۔ اسی سے اُن دونوں میں مغائرت و تفاوت (فرق) ظاہر ہے۔ پس ثابت ہوا کہ تمام جگت

برہم نہیں ہے۔ بلکہ خُدائے واجب الوجود وفوق الفطرت تمام مصنوعات مرئیہ (وہ جس کو دیکھا جاسکے) اور غیر مرئی (وہ جس کو دیکھا نہ جاسکے) اور سفلیہ وعُلویہ کا واحد خالق اور صانع ہے۔ اور وہی تمام کائنات پر حکمران ہے۔ وہ مرکب نہیں۔ نرگن نہیں۔ گیان واگیان ہر دو کا بانی نہیں۔ اُس نے مخلوقات کو اپنے میں سے نہیں نکالا اور نہ ہی تمام ممکنات فنا ہو کر اُس میں مل جائیں گی۔ وہ ازلی وابدی غیر مرئی (وہ جس کو دیکھا نہ جاسکے)۔ لطیف الحہ (عمدہ زندہ رہنے والا)، ذی صفات (اعلیٰ خوبیاں)، خالق، مالک، رازق، فوق الفطرت اور ادراک (سمجھ) عقلِ اِنسانی سے باہر ہے۔

آتمانیتہ مکت ۔ ویدانیتوں کا خیال ہے کہ آتمانیتہ مکت (روح کا اصل مقصد نجات ہے) اور نرلیپ (منزہ عن الخطا) ہے۔ اور اُس پر گناہ مطلق اثرانداز نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ غیر مادی اور غیر متاثر ہے۔ وہ ہمیشہ پاک وصاف رہتی ہے۔ پاپ (اگیان) صرف ستھول دیہہ (کثیف جسم) ہی سے متعلق ہے۔ اور دُکھ سُکھ کے سب اثرات دیہہ (جسم) ہی پر ہوتے ہیں۔ رُوح ان کیفیات سے قطعی متکیف نہیں ہوتی۔

اول ۔ اگر تنزہ (بے عیب ہونا، خوشی) تام روح کا خاصہ ذاتی ہے۔ اور گناہ جسم کا خاصہ ذاتی ہے۔ تو اس صورت میں رُوح اور جسم کی طبائع (طبیعت کی جمع، طبیعتیں) باہمد گر (ایک دوسرے کے ساتھ، آپس میں) متضاد ہوئیں۔ اور ضدین کا اجتماع محال ہے۔ اور یُوں اِنسانی زندگی کا قائم رہنا محال ٹھہرا۔ (شائد اسی واسطے جگت کو متھیا سمجھتے ہیں) لیکن اِنسانی زندگیاں قائم ہیں۔ پس گناہ کا تعلق روح وجسم دونوں سے ثابت ہو گیا۔

دوم ۔ اگر پاکیزگی اور معصومیت تام روح کا خاصہ ذاتی ہے۔ تو حصول موکھش (نجات) یا برہم پراپتی کی خاطر اس قدر کٹھن ریاضتیں کرنا فضول اور تحصیل (وصول کرنا) لاحاصل ہے۔ جسم کے فنا ہونے پر آتما پرماتما میں جاملے گی۔ کسی کو تپ جپ سادھن وغیرہ کی مطلق ضرورت نہیں۔ یہ سراسر گمراہ کن عقیدہ ہے۔ دراصل اشرف (اعلیٰ) شئے کے فساد سے ادنی شئے کا فساد لازم آتا ہے۔ اگر اصل الشجر سُوکھ جائے تو ڈالیاں کبھی قائم نہیں رہ سکتیں۔ برعکس اس کے ڈالیوں کے سُوکھ جانے سے جڑ کا نقصان نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح رُوح جسم کی بہ نسبت اشرف ہے۔ اگر اُس میں بگاڑ پیدا ہو جائے تو لازمی امر ہے کہ جسم بھی اُس بگاڑ سے متاثر ہو۔ پس اگر جسم میں گناہ موجود ہے تو رُوح میں اُس سے پہلے ہے۔ جب تک رُوح کی اصلاح نہ کی جائے جسم کی اصلاح ناممکن ہے اور جسم مادہ ہے۔ اور مادہ بذاتہ غیر مُدرک (سمجھ کے بغیر) اور غیر متحرک (حرکت کے بغیر) ہے۔ بغیر روح کے سہارے کے وہ اچھا یا بُرا کوئی عمل نہیں کر سکتا۔ پس ہر طرح سے رُوح پر ہی الزام آتا ہے۔ اس لئے آتمانیتہ اور نرلیپ (منزہ عن الخطا) ہر گز نہیں ہو سکتی"۔

سوم ۔ پس جبکہ رُوح اور جسم دونوں گناہ آلود ثابت ہو گئے تو اب سوال لازم آتا ہے کہ پھر گناہ کا وجود حقیقی ہے یا اعتباری محض۔ اگر کہو اعتباری تو امر اعتباری کی مدافعت (روک) کے لئے خارجی تدابیر جیسے سادھن ریاضت (عبادت کی مشق کرنا) وغیرہ اور کرم دھرم وغیرہ بے سُود وبے کار ٹھہرتے ہیں۔ اور جب گناہ مفروض ذہنی ٹھہرا تو دُکھ جو پاپ کا نتیجہ ہے وہ بھی ناپید (ختم) ہونا چاہیے۔ اور کوئی بھی دُنیا میں دُکھیا اور مصیبت زدہ نہ ہونا چاہیے۔ اور اگر دُکھ اور پاپ کوئی موجود فی الخارج شئے نہیں تو تناسخ (ایک صورت سے دوسری صورت اختیار کرنا، روح کا ایک قالب سے دوسرے

قالب میں جانا) کس پرندے کا نام ہے۔اور ویدانتیوں کی جُملہ تدابیر دربارہ مدافعت اگیان اور حُصول موکھش (نجات) کیا معنی رکھتی ہے؟ یہ تواُس سڑی آدمی کا ساحال ہوا جو بری یا سیمرغ (ایک فرضی عظیم الجثہ پرندہ جس کی نسبت وہمی لوگوں کا خیال ہے کہ ہاتھی کو پنجوں میں لے کر اڑ جاتا ہے) کے خوف سے غاروں میں چھپتا پھرے۔اور یا حُصول اقبال ودولت کے لئے ہما(ایک مشہور خیالی پرند جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ جس کے سر پر سے گزر جائے وہ بادشاہ ہو جاتا ہے) کی تلاش میں صحرا نوردی (سفر کرنا) وبادیہ پیمائی (جنگل میں پھرنا) کرتا ہے پھرے۔حالانکہ یہ دونوں پرندے قوتِ واہمہ (وہ طاقت جس سے انسان سوچتا ہے) کی اختراع (نئی بات نکالنا) کا وہمی نتیجہ ہیں۔اگر کہو کہ گیان ہونے پران وہمی تصورات کا سدباب (خاتمہ) ہو جاتا ہے توکیا اب کس برہم گیانی کو دکھ درد محسوس نہیں ہوتا؟اگر اب محسوس ہوتا ہے تو پہلے اُس کا وجود حقیقی تھا نہ کہ اعتباری۔اور اگر کہو کہ اب بھی دُکھ درد محسوس نہیں ہوتا تو یہ صریح باطل (صاف جھوٹ) ہے۔اگر کوئی روز روشن میں سُورج کے وجود سے انکاری ہو تو اُس کے مخبوط الحواس (پاگل) اور سڑی ہونے میں شک کی گنجائش نہیں۔چُونکہ دُکھ درد وغیرہ کا وجود دُنیا میں بدیہی (وہ بات جس میں دلیل کی حاجت نہ ہو) الظہور ہے اور کسی ثبوت کا محتاج نہیں اور دُکھ نتیجہ ہے پاپ کا۔پس جب دُکھ کا وجود حقیقی ثابت ہے تو اُس کا سبب یا علت یعنی گناہ کیونکر اعتباری ہوگا۔لہٰذا گناہ بھرم اور وہم نہ رہا بلکہ حقیقی ٹھہرا اور یہ بالکل صحیح ہے۔

گیان۔گناہ اوراُس کے نتائج دُکھ درد اور رنج ومحن کا وجود عالم میں بدیہی ہے۔ویدانتیوں کا خیال ہے کہ گیان ہونے پر گناہ (بھول) معدوم (ختم) ہو جاتا ہے۔واضح ہو کہ گیان کے معنی علم ہیں۔کسی بیماری کا محض علم اُس کا علاج نہیں ہو سکتا۔اگر بیماری کا علم ہی اُس کا علاج ہو سکتا تو صفحہ ہستی پر ڈاکٹروں اور حکیموں کا وجود نابود ہوتا۔کسی مریض کو اُن کا منت کش احسان ہونے کی کبھی ضرورت ہی نہ ہوتی۔بلکہ اپنے مرض کے محض علم ہی سے شفا ہو جایا کرتی۔گیان وغیرہ کے بھروسے پر رہ کر گناہ کی طرف سے آنکھیں بند رکھنا سخت نادانی اور کج فہمی ہے۔گیان یا علم (شرع) سے تو محض گناہ کی پہچان ہوتی ہے (رومیوں ۲۰:۳)۔فرض کرو ایک شخص اندھیری رات میں ایک ایسے مکان میں سویا ہوا ہے جو اندر سے نہایت گندہ اور غلیظ ہے۔مکڑی کے جالے، کوڑا کرکٹ وغیرہ بکھرے پڑے ہیں۔لیکن وہ شخص نہایت اطمینان سے اُس میں شب باش (رات گزارنا) ہے۔اب ایک دوسرا شخص چراغ لے کر اُس کمرے میں وارد ہوتا ہے۔لیکن چراغ کی آمد سے مکین کی طبیعت میں ایک دم ایک انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔اب وہ پہلے کی طرح مطمئن اور پُر سکون نہیں رہتا کیوں؟اس لئے کہ چراغ کی روشنی نے مکان کی غلاظت وگندگی کو اُس پر ظاہر کر دیا۔اب وہ ایک لمحہ تک اُس میں رہنا نہیں چاہتا۔اب وہ چاہتا ہے کہ اُس مکان کو فوراً غلاظت سے پاک کیا جائے۔لیکن ظاہر ہے کہ چراغ اُس مکان کو ہرگز صاف نہیں کر سکتا۔وہ تو صرف اُس کی گندگی کو ظاہر کر کے محض اُس کی مدافعت (روک) کی طرف مائل ہی کر سکتا ہے۔اسی طرح گیان (علم شرع) کو ایک چراغ سمجھیئے (زبور ۱۰۵:۱۱۹)۔وہ انسان کے گناہوں کی کراہت (نفرت) کو اُس پر ظاہر کر دیتا ہے۔لیکن دُور نہیں کر سکتا۔البتہ وہ نجات کی ضرورت کو محسوس کروا کے کسی طبیب روحانی کی طرف ترغیب دلا سکتا ہے۔اور متلاشی حق بنا دیتا ہے۔اور اُن کا یہ خیال بھی عجیب ہے کہ گیان حاصل ہونے پر سادھن (عملی تدابیر) ختم ہو جاتے ہیں۔جیسے پھل لگنے پر پھُول خود بخود جھڑ جاتے ہیں۔اور مسیحی مسلمات کے مطابق گیان (علم شرع) کے حُصول کے بعد اصل سادھن شروع ہوتے ہیں۔جیسے مرض کا علم ہو جانے پر بُہت سے غذاؤں سے پرہیز رکھنا اور بہت سی دواؤں کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔پُرانی انسانیت کو اُس کے کاموں سمیت اُتار نا پڑتا اور نئی انسانیت کو پہننا پڑتا ہے (کلسیوں ۳: ۹-۱۰)۔برہم گیانی کو تو نیک اور بد دونوں قسم کے کاموں کو تیا گنا (چھوڑ دینا) پڑتا ہے۔لیکن انجیل اس کے برخلاف

یہ حکم لگاتی ہے کہ "پس جو کوئی نیکی کرنا جانتا ہے اور نہیں کرتا اُس کے لئے یہ گناہ ہے" (یعقوب ۴:۱۷)۔ جب تک خوابیدہ (سویا ہوئے) شخص کو گھر میں لگی ہوئی آگ کا علم ہی نہیں وہ اُسے کیسے بجھائے گا؟ جونہی اُس کی آنکھ کھلے گی اور مکان کی آتشزدگی کا گیان ہو گا وہ ایک دم عملی تدابیر (سادھن) اُس کے بجھانے کی کرے گا۔ اگر آگ کا گیان ہونے پر بھی اُس کے بجھانے کی ضرورت کا قائل نہ ہو تو اُس کے سڑی (پاگل) ہونے میں کیا شک ہے؟

مکتی ازروئے ویدانت۔ اوپر ہم واضح طور پر دِکھا چکے کہ گیان یا علم محض سے نجات کا حصول ناممکن ہے۔

البتہ گیان گنہگار اِنسان پر اُس کی گناہ آلودہ اور مکروہ حالت کو پورے طور پر آشکارا کر دیتا ہے۔ اور اُس سے چھٹکارا ہر گز نہیں کرا سکتا۔ بلکہ نجات کی ضرورت محسوس کروا دیتا ہے۔ اور ویدانتی مکتی کو چار قسم کی مانتے ہیں یا یوں کہیں کہ ازروئے ویدانت (ہندوؤں کے فلسفے اور دینیات کا ایک نظام جس میں ذات الٰہی پر بحث کی گئی ہے) نجات کے چار مدارج ہیں۔ یعنی: سلوک۔ سمیپ۔ سُروپ۔ سمُجھ۔

اول۔ سلوک۔ یعنی برہم کے دیس میں رہنا۔

دوم۔ سمیپ۔ یعنی برہم کی قربت میں رہنا۔

سوم۔ سُروپ۔ برہم کے ساتھ مشابہت و مماثلت حاصل کرنا۔

چہارم۔ سمجھ۔ یعنی برہم کی عین ذات ہو جانا۔ جس کی وہ ابھید ہونا یا برہم میں لین ہونا۔ (سما جانا) کہتے ہیں۔ وحدۃ الوجود یعنی سمجھ ہی مکتی کا کمال ہے۔

اگر بغور دیکھا جائے تو یہ کوئی کمال کی حالت نہیں بلکہ برعکس اس کے انتہائی زوال اور عدم کی حالت ہے۔ اول تو ابھید ہونے میں کوئی آنند نہیں کیونکہ تو دوئی (دویت، جدائی) میں ہوتا ہے نہ کہ ادویت میں۔ ایک طرف معبود ہو اور دُوسری طرف عابد اپنے معبود کے وصل (میلاپ) سے اپنی مُدتوں کی تشنہ (پیاسی) روح کی تشنگی بجھائے اور اُس کے دیدارِ فیض آثار سے اطمینان قلبی اور سکون باطنی حاصل کرے۔ یک جان دو قلب ہو جائیں تب حقیقی آنند ہے۔ لیکن برہم میں فنا ہو جانا کوئی اطمینان کی بات نہیں ہے۔ ایسی مکتی مکتی نہیں بلکہ انتہائی بے بسی اور لاچاری کی حالت ہے۔ اور نہ ہی ازروئے عقل یہ ممکن ہے کہ جیو جوالپگیہ (محدود) ہے۔ برہم میں جو سروگیہ (لامحدود) ہے کسی صورت ابھید ہو سکے۔ کیونکہ متناہی وجود لاانتہا زمانہ تک ترقی کرتے جانے سے بھی کبھی بے حد نہیں ہو سکتا۔ ازیں جہت محدود ولامحدود جو باہم نقیضین (نقیض کی جمع۔ خرابیاں) ہیں کبھی متحد نہیں ہو سکتے۔ ازروئے ویدانت (ہندوؤں کے فلسفے اور دینیات کا ایک نظام جس میں ذات الٰہی پر بحث کی گئی ہے) اِنسان کے بھلے اور بُرے افعال کی جزاو سزا دینے والا کوئی عادل و مصنف خُدا نہیں ہے۔ اور برہم ہی ہر طرح کی نیکی و بدی کا مخرج (خارج ہونے کی جگہ) و منبع ہے اور دو نقیضوں کا علت واحد پر اجتماع جائز سمجھتے ہیں۔ اور پاپ اُن کے نزدیک غیر فطری امر نہیں ہے۔ پاپ کا نتیجہ چوراسی لاکھ جنموں کا چکّر اور پاپ کے تیاگ اور گیان پراپتی (علم حاصل کرنے) کا انجام برہم کی ذات میں فنا ہو کر ہمیشہ کے لئے معدوم اور ناپید ہو جانا ویدانت کے مطابق طریق حیات اور نجات وغیرہ کا تصور نہایت گمراہ کن اور ہلاکت آفرین ہے۔ اس کے مطابق اِنسان کو نزاچھت (بے خواہش) ہونا نجات کے لئے ضروری ہے۔ یہ بھی قانون قدرت کے خلاف جہاد

ہے کیونکہ اِنسانی فطرتی طورپر بے خواہش نہیں بلکہ باخواہش پیدا کیا گیا ہے۔ البتہ خواہشات کا نیک ہونا اِنسانی کمال کا نشان ہے۔اور عدم خواہش تو ادنی اجسام کی خاصیت ہے۔ جیسے پتھر ،دھات اور نباتات وغیرہ میں اچھی یا بُری کوئی بھی خواہش نہیں پائی جاتی۔ہاں برہم میں فنا ہو جانے سے نیستی ہی ہو گی ۔اور سچ ہے کہ نیستی میں خواہش کا وجود محال ہے۔ جبکہ چوراسی لاکھ جنموں میں سے صرف اِنسانی جنم ہی اعلےٰ اور بابرکت سمجھا جاتاہے۔اور خواہشات کا وجوداور نیک وبدخواہش کا امتیاز بھی اسی جنم میں حاصل ہوتاہے تولازم تھا کہ اس جنم کا انتہائی کمال یہ سمجھا جاتا کہ اُس میں خواہش کا ظہور اور بھی اعلیٰ ہوتا۔اور وہ اس صورت میں ہوتا کہ اِنسان کی خواہشات سفلیہ وذمیمہ معُدوم (ناپید)ہو جاتیں۔اور برعکس اس کے خواہشات علویہ وسعیدہ (نیک بھلا) اور جذبات لطیفہ رُوحانیہ میں حد کمال کو پہنچتا۔ لیکن افسوس !کہ ویدانتی لوگوں نے مکت جیو کو قطعی بے خواہش مان کر نجات کو ایک انتہائی متنزل اورادنی حالت ثابت کیاہے۔تاہم بے خواہش ہونا بھی خلاف واقعہ ہونے کے باعث جہلِ مرکب(دوہری جہالت ،جاہل ہونا مگر خود کو عالم فاضل سمجھنا) ہے۔ کیونکہ یہ امر بدیہی (ایسی دلیل جس پر کسی اور دلیل کی حاجت نہ رہے) ہے کہ اس ملبُوس ہستی میں کوئی اِنسان بے خواہش ہرگز نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا کسی ویدانتی کو مُکتی کی اُمید نہ رکھنا چاہیے۔ پھر برہم گیانی کو کسی کے ساتھ بولنا نہ چاہیے۔کیونکہ دوسرے کو تو تم اور تمہارے وغیرہ کہنے سے دوئی (جدائی) ثابت ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ قدرت نے زبان وذہن اِنسان کو استعمال کے لئے دے رکھے ہیں۔اور قدرت اپنے قوانین کو جبری طورپر منواتی ہے اور اس لئے ضرور بولنا ہی پڑتاہے۔ مگر برہم گیانی اپنی اس کمزوری ونقیض (خرابی) کی پردہ داری ایک اور صورت میں کرنا چاہتے ہیں۔کہ جو گیاسُو(طالب علم) کو سمجھانے اور تعلیم دینے کے لئے بولتے ہیں ورنہ بولنے کی کوئی اِچھیا(خواہش) نہیں ہے۔اجی صاحب !جوگیاسُو (طالب علم) کواگیان (لاعلمی) کی تاریکی سے نکالنے اور راہ راست پرلانے کی فکر بھی تو ایک خواہش ہے۔ خواہش کے معنی ہیں چاہنا۔ جب تم چاہتے ہو کہ دُوسروں کو اُپدیش (نصیحت،نیک صلاح) کرکے راہ راست پرلاؤ توخواہش اور کس پرندے کا نام ہے۔

ویدانتی فنا ہونے کو مُکتی اعلیٰ حالت سمجھتے ہیں اور زندگی کو لعنت اور بُرے اعمال کا بُرا نتیجہ۔ ہم زندگی سے خارج ہونے کو ہلاکت اور ابدی زندگی کو خُدا کی بخشش اور انعام سمجھتے ہیں۔اب ناظرین خود دیکھ لیں کہ کونسا طریق اِنسان کی فلاح وبہبود جسمانی وروحانی کا آئینہ دار ہے۔ سوءعقیدت (خراب ایمان) مسئلہ ویدانت(ہندوؤں کے فلسفے اور دینیات کا ایک نظام جس میں ذات الٰہی پر بحث کی گئی ہے) کا جنم وہ ہے۔اوراُس کی تقلید (پیروی) سے نہ تو اِنسان دُینوی تہذیب وشائستگی کو حاصل کرسکتاہے اور نہ ہی اس طبعی موت کے بعد اُس کے لئے حقیقی خوشی اور اطمینان وسکون قلبی کی کوئی اُمید باقی رہتی ہے۔اورانسان آئندہ زندگی کی سنہری اُمیدوں سے ہاتھ دھو کر یہی کہتاہے کہ " اگر مرُدے نہ جلائے جائیں گے۔ تو آؤ کھائیں۔ پئیں۔ کیونکہ کل تو مر ہی جائیں گے "(۱۔کرنتھیوں۱۵: ۳۲)۔

انجیلی نجات انجیل کی رُوسے نجات یابندہ کی مختصر سی تعریف یہ ہے۔"پُرانی اِنسانیت مصلوب ہو کر گناہ کا بدن بیکار ہو جائے۔ آگے کو گناہ کی غلامی میں نہ رہے"(رومیوں۶: ۶)۔"بدن گناہ کے سبب سے مرُدہ اور روح راست بازی کے سبب زندہ ہو"(رومیوں۸: ۱۰)۔

حُصول کمال کی استعداد (لیاقت ، قابلیت) پیدا ہو جائے (۲۔کرنتھیوں ۳: ۱۸)۔خُداوند مسیح کے ساتھ مشابہت ہو جائے (فلپیوں ۲۱:۳؛ ۱۔یوحنا ۲:۳)خُدا کے ساتھ ملاپ(افسیوں ۱۳:۲۔ ۲۲)۔ سزائے عدالت سے رہائی (رومیوں ۱:۸)اور یہ نجات خُدا کی بخشش ہے نہ کہ ہماری کمائی ہوئی(افسیوں۸:۲سے ۹)اور یہ نجات ابدی اور لازوال ہے (مکاشفہ ۲۱: ۳۔۷؛۲۳: ۲۷؛عبرانیوں ۹: ۱۲)۔

(۲)

رُوح کے متعلق عقائد

یوں تو رُوح کے وجود کے متعلق دُنیا میں بے شمار عقائد ہیں۔ اور اُن سب کو بحث میں لانا محال بھی ہے اور غیر ضروری بھی۔ اگر ان تمام عقائد کو اجمالی (مشترکہ جس میں حصہ کشی نہ کی گئی ہو، مختصر) طور پر دیکھا جائے تو تین قسم کے خیال معلوم ہوتے ہیں۔ یعنی ایک خیال کے مطابق رُوح مرکب امتزاجی (ملاوٹ بھری) ہے۔ دُوسرے خیال کے مطابق ازلی وابدی اور بالذاتہ ناقابل فنا ہے۔ اور تیسرے عقیدہ کے مطابق روح حادث (فانی) ہے۔ اور اپنی فنا یا بقا کے معاملہ میں ذات واجب کی محتاج ہے۔ اب ہم ان ہر سہ عقائد پر مختصر طور پر بحث کریں گے۔

روح مرکب امتزاجی

ہندوستان میں چارواکئے اس خیال کے قائل ہیں کہ روح مرکب امتزاجی ہے۔ اس عقیدہ کا بانی برہسپتی تھا۔ یہ لوگ خُدا کی ہستی سے قطعی منکر ہیں اور اُن کا خیال ہے کہ جسم وروح میں کوئی مغائرت (اجنبیت، ناموافقت) نہیں۔ اجزائے مادی کی ترکیب سے اجسام بنتے ہیں اور وہی اجزاء روح کا مادہ ہے۔ جسم کے فنا ہونے سے رُوح بھی فنا ہو جاتی ہے۔ جیسے ریکارڈ کے ٹوٹنے پر اُس کی آواز بھی مٹ جاتی ہے۔ اگر یہ درست مان لیا جائے تو رُوح مادی شئے ٹھہری اور روح کی صفت ادراک ہے۔ پس درک (سمجھ) مادہ کی صفت میں شامل ہو جائے گا۔ اور کوئی مادی شئے غیر مُدرک (عقل سے باہر) نہ رہے گی بلکہ مُدرک وغیر مُدرک کی تفریق اُڑ جائے گی۔ مندرجہ ذیل دلائل سے بھی اس خیال کا ابطال (جھوٹ) ظاہر ہوتا ہے۔

(ا)۔ علم حکمت اس حقیقت پر شاہد ہے کہ سات برس کے بعد جسم کے تمام پُرانے ذرات زائل ہو کر اُن کی جگہ نئے ذرات لے لیتے ہیں اور وہ جسم بالکل نیا جسم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اسی برس کی عمر تک گیارہ دفعہ جسمِ انسانی قطعی بدل کر ہر دفعہ نئے ذرات سے ایک نیا جسم مرتب ہوتا رہتا ہے۔ اگر ادراک وعلم وغیرہ ذرات مادّیہ کی صفت ہوتی تو لازم تھا کہ ہر ہفت (سات) سالہ معلومات پُرانے زائل شدہ ذرات کے ساتھ ہی زائل وناپید ہو جاتیں۔ کیونکہ اُن معلومات کے سرمایہ دار جو ذرات تھے جب وہ نہ رہے تو معلومات کا قائم رہنا محال ہوتا۔ اور اس طرح چودہ برس کی عمر کے واقعات اکیس برس کی عمر میں۔ اکیس برس کے اٹھائیس برس میں اور اٹھائیس برس کے پنتیس برس میں بھول جانے چاہئیں۔ لیکن مشاہدہ اس کے خلاف ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ پُرانے ذرات جدید ذرات کو اپنے اثرات سپُرد کر جاتے ہیں اور یوں پُرانی معلومات وواقعات یاد رہتے ہیں تو اس صورت میں کسی بیمار کو کبھی تندرست نہ ہونا چاہیے۔ اور نہ ہی جاہل کو عالم۔ لیکن ایسا ہرگز نہیں ہوتا۔ پس جسم کے ذرات کے بار بار تبدیل وتحلیل (علیحدہ علیحدہ ہونا، ہضم ہونا، مرجانا، گلنا) ہوتے رہنے۔ اور کسی عضو کے کٹ جانے کے باوجود بھی جس حقیقت کے علم وادراک وحافظہ وغیرہ میں سرمو (ذراسا) فرق نہیں آتا وہی روح ہے۔ اور وہ غیر مادّی ہے۔ جبکہ ذرات کے تحلیل ہونے سے وہ زائل نہیں ہوتی۔ کسی عضو کے کٹ جانے سے کٹ نہیں جاتی۔ تو اس میں شک نہیں کہ اگر جسم یک دم فنا ہو جائے تو بھی وہ قائم رہے گی۔ پس وہی روح ہے۔ اور غیر مادی ومجرد (اکیلا) وجود ہے۔

(۲)۔ واحد حقیقی وہ ہے جس کا کسی طرح سے قسمت و تجزیہ نہ ہو سکے اور نفس ناطقہ (انسانی روح) جسم ہو تو جسم قابل قسمت و صاحب تجزیہ ہے۔اور ظاہر ہے کہ محل کی قسمت سے حال کا تقسیم ہونا لازم آتا ہے۔ پس جسمیت نفس ناطقہ (انسانی روح) یہ چاہتی ہے قسمت کو اور قسمت نفس ناطقہ یہ چاہتی ہے قسمت معنی واحد حقیقی کو۔ اور واحد حقیقی کا انقسام (منقسم ہونا، حصہ حصہ ہونا) محال ہے۔ پس ثابت ہوا کہ روح جسم نہیں بلکہ غیر مادی شے ہے۔

(۳)۔ جسم وہ ہے جو ابعاد ثلاثہ رکھے۔ (یعنی طُول، عرض وعُمق) مگر عقل وعلم جو انسان میں موجود ہیں اُن کی نہ کوئی مقدار ہے اور نہ امتداد (طوالت، درازی، مدت)۔ تمام اجسام مرکبات قسمت و تجزیہ کو چاہتے ہیں۔ مگر علم کا تجزیہ وقسمت محال ہے۔ لہٰذا علم خاصہ جسم نہیں۔ اگر کوئی غیر مادی ظرف (دانائی، برتن، صرف ونحو میں وہ اسم ذات جو جگہ یا وقت کے معنوں پر دلالت کرے، حوصلہ) ہمارے جسم میں اُس کے قیام کے لئے نہیں ہے تو غیر مادی مظروف (برتن میں رکھی ہوئی چیز) (علم) کا وجود بھی محال ہوگا۔ پس ثابت ہوا کہ جو شئے غیر مادی علم کا ظرف ہے وہ روح ہے۔ لہٰذا رُوح غیر مادی ہے۔

(۴)۔ ترکیب امتزاجی کے اجزا عناصر ہیں اور عناصر میں ادراک (عقل) علم کی استعداد مفقود (غائب، لاپتہ) ہے۔ پس جو صفت اجزا میں موجود نہ ہو وہ مرکب میں کیسے پیدا ہو جائے گی۔ کوئی مرکب شئے اپنے اجزا کی کیفیت سے الگ کوئی صفت پیدا نہیں ہوسکتی۔ اگر پانچ گرم دوائیں ملا کر کسی کو کھلائی جائیں تو اُس کے مزاج میں سردی پیدا نہ ہوگی۔ اور نہ ہی سرد دواؤں کی ترکیب میں گرمی۔ کانچ کے ایک ذرے میں شیرینی نہیں تو ایک من بھر کانچ میں بھی شیرنی نہ ہوگی۔ ایک ریزہ سنگ میں علم نہیں تو ایک پہاڑ میں بھی علم نہیں ہے۔ درک (سمجھ) اور عدم درک (ناسمجھ) آپس میں نقیض (مخالف) ہیں۔ اور اس صورت میں ایک نقیض کو دُوسرے نقیض کی علت ماننا پڑے گا۔ اور یہ محال ہے۔ لہٰذا یہ عقیدہ خلاف عقل اور بے بنیاد ہے۔

رُوح قدیم و قائم بالذات

دوسرے خیال کے مطابق رُوح ازلی وابدی۔ قائم بنفسہ (خود) اور مُتصف (صفت رکھنے والا) بصفاتہ ہے۔ ویدانیتوں کے کئی فرقے ہیں۔ اُن میں سے ایک فرقہ تو رُوح کے جداگانہ وجود کا قائل ہی نہیں۔ یعنی وہ اربعہ (چار) نہیں بلکہ خمسہ (پانچ) عناصر سے الگ کسی لطیف وجود کو نہیں مانتے۔ اور جو ویدانتی رُوح کی ہستی کے قائل ہیں تو وہ کثرت ارواح کے قائل ہی نہیں۔ بلکہ تمام مرئیاتّ (وہ جو دکھائی دے) وغیر مرئیات (وہ جو دکھائی نہ دے) میں ایک ہی رُوح مانتے ہیں۔ اور اُسے برہم (خدا) کا جُز جانتے ہیں۔ وہ تمام اشیاء مادی وغیر مادی کو خُدا میں سے نکالتے ہیں۔ اس خیال کے حامی خُدا کو مرکب ثابت کرتے ہیں۔

چارواکئے وغیرہ تو رُوح کو مرکب امتزاجی (ملاوٹ بھری) مانتے ہیں۔ اور ویدانتی خُدا کو مرکب مانتے ہیں۔ آریہ لوگ بھی رُوح کو قدیم مانتے ہیں اور اُس کی قدامت کے اثبات (ثبوت کی جمع) میں بہت سے دلائل پیش کیا کرتے ہیں۔ لیکن ہم قدامت رُوح کے عقیدہ کی بطالت کو مبرہن (دلیل سے ثابت کیا ہوا، مضبوط) کرکے آخری اور صحیح عقیدہ پیش کریں گے۔

(۱)۔ امر مُسلّمہ ہے کہ ہر قسم کا علم وفہم اور عقل وادراک روح ہی کا خاصہ ہے اور یہ خاصہ رُوح کا ذاتی ہے۔ اور خاصہ ذاتی کا انفکاک (الگ ہونا، جُدا ہونا) اپنی ذات سے محال ہے۔ پس اگر روح قدیم ہے تو اُس کی اپنی قدامت کا علم ضرور ہونا چاہیے۔ لیکن یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ کسی

کی بھی رُوح کو اپنی قدامت اور ازلیت کا نہ تو تفصیلی اور نہ اجمالی علم ہے۔ اگر کہا جائے کہ رُوح کو اپنے حدوث (پیدائش، وجود میں آنا) کا بھی تو علم نہیں تو وہ حادث (فانی) کس طرح ہو سکتی ہے۔ تو واضح ہو کہ حدوث و قدامت کا عدمِ علم ہی تو رُوح کے حدوث کی سب سے زبردست اور مسکت دلیل ہے۔ قدامت کے لئے علم لازمی ہے۔ لیکن حدوث کے لئے لازمی نہیں۔ سوامی دیانند کا قول ملاحظہ ہو۔

" جو اشیاء مُدامی (ہمیشہ) ہیں اُن کی صفات و فعل فطرت مُدامی ہیں۔ اور غیر مُدامی جوہروں کے غیر مُدامی ہوتے ہیں"۔

(ستیار تھ پرکاش ب ۷، صفحہ ۸۱)

پس اگر رُوح اَنادی (قدیم)۔ ہے تو اس کا علم وگیان بھی مُدامی ہونا چاہئے اور ازیں جہت (یہی کوشش) اُس کو اپنی قدامت کا بھی علم ضرور ہونا چاہئے۔ لیکن یہ بات نہیں ہے۔ لہٰذا رُوح قدیم نہیں ہو سکتی۔ بلکہ حادث اور مخلوق وجود ہے۔

(۲)۔ رُوح کے تمام علوم وافعال تحصیلی (اکتسابی) محدود متناہی ہیں۔ تو رُوح محل حوادث ہو کر خود حادث ٹھہری۔

(۳)۔ اگر کہا جائے کہ مرض نسیان (ایک مرض جس میں انسان کے ذہن سے گذشتہ واقعات محو ہو جاتے ہیں) یا جنون کی حالت میں روح کی صفات حافظہ اور علم وغیرہ قائم نہیں رہتیں، اور انسان کو جوان ہونے پر طفلی کے حالات یاد نہیں رہتے۔ یا یہ کہ کوئی یہ نہیں بتا سکتا کہ اُس نے گذشتہ سال ماہ مارچ کی دس تاریخ کے ساڑھے دس بجے کیا کیا تھا وغیرہ۔ **تو اول** تو ان دلائل سے خود دیانند صاحب کا مندرجہ بالا قائم کردہ معیار قدامت ٹوٹ جاتا ہے۔ اور **دوم** یہ کہ ہم تفصیلی علم نہیں بلکہ اجمالی علم کا تقاضا کرتے ہیں۔ رُوح کو اپنی قدامت یا کم از کم کسی گذشتہ جنم کا اجمالی علم تو ضرور ہونا چاہئے۔ اگر ماں کے رِحم میں بچے کو گیان نہیں ہوتا تو اُس وقت رُوح کا تعطل (بے کار ہونا، خالی ہونا) اور بے صفات ہونا ثابت ہے۔ حالانکہ "مُدامی اشیاء کے صفات و فعل وفطرت بھی مُدامی"، مسلم ہیں۔ اب ذرا انصاف سے کہئے کہ حدوثِ رُوح میں کیا کسر رہی؟

(۴)۔ رُوح کی تمام معلومات اکتسابی (ذاتی محنت سے حاصل کرنا) اور تحصیلی (وصول کرنا) ہیں۔ یہ نہیں کہ کوئی بلا اکتساب علم عالم ہو جائے۔ ہم اس مکتب فطرت میں رُوح کو بتدریج (آہستہ آہستہ) علُوم وفنُون کی تحصیل کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ اُس کا علم لدنی (وہ علم جو سیکھنے کے بغیر وحی یا الہام وغیرہ کے ذریعہ حاصل ہو) نہیں بلکہ اکتسابی ہے۔ اگر وہ قدیم ہوتی تو اُس کا علم ضرور لدنی ہوتا۔ اور علم لدنی کی رُو سے جو معلومات ایک رُوح کی ہوتیں وہی فطرتی ولدنی طور پر تمام اَرواحِ اِنسانی کی ہوتیں۔ لیکن سب کے خیالات و آراء میں مختلف حقائق کے متعلق اختلاف بدیہی ہے۔ جس سے ثابت ہوا کہ رُوح کا علم لدنی نہیں اور ازیں جہت وہ قدیم بھی نہیں بلکہ حادث و مخلوق ہے۔

رُوح مخلوق وحادث

رُوح کے وجود کے متعلق آخری صحیح عقیدہ کی آئینہ دار بائبل مقدس ہے۔ اور یہ عقیدہ مندرجہ بالا دو عقائد کے بین بین (متوسط، درمیانی، ملاجلا) رہتا ہے۔ اگر رُوح کو مرکب امتزاجی (ملاوٹ بھری) ماننے ہیں تفریط (کوتاہی) ہے تو اُس کو قدیم اور قائم ماندماننے اس افراط ہے۔ اور افراط تفریط معیوب ہے۔ مسیحیت رُوح کو اُس کے اصل منصب سے نہ تو گراتی ہے۔ اور نہ اُس کے جائز درجہ سے اُس کو بلند کرتی ہے۔ بلکہ ہمارے مسلملت کے مطابق رُوح مخلوق وحادث وجود ہے۔ "اس لئے کہ میرے حضور رُوح اور جانیں جو میں نے پیدا کی ہیں بیتاب ہو جاتی ہیں" (یسعیاہ ۱۶:۵۷)۔ اور پھر

خُدا کو اَرواح کا خالق (پیدا کرنے والا) ہونے کی حیثیت سے رُوحوں کا باپ کہا گیا ہے (عبرانی ۱۲:۹)۔ اور جیسے وہ خالق ہونے کی جہت سے تمام مصنوعات سفلیہ وعلویہ اور مرئیہ وغیر مرئیہ (وہ چیزیں جو دکھائی نہ دیں) کا مالک ہے ویسے ہی وہ اَرواح کا بھی مالک ہے۔ خُداوند سارے بشر کی رُوحوں کا خُدا (گنتی ۱۶:۲۲؛ ۲۷:۱۶) اور رُوح صرف اِنسان میں ہے۔ لیکن اِنسان میں رُوح ہے (ایوب ۳۲:۸)۔ حیوانات میں رُوح موجود نہیں ہے مصری تو اِنسان ہیں خُدا نہیں۔ اور اُن کے گھوڑے گوشت ہیں روح نہیں (یسعیاہ ۳۱:۳)۔ حیوانات صرف جان اور جسم کا مجموعہ ہیں۔ اور اِنسان کا امتیاز حیوان سے اس طرح ظاہر ہے کہ اُس میں جان وبدن کے علاوہ رُوح بھی موجود ہے (۱۔ تھسلنیکیوں ۵:۲۳)۔

جس طرح جسم سے جسم پیدا ہوتا ہے۔ اُس طرح رُوح سے رُوح پیدا ہوتا ہے۔ یعنی قانون ارثی (میراث) کے مطابق بچے اپنے والدین سے پیدائش کے لحاظ سے جسم ورُوح دونوں حاصل کرتے ہیں۔ اور رُوح حادث (فانی) ہے قدیم نہیں۔ یعنی ازلی تو نہیں بلکہ ابدی ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ بالذتہ ابدی اور بنفسہ (خود) غیر فانی ہے ہر گز نہیں۔ بلکہ اُس کو ابدیت اس صوت میں مانی جاسکتی ہے کہ جس طرح جسم رُوح کے سہارے زندہ رہتا ہے۔ اُسی طرح رُوح خُدا کے سہارے زندہ رہتی ہے جسم ورُوح کی جُدائی کا نام جسمانی موت ہے۔ اور رُوح سے جُدا ہو کر جسم تو فنا ہو جاتا ہے۔ مگر رُوح قائم رہتی ہے۔ اسی طرح رُوح اور خُدا کی جُدائی کا نام رُوحانی موت ہے۔ اسی کو (مکاشفہ ۲۱:۸) میں دوسری موت کہا گیا ہے۔ اور خُدا سے جُدا ہو کر رُوح فنا ہو جاتی ہے۔ مسیحی مسلمات کے مطابق اَبدی ہلاکت سے یہی مراد ہے کہ مخالفین خُدا کی اَرواح بباعث تناقض (ایک دوسرے کی ضد یا مخالف ہونے کی وجہ سے) وتخالف طبائع (طبیعت کے تضاد) اُس سے جُدا ہونے کے باعث معدوم وفنا ہو جائیں گی۔ اسی طرح راستبازوں کی ارواح خُدا کے ساتھ مطابقت ومناسبت طبعی رکھنے کے باعث تاابد زندہ رہیں گی۔ ملاحظہ ہو (متی ۳۱:۲۵-۴۱) یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ ادنیٰ وجود ہمیشہ اشرف وجود کے سہارے قائم وباقی رہتا ہے۔ ادنیٰ کے فساد فنا سے اشرف کی فنا لازمی نہیں۔ مثلاً پتے اور شاخیں اگر جڑ کے ساتھ قائم رہیں تو فنا نہیں ہوتے۔ اگر الگ ہو جائیں تو جڑ تو قائم رہے گی مگر پتے اور شاخیں فنا ہو جائیں گے۔ اسی طرح جڑ اگر زمین میں قائم رہے تو فنا سے محفوظ رہے گی۔ اور اگر الگ ہو جائے تو جڑ تو فنا ہو جائے گی مگر زمین قائم رہے گی۔ ایک اور مثال لیجئے۔ جسم کے تمام اعضاء میں دماغ سب سے اشرف مسلم ہے۔ اگر کسی کی ٹانگ بازو ناک وغیرہ کٹ جائیں یا آنکھیں جاتی رہیں یا دانت نکل جائیں تو بھی وہ زندہ رہے گا۔ اور ہزاروں لاکھوں لنگڑے، لولے، نکٹے اور اندھے لوگوں کا زندہ اور موجود ہونا بدیہی ہے۔ لیکن کبھی کسی نے کوئی ایسا اِنسان نہ دیکھا ہوگا کہ جس کا سر کٹ گیا ہو اور وہ بقید حیات ہو۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ اشرف کے فساد فنا سے ادنیٰ کا فساد لازم آتا ہے نہ کہ اس کے برعکس۔ اسی طرح جسم کا وجود منحصر ہے۔ رُوح پر اور رُوح کا قیام خُدا پر اس عام بحث سے نتیجہ یہ حاصل ہوا کہ تبدل پذیر حقیقتیں لاتبدیل وجود کے ساتھ متعلق ہونے سے لاتبدیل اور غیر فانی ہو جاتی ہیں۔ توریت شہادت دیتی ہے کہ وادیِ سینا میں جب ایزد تعالیٰ حضرت موسیٰ سے ہمکلام ہوا تو اُس کا ظہور جھاڑی میں لگی ہوئی آگ کی صورت میں ہوا۔ اور لاتبدیل وجود خُدا تعالیٰ کی موجودگی کی تاثیر سے جھاڑی آگ سے جل نہیں گئی بلکہ قائم رہی۔ آریہ لوگ اکثر یہ معارضہ پیش کیا کرتے ہیں کہ جو پیدا ہوا ہے وہ ضرور مرے گا۔ اور جس کی ابتدا ہے اُس کی نیستی ضروری ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں سوچتے کہ ازروئے منطق جس کی فنا ونیستی ضروری ہے۔ وہ ممتنع الوجود (روکے سے نہ روکنے والا وجود) ہے نہ کہ ممکن الوجود، واجب الوجود (جس کی ذات اپنے وجود میں کسی کی محتاج نہ ہو۔ حق تعالیٰ) وہ ہے جس کا ہونا ضروری ہے۔ ممتنع الوجود وہ ہے جس کی نیستی (نہ ہونا) ضروری ہے لیکن ممکن الوجود وہ ہے جس کا نہ عدم (نیستی) ضروری اور نہ وجود ضروری ہے۔ پس ممکنات ومحدثات اپنے وجود عدم کے بارے میں ذاتِ واجب کے محتاج ہیں۔ پس ارواحِ اِنسانی ممکن وحادثات ہیں۔ اگر وہ (خُدا) اُنہیں قائم رکھنا چاہئے تو وہ قائم رہتی ہیں۔ اور اگر مٹانا چاہئے تو مٹ جاتی ہیں۔ خُدا کی رُوح کی تاثیر ممکنات کو ابدیت میں قائم رکھ سکتی اور رکھتی ہے۔ اس کے متعلق کلامِ مقدس کی تائید بلاشبہ ہو۔ ''تیری نگہبانی نے میری رُوح

سلامت رکھی"(ایوب ۱۲: ۱۰)۔ "اُسی کے ہاتھ میں ہر جاندار کی جان اور کل بنی آدم کا دم ہے"(ایوب ۱۰: ۱۲)۔ "اگر وہ اپنی رُوح اور اپنے دم کو واپس لے لے تو تمام بشر اکٹھے فنا ہوجائیں گے"(ایوب ۱۴: ۳۴-۱۵، زبور ۱۰۴: ۲۹)۔ اور کوئی رُوح اپنی بقامیں مختار نہیں ہے بلکہ خُدا تعالیٰ کی مرضی کے زِیر ہے۔ "کسی آدمی کو رُوح پر اختیار نہیں کہ اُسے روک سکے اور مرنے کا دن بھی اُس کے اختیار سے باہر ہے"(واعظ ۸:۸)۔ "پھر رُوح کی غیر فانیت وابدیت کے متعلق بھی ملاحظہ ہوتا اور خاک خاک سے جا ملے جس طرح آگے ملی ہوئی تھی اور رُوحِ خُدا کے پاس جس نے اُسے دیا تھا واپس جائے"(واعظ ۱۲: ۷)۔ اور جناب خُداوند مسیح کے قول سے بھی ثابت ہے کہ رُوح حادث بحدوث بدن نہیں بلکہ غیر فانی وابدی ہے "جو بدن کو قتل کرتے ہیں اور رُوح کو قتل نہیں کر سکتے اُن سے نہ ڈرو"(متی ۲۸: ۱۰)۔ اور سلیمان نبی کا قول بھی دیکھو "لیکن صادق مرنے پر بھی اُمیدوار ہے"(امثال ۳۲: ۱۴، ایوب ۲۶: ۱۰)۔ اگر رُوح کی طبیعت خُدا کی طبیعت سے متضاد ہو تو خُدا اُسے فنا کر سکتا ہے۔ "بلکہ اُسی سے ڈرو جو رُوح اور بدن دونوں کو جہنم میں ہلاک کر سکتا ہے"(متی ۲۸: ۱۰) ریکارڈنگ کمپنی ماہرین موسیقی کی آوازوں کو ریکارڈوں میں بند کر لیتی ہے۔ آواز غیر مادی شے ہے۔ اگر گویّا مر بھی جائے تو بھی ریکارڈ میں اُس کی آواز باقی رہتی ہے لیکن آواز کو ریکارڈ میں بند رکھنا ریکارڈ ساز کی مرضی پر منحصر ہے۔ اگر چاہئے تو اُس کو تادیر قائم رکھے اور چاہے تو ریکارڈ کو توڑ کو ایکدم معدوم (ختم) کردے اور ریکارڈ وہی قائم رکھے جاتے ہیں جن میں بھرا ہوا راگ اصول موسیقی کے فنی نکتہ نگاہ سے درست ہو۔ ورنہ توڑ دئے جاتے ہیں۔ پس واجب تعالیٰ ازلی وابدی ہے۔ رُوح ازلی نہیں پر صرف ابدی ہے۔ اور جسم نہ ازلی ہے نہ ابدی اور اجسام جو راستباز رُوحوں کو روزِ قیامت حاصل ہوں گے۔ وہ زندگی کی اعلیٰ سرشت میں تبدیل ہو کر غیر فانی ہوجائیں گے (۱۔ کرنتھیوں ۵۲: ۱۵-۵۳)۔ اور خُدا کے سامنے نیستی یاعدم کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ "کیونکہ اُس کے نزدیک سب زندہ ہیں"(لوقا ۳۸: ۲۰)۔ اور ارواح ومادہ کی قدامت خُدا کے خالق ہونے میں کوئی مددگار نہیں ہے۔ بلکہ وہ قادر مطلق اور ازلی وابدی خُدا ہے۔ جب اُس نے ایک زمانے میں کائنات کو پیدا کیا اور اِنسان کو خلاصہ کائنات بنایا تو کیا وجہ ہے کہ وہ مردوں کو زندہ نہ کر سکے۔ جس مادہ کو اُس نے پیدا کیا۔ اُس کو مِٹانا اور قائم رکھنا اُسی کے قبضہ اقتدار میں ہے۔ اُمید ہے کہ ناظرین رُوح کے متعلق اس بیان سے کافی فائدہ اُٹھائیں گے۔

(۳)

تزکیہ نفس وریاضت بدنی

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہمیشہ اشرف کے فساد سے ادنیٰ کا فساد لازم آتا ہے۔ جیسا ہم اُوپر کے بیان میں ثابت کر چکے ہیں۔اور فطرت کی صدہا(بہت سی)اشیاء غور وفکر کرنے سے اس امر کی صداقت اور بھی روشن ہوتی ہے۔اسی طرح رُوح اِنسانی میں جو جسم کی بہ نسبت اشرف یہ اعلیٰ ہے بگاڑ پیدا ہونے سے جسم میں لازمی طور پر اُس سے متاثر ہو گیا۔جب گناہ کے باعث اِنسان خُدا سے جُدا ہو گیا۔یعنی روحانی تنزل اور موت کے ماتحت آگیا تو جسم بھی موت وتنزل سے مغلوب ہو گیا۔اوراس طرح بنی نوع اِنسان پر موت نے تسلط جمالیا۔اب اگر کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ جس سے رُوح بحال ہوسکے۔تو ضرور جسم بھی فنا کے قبضہ سے چھوٹ کر بقا کو حاصل کرے۔اسی نکتہ پر پہنچ کر اِنسان میں بھگتی۔ریاضت اور تپسیا کے خیالات پیدا ہو گئے۔ ہندوستان کے علاوہ مغربی ممالک میں بھی رہبانیت (ترکِ دُنیا) نے ریاضت جسمانی کے خیالات کو حد سے زیادہ بڑھادیا اگرچہ نفسانی خواہشات کو روکنے اور دبانے سے روحانی زندگی میں ارتقاء(بتدریج ترقی کرنا) کی کچھ شعاعیں پڑنے لگتی ہیں۔اور نفس امارہ(انسان کی خواہش جو برائی کی طرف مائل کرے) پر قابو پانے کی کوشش کرنا نیک زندگی گذارنے کے لئے کسی حد تک مفید بھی ہے۔تاہم یہ سراسر غلط فہمی اور نادانی ہے کہ جسم کو بالکل حقیر اور ردّی سمجھ کر اُس کی نشوونما اور پرورش کی طرف سے قطعی آنکھیں بند کرلی جائیں۔ جس طرح قیمتی اشیاء کی حفاظت مکان کی پختگی پر مُنحصر ہے۔اُسی طرح رُوح کی حفاظت کے لئے جسم کی پرورش جو اُس کا ظرف ہے نہایت ضروری ہے۔ورنہ خُداداد اِنعام (جسم) کی بے قدری وحقارت ہو گی۔اور خودکشی وریاضت بدنی ایک ہی مفہوم کے مصداق ہوں گے۔واضح ہو کہ کھانا پینا اور پہننا کوئی گناہ نہیں اور نہ ہی یہ کوئی نیکی ہے۔کھانا ہمیں خُدا سے نہیں ملائے گا۔اگر نہ کھائیں تو ہمارا کچھ نقصان (روحانی نقصان) نہیں۔اور اگر کھائیں تو کچھ نفع نہیں (۱۔کرنتھیوں ۸:۸)"کھانے پیٹ کے لئے ہیں اور پیٹ کھانوں کے لئے۔لیکن خُدا اس کو اور اُن کو نیست کرے گا"(۱۔کرنتھیوں ۶:۱۳)۔"کیونکہ خُدا کی بادشاہت کھانے پینے پر نہیں بلکہ راستبازی اور میل ملاپ اور اُس خوشی پر موقوف ہے جو رُوح القدس کی طرف سے ہوتی ہے"(رومیوں ۱۷:۱۴)۔اگر کھانا پینا اور پہننا وغیرہ گناہ ہو تو اس گناہ کا بانی خُدا کو ماننا پڑے گا جس نے ہمیں جسم دیا۔اور جسم بھی ایسا جو خوراک وپوشاک اور دیگر ضروریات کا محتاج ہے۔جب خُدا رازق ہے اور اُس نے ہماری جسمانی خواہشات کا جواب بھی اسی فطرت کے اندر دیا ہے تو لازمی بات ہے کہ ہم رُوح کے ساتھ جسم کی بھی فکر رکھیں۔لیکن امور معاشرت میں بھی حدِ اعتدال (نہ کم نہ زیادہ) سے تجاوز کرنا خلافِ فطرت ہونے کے باعث جسمانی سزا لازمی ٹھہراتا ہے۔اگر بالکل نہ کھائیں تو موت یقینی ہے۔اور اگر حد سے زیادہ کھائیں تو بھی اپنے دانتوں سے اپنی قبر کھودنے کا مقولہ درست ہے۔امورِ معاشرت میں اعتدال (میانہ روی) مفید ہے اور تجاوز مضُر پیٹ خُدا نے خالی رکھنے کے لئے نہیں بنایا بلکہ اس لئے کہ اس میں کچھ ڈالا جائے۔جسمانی زندگی اسی پر منحصر ہے۔اگر جیب میں کبھی کچھ ڈالنا ہی نہ ہوتا تو اُس کا لگانا بلا مقصد ہوتا۔اسی طرح جو اعضاء خُدا نے ہماری جسمانی ساخت میں بنادئے ہیں وہ کوئی نہ کوئی مقصد ضرور رکھتے ہیں۔اس لئے وہ مٹانے کے لئے نہیں بلکہ قائم رکھنے کے لئے ہیں۔ دیکھو توڑوں کی تمثیل (متی ۲۵:۱۴-۳۰)۔

اگر نفسیائی نکتہ نگاہ سے دیکھا جائے توانسان کا دماغ بمنزلہ ایک کپتان کے ہے۔اور جسم کے تمام اعضاء سپاہی ہیں۔ پیٹ راشن کا گودام اور دِل بھنڈاری (گودام کا داروغہ) ہے۔اب ظاہر ہے کہ کپتان کی طاقت کا تمام تردارومدار سپاہیوں کی صحت اور مضبوطی پر ہے۔اکیلا کپتان کبھی دشمن کی فوجوں کو مغلوب نہیں کر سکتا۔اسی طرح سپاہیوں کے ضعف و قوت کا انحصار خوراک کی کمی وبیشی پر ہے۔ جس قدر اچھی اور مقوی خوراک کا ذخیرہ پیٹ کے گودام میں ہو گا۔اور دل کے ذریعے سے دماغ اور دیگر اعضاء کو وہ خوراک بقدر ضرورت ملے گی۔اُسی قدر دماغ ان اعضاء سے بہترین خدمات لے سکے گا۔ جب اعضاء کی نشوونما میں لاپرواہی وبے احتیاطی ہو گی اور اُن سے محنت زیادہ لی جائے گی تو آہستہ آہستہ کمزور ہوتے جائیں گے۔اور اُن کی کمزوری وناتوانی سے دماغ بھی ضعیف ونحیف ہو کر بے کار ہو جائے گا۔اور اس طرح سے جو بہترین خدمات اپنے اعضاء سے ہم مخلوقات خُدا کی بجالا سکتے ہیں وہ انجام نہ پائیں گی۔اور یوں اِنسانی زندگی ایک انتہائی خود غرضی کی زندگی بن جائے گی۔اور خُدا سے محبت کرنے کا پہلا زینہ ہے مخلوقات سے محبت کرنا جو کوئی دیدنی مخلوقات سے محبت نہیں رکھتا وہ نادیدنی خدا سے کیسے محبت رکھ سکتا ہے؟(۱۔یوحنا۴: ۲۰)"اور جو کوئی والد سے محبت رکھتا ہے وہ اس کی اولاد سے بھی محبت رکھتا ہے"(۱۔یوحنا ۱: ۵)۔اور تارک الدُنیا ہونے سے مخلوقات سے محبت وہمدردی کے مواقع ہی نہیں ملتے۔اس لئے ان ذرائع سے خُدا کا وصال (ملاپ) حاصل ہونا قطعی ناممکن ومحال ہے۔جو لوگ بنی نوعِ اِنسان کے ساتھ ہمدردی ومحبت کے خیال کو ترک کرکے براہِ راست خُدا ہی سے ملاپ کرنا چاہتے ہیں وہ اولاد سے نفرت اور والد سے محبت رکھنے کو ممکن سمجھتے اور ایک کنارے کے سمندر کے قائل ہیں۔ جیسے ایک کنارے کے دریا کا وجود محال ہے۔ویسے ہی مخلوقات کو چھوڑ کر خُدا سے محبت رکھنا ناممکن ہے۔

کلامِ الٰہی کا یہ پیغام ہے کہ تم اہویہ نفسانیہ اور اغشیہ جسمانیہ (جسم کی خواہش) میں اپنے دلوں کو یہاں تک نہ اُلجھاو کہ خُدا کی یاد ہی تمہارے دِلوں سے بسر جائے۔اور تم نِرے نفسانی اور دُنیا پرست ہی ہو جاؤ۔کلام کا فرمان ملاحظہ ہو۔کیونکہ نہ ہم دُنیا میں کچھ لائے۔اور نہ کچھ اُس میں سے لیجا سکتے ہیں۔پس اگر ہمارے پاس کھانے پہننے کو ہے تو اُسی پر قناعت کریں(۱۔تیمتھیس ۷:۶-۸ کلسیوں ۳: ۲ متی ۶: ۳۳)دو مکھیاں ہیں۔ایک کھانڈ کے شیرہ پر بیٹھتی ہے اور اُس میں ایسی پھنستی ہے کہ پھر زندہ باہر نہیں نکل سکتی۔دوسری مکھی مصری کی ڈلی پر بیٹھتی ہے اور کھا کر خوشی سے اُڑ جاتی ہے۔مزا تو دونوں نے شیرینی کا لیا مگر ایک کا انجام ہلاکت اور دوسری کا زندگی اور خوشی ہوا۔اسی طرح لذائذ وحظائظ نفسانیہ (جسمانی خواہش کا مزہ) کے پوجاری بن جانے سے خُدا سے جُدائی اور ہلاکت لازمی ہے۔اور اشیائے جسمانیہ کو اپنے غُلام بنا کر اُن سے خاطر خواہ کام لینا خوشی کا موجب ہے۔امور معاشرت میں بھی افراط تفریط ہو جب ہلاکت ہے۔اِن نعمت ہائے گوناگوں کو ٹھکرا دینا کفرانِ نعمت (۱۔تیمتھیس ۱: ۴-۵)۔

اکثر سادھو اور تیاگی بیراگی لوگ حظائظ جسمانیہ اور لذائذ نفسانیہ سے منہ موڑ کر تارک الدُنیا ہو جاتے ہیں۔اور ویرانوں میں جا کر اپنے جسموں کو نہایت بے دردانہ وجاہلانہ طریقوں سے ریاضت کے شکنجوں میں کھینچتے ہیں۔فاقوں مرتے ہیں۔اُلٹے سر کے بل درخت پر لٹکتے۔جل دھارے کرتے۔ باہیں سکھا لیتے ہیں تاکہ اُن کی انانیت (خودی) مٹ جائے۔لیکن یہ کوئی خودی کشی نہیں بلکہ خود کشی ہے۔ایسی کٹھن ریاضتوں کے باوجود وہ حقیقی خوشی اور سکون قلبی سے محروم رہتے ہیں۔اسی واسطے مغربی رہبانیت اور ہندوستانی ریاضت جن میں حماقت ایک اُبھرا ہوا عنصر ہے مقبول عام نہ ہو سکے۔ اور مذہبی دُنیا میں اُن کی قدرومنزلت ان خیالات کے حامیوں کی توقعات کے خلاف ہوئی۔اور اُن کی تقلید (پیروی) دیر پا نہ رہی۔ہندوستان کے توپتے پتے پر کرم مارگ، بھگتی مارگ، گیان مارگ تپسیا، آہنسا پرمودھرما اور نروان (یہ تمام تر ریاضتیں ہیں جن سے نجات کا حصول ممکن ہوتا ہے) وغیرہ لکھے ہوئے ہیں۔اور مہاتما بدھ نے تو ان خیالات کو بہت وسعت دی اور بدنی ریاضت کو حد سے بڑھا دیا۔کسی وقت یہ خیالات ہمہ گیر تھے اور اب تک اُن کا بقیہ کم وبیش ہر حصہ دُنیا میں موجود ہے۔پولُس رسول بدنی ریاضت کو غیر فطری ہونے کے باعث معیوب ٹھہراتا ہے۔ملاحظہ ہو"کیونکہ جسمانی ریاضت کا

فائدہ کم ہے لیکن دینداری سب باتوں کے لئے فائدہ مند ہے"(۱۔ تیمتھیس ۴:۸؛کلسیوں ۲۰:۲-۲۳)اگر ترکِ دُنیا اور اس قسم کا تزکیہ نفس (نفس کو پاک کرنا) رُوحانی کمالیت کے حصول کے لئے ضروری شرط ہو تو ضرور ہے کہ تمام بنی نوعِ اِنسان آبادیوں کو چھوڑ کر جنگلوں میں ڈیرے لگائیں۔ کیونکہ جو چیز بذریعہ ترکِ دُنیا و ریاضت حاصل ہونے کی اُمید ہے اُس کی ضرورت سے کوئی خالی نہیں۔ پھر جنگلوں میں آباد ہونے سے آبادیاں جنگل ہو جائیں گی۔ اور جس دُنیا کو ترک کیا وہی ساتھ جائے گی۔ اور اس طرح دُنیا کے تمام کارخانے بگڑ جائیں گے اور تمدن معاشرت کے عالم میں انقلاب کے طوفان برپا ہونے سے اِنسانی زندگی نہایت خطرناک ضلالت و گمراہی کے سمندر میں غرقاب (ڈوب جانا) ہو جائے گی۔ اور "نہ مرض رہے نہ مریض" کا مقولہ پورا ہو جائے گا۔

اگر جسمانی اعضاء اور نفسانی قویٰ کو مضمحل (گم ہونے والا، کم زور) واز کار رفتہ بنا کر اور بدی کے صدُور کے امکان کو مٹا کر کوئی بدی سے بچنے اور نیک کردار ہونے کا دعوے دار ہو تو یہ کوئی خوبی اور اخلاقی جرات کا کام نہیں ہے۔ بلکہ انتہائی بُزدلی وخُنک (سرد) طبعی ہے۔ رابرنسن کا قول کیرکٹر یا سیرت کی تعریف میں کیا خوب ہے کہ

"زبردست جذبات اور اُن پر زبردست قابو کا نام سیرت ہے"۔

لیکن اگر کوئی شخص جو گل چشم (وہ شخص جس کی آنکھ میں سفیدی ہو) بعلت مولودی (پیدائشی) ہو یہ دعویٰ کرکے کہ میں اپنی تمام زندگی پھر کبھی بد نظری کا مرتکب نہیں ہوا تو کونسی خوبی ہے۔ اگر گونگا کہے کہ میں نے کبھی کسی کو گالی نہیں دی یا کسی کی بدگوئی نہیں کی تو یہ کوئی قابلِ تحسین بات نہیں ہے۔ کوئی بلند مکان کی چھت پر کھڑا ہے اور نیچے زمین پر شیر موجود ہے۔ اگر وہ شخص اوپر ہی سے پکارے کہ "دیکھو میری بہادری کہ میں شیر سے مطلق خوف نہیں کھاتا" تو کون ہے جو اُس کے اس بزدلانہ و مضحکہ خیز دعویٰ پر نہ ہنسے گا؟ ہندوستان میں تیاگی بیراگی لوگوں کا بھی یہی حال تھا اور ہے۔ لق ودَق (سنسان جگہ) صحرا میں یکتہ و تنہا رہتے ہوئے اوّل تو اُن کا ماحول ہی اس قسم کا ہوتا ہے کہ عملی بدی کا امکان ہی محال ہوتا ہے بد نظری کریں تو کس پر۔ زنا کریں تو کس سے وہاں اُن کے سوا اور کوئی نہیں ہوتا۔

اسی طرح چوری، جھوٹ اور عداوت وغیرہ کا بھی کوئی امکان وہاں نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہاں ایسے مواقع ہی ناپید ہوتے ہیں۔ لیکن افسوس کہ اعضائے جسمانیہ کو معطل و بے کار کرنے سے بھی نیت میں خواہشات بد کا دریا لہرایا کرتا ہے۔ کیونکہ سانپ کے بِل کو مارنے سے سانپ نہیں مرتا۔ اگرچہ عملی گناہوں کا موقع نہیں ملتا اور اُن کا امکان عارضی طور پر مِٹ بھی جاتا ہے۔ لیکن خیالی گناہ سے رہائی محال ہے۔ جس طرح ایک کوڑھی والدین کا بچہ طبعی موروثی طور پر مبروص (کوڑھی) ہونے کے باعث دیگر کوڑھیوں سے الگ رکھے جانے پر بھی بُرص (کوڑھ) کے جراثیم سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس میں اس مرض موذی کے جراثیم سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس میں اس مرض موذی کے جراثیم ضرور قائم رہیں گے۔ اُسی طرح ارثی گناہ آلودہ طبیعت ترکِ دُنیا اور تزکیہ نفس (نفس کو پاک کرنا) سے بحال نہیں ہو سکتی۔ اور گناہ کے موروثی مرض ہونے کی شہادت کلامِ الٰہی یوں پیش کرتا ہے۔ "دیکھ! میں نے بدی میں صورت پکڑی اور میں گناہ کی حالت میں ماں کے پیٹ میں پڑا" (زبور ۵:۵۱؛رومیوں ۱۲:۵)۔ "کیونکہ میں جانتا تھا کہ تو بالکل بے وفا ہے اور رحم ہی سے خطاکار کہلاتا ہے" (یسعیاہ ۸:۴۸)۔ اور نہ ہی سمادھی (عہد، بدلہ، ناممکن کوشش، ثبوت پیش کرنا) لگانے اور محض ارادہ پر زور دینے سے گناہ سے رہائی ممکن ہے۔ کیونکہ "اِرادہ تو مجھ میں موجود ہے مگر نیک کام مجھ سے بن نہیں پڑتے چنانچہ جس نیکی کا اِرادہ کرتا ہوں وہ تو نہیں کرتا مگر جس بدی کا اِرادہ نہیں کرتا وہ کرلیتا ہوں" (رومیوں ۷:۸-۱۹) پس گناہ کا ازالہ اِنسانی تدابیر سے محال ہے۔ گناہ کی علت چونکہ بُری خواہش ہے اور وہ کسبِ بد سے پیشتر ہی موجود ہوتی (یعقوب ۱۴:۱-۱۵)۔ اور خواہش بد کوئی اکتسابی شے نہیں بلکہ طبعی موروثی ہے۔ اس لئے ریاضت وغیرہ سے اُس کا

انسداد (روکنے کا بندوبست) وازالہ تو تب ہی ممکن ہوتا اگر وہ کوئی تحصیلی اور اکتسابی شے ہوتی۔ اس لئے مقدس پولُس فرماتا ہے۔ "ان باتوں میں اپنی ایجاد کی ہوئی عبادت اور خاکساری۔ اور جسمانی ریاضت کے اعتبار سے حکمت کی صورت تو ہے، مگر جسمانی خواہشوں کے روکنے میں ان سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا" (کلسیوں ۲۳:۲)۔

قدرت نے جو طاقتیں ہمارے اندر پیدا کر دی ہیں وہ بذاتہ بُری نہیں ہیں۔ بلکہ اُن کو اچھا یا بُرا بنا دینا ہماری نیت کے حُسن یا قبح پر مُنحصر ہے۔ اور ان قابلیتوں کو مسلوب و بیکار کر دینا فطرت کے خلاف جہاد اور خُدا کی مرضی سے بغاوت ہے۔ اسی لئے پولُس رسول نے یہ جانتے ہوئے کہ غصہ ایک فطرتی جذبہ ہے اُس کے متعلق فرمایا کہ "غصہ تو کرو مگر گناہ نہ کرو۔ سورج کے ڈوبنے تک تمہاری خفگی نہ رہے" (افسیوں ۲۶:۴)۔ ایک بزرگ جہاندیدہ کا قول ہے کہ

"وہ بیوقوف ہے جسے کبھی غصہ نہیں آتا۔ اور وہ عقلمند ہے جو غصے کو آنے نہیں دیتا"۔

مشہور یونانی حکیم سقراط کی بیوی نہایت بدمزاج اور زودرنج تھی۔ ایک دن اُس نے سقراط کو ایک معاملہ پر بہت سخت سُست کہا۔ مگر وہ اُس کی بے لگام زبان کی ہنگامہ خیز روانی کو دیکھ کر دروازے میں چُپ چاپ جا بیٹھا۔ اُس کی اِس خاموشی سے وہ اور بھی بھنائی اور غُصہ سے برتنوں کا دھوون اُس کے سر پر انڈیل دیا۔ سقراط نے غصہ کو روکتے ہوئے نہایت نرمی اور خندہ پیشانی سے فرمایا کہ "اس قدر گرجنے کے بعد برسنا بھی ضروری تھا"۔ اور خُداوند مسیح نے سب سے بڑھ کر انتقامی جذبات پر قابو پانے اور صبر و برداشت کرنے کی عملی مثال صلیب پر دشمنوں کے حق میں معافی و برکت مانگنے سے پیش کی (لوقا ۳۴:۲۳)۔ پھر خُداوند مسیح کی شمع محبت کے پروانے مقدس ستفنس نے بھی اپنے پیر طریقت کی طرح بوقت سنگسار ہونے کے اپنے دشمنوں کے حق میں یہ دُعا مانگی کہ "اَے خُداوند یہ گناہ ان کے ذمہ نہ لگا" (اعمال ۶۰:۷)۔ ان تمام اِمثلہ توضیحات سے منتہائے مقصود اور خلاصہ المرام یہ ہے کہ فطرتی قویٰ اور نیچرل جذبات و جبلت کو معطل کرنے کی بجائے اُن کو ایک مُنظم صورت میں بطریق احسن جائز استعمال لانا عین دانائی اِنسانیت اور خُدا کی فرمانبرداری ہے۔

ہمارے نفسانی و بہیمی قویٰ (قوتِ حیوانیت) جب بدکرداری و نفسانیت کی طرف مائل ہوتے ہیں تو اُن کی حالت کا خاکہ کچھ اس طرح پر ہوتا ہے۔ جیسے ایک گندی بدرو شہر سے تمام گندگی و غلاظت کو لے جا کر باہر ایک بسیط (کشادہ) قطعہ اراضی کو دلدل اور تعفن (بدبو) کا مرکز بنا دیتی ہے۔ اور ہر کوئی اُس جگہ سے نفرت کرتا ہے اور کوئی بھی اُس کے پاس سے گذرنا پسند نہیں کرتا۔ یہ خاکہ اُس وقت کا ہے جب ہمارے جذبات پر سفلی (پستی کے) عنصر غالب ہوتا ہے۔ اب اس تصویر کا دوسرا رُخ جو نہایت حسین اور دلکش ہے ملاحظہ ہو۔ ایک زیرک و دانا آدمی اُسی قابل صد نفرت و کراہیت قطعہ اراضی کو اس طرح پسند عام و خوشگوار بنا دیتا ہے کہ اُس خطہ میں ایک خوشنما باغ لگا دیتا ہے۔ اور اُسی کھاد والے پانی سے اُسے سینچتا ہے۔ اب وہ زمین دیگر قطعات کی بہ نسبت زیادہ زرخیز ہونے کے باعث پودوں کو زیادہ خوراک دیتی ہے۔ اور وہی متعفن و غلیظ جگہ اہل شہر کی دلبستگیوں (دل لگنا) کا مرکز بن جاتی ہے۔ بھانت بھانت (طرح طرح) کے میووں کی کثرت فواروں کی سیم ریزی۔ شمیم گل (خوشبودار پھول) کی عنبر (سمندر کی ایک قسم کی سوکھی جھاگ جس کو جلانے سے خوشبو پیدا ہوتی ہے) بہتری طیور (پرندے، چڑیاں) کی نغمہ سنجیاں، باد نسیم (صُبح کی ٹھنڈی ہوا) کی نطق باریاں (بات کا وقت)، گلہائے دلکشائے کے رنگین مرقعے (تصویروں کی کتب) خوش بہار پھولوں کے جمگھٹے، زائران (زیارت کرنے والوں) و دلدادگان (عاشق) فطرت کی گلگشت (باغ کی سیر) سے روضہِ جنت (جنت کا باغ) کا دھوکہ پڑتا ہے اور وہی گھنونی و مکروہ جگہ اپنی رعنائیوں اور دلفریبیوں میں کیف زا (نشے کا سرور، حالت) اثرات لئے ہوئے شائقین فطرت کے لطیف جذبات پر کھیلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہی حال ہماری جسمانی قوتوں کا ہے۔ قدرت نے جس خاص مقصد کے

ماتحت ان کو پیدا کیا ہے اُس سے تجاوز کرنا الٰہی سرتابی اور قانون قدرت کی خلاف ورزی ہے۔ان طاقتوں کو معطل کرنا یااُن کے مخصوص افعال سے باز رکھنا اور دبانا ایسا ہی مضرت رساں (نقصان پہنچانے والا) ہے جیسا کہ بدررَد (گندہ پانی باہر جانے کا راستہ، نالی) کو بند لگا دینے سے شہر میں غلاظت و گندگی کے جمع ہو جانے کے باعث مختلف امراض کے پھیلنے سے نقصان ہوتا ہے۔

ریاضت وغیرہ کے خیالات گناہ کے وجود اور اُس کے باعث اِنسان کی رُوحانی بے چینی اور اضطراب کے مظہر ہیں۔اور یہ بھی اظہر من الشمس (روز روشن کی طرح عیاں) ہے۔ان اِنسانیت سوز طریقوں پر صدیوں عمل درآمد کرتے رہنے کے بعد بھی اِنسان حقیقی اطمینان قلبی اور سکون باطنی سے بے نصیب ہے۔وجہ اس کی یہ ہے کہ مصائب جسمانی وآلام (الم کی جمع، رنج و غم) روحانی کے موجبات (سبب) کا صحیح سراغ لگانے میں لوگ قاصر رہے۔جب تک کسی مرض کی علت کا علم نہ ہو اُس کے نتائج سے بچنا ناممکن ہے۔ہمیشہ سبب کی مدافعت (روک) سے نتیجہ کی مدافعت ہوا کرتی ہے۔جس طرح ہم بارہاذکر کر چکے ہیں کہ ہمیشہ اشرف کے بگاڑ سے ادنیٰ کی اصلاح ممکن ہے نہ کہ اُس کے برعکس۔پس گناہ رُوح کو عارض (بیماری) ہے اور بطور نتیجہ اُس کے آثار جسم میں بھی ظاہر ہیں۔رُوح اور جسم کا تعلق بطور مرکب کے سمجھیئے۔یایوں کہیں کہ رُوح ہماری زندگی میں مثل ایک ہاتھ کے ہے اور اعضائے جسم اُس کے ہتھیار بقول شخصے۔

جب تک ہے رُوح جسم میں چلتے ہیں دست دیا

دُولھا کے دم کے ساتھ یہ ساری برات ہے

جب رُوح پاکیزہ اور دل عارف کی طرح صاف اور گناہ کے رنگ سے منزہ ومبرہ ہوتی ہے تو ان ہتھیاروں کو نیک کاموں میں استعمال کرتی ہے۔ اور جب وہ نفس امارہ (انسان کی خواہش جو گناہ کی طرف مائل کرئے) کے دام تزویر (فریب کا جال) میں مبتلا ہوتی ہے تو ان ہی ہتھیاروں کو بدی کی راہ میں استعمال کرتی ہے۔مثلاً زید اور بکر کے پاس دو تلواریں ہیں۔زید نے اپنی تلوار سے کسی بے گناہ کا سر قلم کر دیا اور بکر نے اپنی تلوار سے ایک شیر کو مار کر چند راہگیروں کی جانیں بچادیں۔ہر دو صورتوں میں تلوار اچھی یا بری نہیں بلکہ تلوار کے استعمال کنندوں کی طبائع (طبیعت) نیک یا بد ہیں۔اسی طرح جو نیک یا بدافعال ہمارے اعضاء سے صادر ہوتے ہیں وہ رُوح کی بدیانیک خصلت کے آئینہ دار ہیں۔جب ہماری رُوح کا مطلع صاف (روح کا برائی سے پاک ہونا) نہیں ہوتا اور اُس پر گناہ کے تاریک بادل چھائے ہوئے ہوتے ہیں، تو ان ہی اعضاء سے ہم بُرے کاموں کو انجام دیتے ہیں۔ہاتھوں سے چوری، حق تلفی، ظلم اور خون ریزی، زبان سے دروغ گوئی، دروغ حلفی اور گالی ودشنام، آنکھوں سے بد نظری، فحش بازاری کُتب کا مطالعہ اور عیب بینی، کانوں سے ہزلیات (بے ہودہ باتیں)، بدگوئی، نمامی اور نفسانی جذبات کو برانگیختہ کرنے (غصہ دلانا) والے قصے سُننا پسند کرتے ہیں۔دماغ ہمیشہ بدی کے منصوبے باندھتا اور پاوں ٹیڑھی روشیں اختیار کرتے ہیں۔اور جب ہماری روحانیات پر آفتابِ صداقت کی ضیاباریاں (روشنیاں پھیلانا) ہوتی اور رُوح آغوش محبوب کی طرح پاک وبے عیب ہوتی ہے۔تو اسی دماغ سے جذبات سعیدہ (نیک وبھلے) اور خیالات پسندیدہ اُبلے پڑتے ہیں۔اور لطیف وسحر آگیں پاکیزہ تخیل خندہ سیال (شریر مادہ) کی طرح پھوٹ پھوٹ کر باہر نکلتا ہے۔زبان سے خُدائے عزوجل کی تعریف وتوصیف کی خراماں موسیقی وکیف زا ترنم نکل کر لبوں پر کھیلتا ہے اور غمزدوں کے لئے تسلی سے بھرے ہوئے فقرے زبان سے نکلا کرتے ہیں۔ہاتھ خیرات پر مستعد ہونے اور مریضوں کی مرہم پٹی و تیمارداری کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔کان کلامِ الٰہی کی آواز پر جھکتے اور بدگوئی سننے سے نفرت کرتے ہیں۔اور دل میں شکر گزاری، محبت، نیکی، رَحم، ہمدردی، معافی اور خُداپرستی کے جذبات وخیالات جوش مارتے ہیں۔غرض یہ کہ روحانی کمالیت سے ہماری جسمانی زندگی بھی متاثر ہو کر روحانیت میں بے دل ہو جاتی ہے اور انسان بالکل نیا مخلوق بن جاتا ہے۔پر جس طرح لوہے کی دوکان پر سونا نہیں مل سکتا۔اسی طرح بغیر خُداوند مسیح کے جو تمام جہان

کے طبیت روحانی ہیں۔ رُوحانی کمالیت اور دِلی صحت کا حاصل ہونا قطعی محال ہے۔ شفاخانہ حیوانات میں صرف مویشیوں کا علاج ہوتا ہے اِنسانوں کا علاج نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح ہمارے تمام جسمانی امراض و عوارض کا علاج معالجہ ہسپتالوں میں ہوتا ہے۔ لیکن روحانی مرض (گناہ) کے علاج کے لئے کوئی شفا خانہ دُنیا میں موجود نہیں ہے۔ مریض روحوں کو حکیم حاذق (کامل، اپنے فن میں ماہر) اور طبیب صادق خُداوند مسیح ہے۔ اُس پر ایمان لانے والے اور دلی توبہ سے اُس کے حضور جانے سے روحانی پاکیزگی حاصل ہوتی ہے۔ پس تمام ریاضت کرنے والے اور تھکے ماندے اور بوجھ سے دبے ہوئے لوگوں کو اطمینان رُوحانی اور سکون قلبی دینے کے لئے خُداوند مسیح دعوت دیتا ہے (متی ۲۸:۱۱۔۳۰)۔

(۴)

عقل اور مذاہب

مذہب کی ضرورت

اِنسان فطری طور پر کمزور اور بیکس ہے اور کسی ایسے دستگیر وحاجت روا قادر اور عظیم طاقت کے تحت ہو کر رہنا چاہتا ہے جو اُس کی مشکلات ومصائب کو حل اور حوائج (حاجت کی جمع، ضروریات) وضروریات کو پورا کر سکے۔ ہر اِنسان اپنی طبعی کمزوری کے سبب ایک حاجت روا کی ضرورت کا قائل ہے۔ کوئی زبان سے لاکھ انکار کرے لیکن زبانی انکار اُس زبردست حقیقت کے وجدانی (دریافت کرنا) احساس کی تسکین کا موجب نہیں ہو سکتا۔ اس عالم اسباب میں اُس فوق الفہم اور غیر مرئی (وہ جس کو دیکھا نہ جاسکے) ہستی کے ثبوت کے لئے سب سے بڑی عقلی دلیل استدلال اِنی (نیزے کی نوک جیسی دلیل) ہے (یعنی مصنوع سے صانع کا تصور) اس سے آگے عقل طبعی کی رسائی محال ہے اور اِنسان محدود العلم اور قاصر العقل عقلی دلائل کے زینے لگا کر وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ جس طرح اس خارجی مادی عالم کے قوانین طبعیہ کے ساتھ اجسام مادیہ کثیفہ کی موافقت ومناسبت رہنے سے اجسام قائم اور زندہ رہتے ہیں۔ اسی طرح رُوح اِنسانی کے اُس عالم رُوحانی کے قوانین رُوحانیہ کے ساتھ تطابق وتوافق (مشابہت ومیل) کے باعث رُوح اِنسانی صحت کی حالت میں برقرار رہتی ہے۔ اگر اجسام مادیہ کی عالم خارجی کے ساتھ مطابقت قائم نہ رہے۔ تو وہ فنا ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر اَرواح انسانی کی اُس عالم رُوحانیہ لطیفہ کے ساتھ موافقت قائم نہ رہے تو وہ فنا ہو جاتی ہیں۔ خُدائے قدیر وحکیم نے اپنی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ سے جس طرح ہماری جسمانی پرورش کے لئے اس مادی دنیا میں تمام ضروری اور مکتفی (کافی) سامان مہیا کر دئے ہیں۔ اُسی طرح ہماری رُوحانی پرورش کے لئے بھی اُس نے تمام ضروری سامان پیدا کر دئے ہیں۔ اور وہ سامان جو ہماری حوائج رُوحانیہ اور ضروریات اخلاقیہ کو پورا کرتا ہے اُسی کا نام مذہب ہے۔ بعض لوگ جن کا روحانی معیار اور مذہبی نکتہ نظر بہت پست ہے خواہ مخواہ امور معاشرت اور چند ظاہری نشان وغیرہ رکھنے کو بھی مذہب کا جُز بنائے بیٹھے ہیں۔ معاشرت وسیاست تو جسمانی مذہب ہی کا جُز ہیں۔ رُوحانی مذہب میں ان کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ مذہب کا تعلق صرف ہماری رُوحانی زندگی کے ساتھ ہے اور بس۔ پس ثابت ہوا کہ جس طرح جسمانی زندگی کو قائم رکھنے کے لئے جسمانی اسباب کی ضرورت کا انکار ناممکن ہے۔ اسی طرح رُوحانی زندگی کے قیام وبقا کے لئے مذہب کی ضرورت کا انکار ناممکن ہے پس یہی مذہب کی ضرورت ہے۔

عدم مذہب سے اِنسانی زندگی میں بد اثرات نظر آنے لگتے ہیں۔ تجربہ شاہد ہے کہ جسم میں صحت مفقود اور علالت (بیماری) موجود ہو جاتی ہے۔ دیگر صورت میں جب ہم روحانی قوانین سے تجاوز کرتے ہیں تو ہماری رُوح صحت کی بجائے رُوحانی امراض کا شکار ہو جاتی ہے۔ اور رُوحانی مرض کا نام گناہ ہے۔ خُداوند کریم نے اپنی عنایت بے غایت (بے مطلب) سے ایسے سامان بھی فطرت میں پیدا کر دئے ہیں جن سے ان جسمانی امراض کی مدافعت ہو سکے۔ ہر مرض کے علاج کے لئے ہر نوع کی جڑی بوٹیاں اور ادویہ کارخانہ فطرت میں موجود ہیں۔ ہر مرض کی تشخیص (شناخت) اور علاج ومعالجہ کی

مفصل تشریحات کُتبِ طب میں موجودہیں۔اب جب کہ خُدائے حکیم وقدیر نےاِنسان کوجسمانی عوارض سے نجات دلانے کے لئےاس قدر اعلیٰ سامان عطاکئے ہیں تولازمی امر ہے کہ روحانی امراض (گناہ) کی مدافعت کے لئ نسبتاًاُن سے بھی اعلیٰ سامان عنایت کرے۔ چنانچہ روحانی طب کی کتاب بائبل مقدس ہے جس میں روحانی امراض کی تشخیص (شناخت) اوراُن (گناہوں) سے نجات حاصل کرنے کے نہایت تیر بہدف (عین نشانے پر، سریع التاثیر)اورلاثانی نسخے مرقوم ہیں۔جو کوئی مرض گناہ کے شافی وقطعی علاج کاخواہشمند ہو وہ بائبل مقدس کی طرف متوجہ ہو۔پس مذہب کاپہلا کام یہی ہے کہ وہ اِنسان کی روحانی فطرت کلے فساد کو دور کرکے اُسے اُس کی اصلی فطرت یعنی پاکیز گی پر بحال کرے۔اور جب تک خاطی وعاصی اِنسان خُدا کی طبیعت پر مطبوع (طبع کیاہوا، دل پسند) نہ ہوجائے۔یعنی گناہ سے قطعی مبرہ منزہ نہ ہوجائے اُس کا خُدائے پاک وقدوس کے ساتھ ملاپ ناممکن ہے۔کیونکہ متضاد طبائع کا اجتماع محال ہے۔ مذہب کادوسرا کام یہی ہے کہ وہ اِنسان کا خُدا تعالیٰ سے میل کروائے۔گناہ اوراُس کے تمام بدنتائج سے رہائی۔ نیک اور پاک طبیعت کا حُصول اور خُدااوراِنسان کے مابین ملاپ پیدا کرنے اسی کانام نجات یامکتی ہے۔ لہٰذا مذہب کا کام یہی ہے کہ وہ اِنسان کو گناہ سے کامل نجات دلائے۔

عقل کا کام

بعض مذاہب محض عقل کی محدوداور کمزوربنیادپر قائم ہیں۔اور مجرد عقل (صرف عقل) کی دوڑدھوپ کے حاصلات کومذہب حقّہ قرار دے کر خُدا کی ہستی سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔اور بعض جو خُدا کی ہستی اور وجود کے قائل بھی ہیں تووہ نیچر ہی کو خُدا سمجھے ہوئے ہیں اور خُدا کو غیر از فطرت یافوق الفطرت ہستی تسلیم نہیں کرتے۔ان دونوں سوالات کا خلاصہ یہ ہوسکتاہے کہ یاتوخُدا کوئی شے نہیں اوراگروہ کچھ ہے تو یہ ثابت ہے کہ یاتوخُدااسم با مسمی (جیسانام ویسا گن)اور قوت واہمہ (وہ قوت جس سے انسان سوچتاہے) کی اختراع ہے اور یاخود خُداہے۔مذہب جنسی اعلیٰ وارفع برکت تو خُدانے اس لئے بخش دی تھی کہ اِنسان اس کی پیروی میں اپنی روش کو درست کرے۔اوراُس کے سانچے میں ڈھل کے حقیقی روحانی اخلاقی شائستگی کو حاصل کرے۔ لیکن فی زمانہ زندہ دل لوگ اس کواُلٹے معنوں میں لے رہے ہیں۔مذہب کواپنی تقلید (پیروی) پر چلارہے ہیں۔اوراپنی عقلی ودُنیوی شائستگی کے سانچے میں اُس کوڈھال کراُس میں جدت طرازیاں (نئے طریقے سے سجانا) کرتے ہیں۔اور مذہب کو سائنس کی قیود (قید) میں ڈال کر تسخیر ہمزاد (جن یاپری کو قید کرنا) کی طرح اُس پر غالب آناچاہتے ہیں۔۔۔آریہ بھائی مذہب کو سائنس کے ماتحت کرکے ریل گاڑیاں اور ہوائی جہاز بھی ویدوں میں سے برآمد کررہے ہیں۔حالانکہ سائنس کا تعلق صرف مادیات ومحسوسات سے ہے اور مذہب کا تعلق غیر مادی روحانی حقائق سے سائنس کانکتہ خیال اورہے اور مذہب کل مطمحِ نظر (اصلی مقصد)اور سائنس اوراُس کے مادی مشاہدات وتجربات اوراُس کی دیگر معلومات۔۔۔اس مادی وحادث خلقت کابیان کرتی ہےاور مذہب اس خلقت کی مادی وغیر فانی حیثیت کے متعلق واقفیت بہم پہنچاتاہے۔مذہب کا تعلق طبیعات کی زندگی سے نہیں۔اس کے برعکس سائنس کاتعلق غیر مرئی (وہ جس کو دیکھانہ جاسکے)۔فوق الفہم اور لطیف روحانی حقائق سے نہیں ہے۔دونوں کے مقاصد جدا، خیالات جُدا، طریق کار مختلف اور نتائج مختلف ہیں۔ جس طرح علم النفس (انسان کے تحت الشعور اور لاشعور کی تحقیق کاعلم)اور علم اقلیدس (اشکال ریاضی اور ہندسے کاعلم) دونوں کے اغراض ومقاصد اور نکتہ ہائے نگاہ میں بعد المشرقین ہے۔اسی طرح مذہب اور سائنس کے مقاصد ونکتہ ہائے نگاہ میں تفاوت (فرق، جدائی) ہے۔ واضح ہو کہ اِنسان کے گنہگار ہو کر فطرت کی طبعی مادی حقیقتوں کا علم نہیں کھویا تھا۔اس واسطے مذہب کا یہ کام نہیں کہ اُس کا قدرتی اشیاء کی ماہیت (جوہر

،مادہ) سے تعارف کروائے۔ بلکہ گناہ کی تاریکی نے اُس کی اصلی روحانی اور پاکیزہ فطرت اور خُدائے تعالیٰ کی صحیح پہچان پر پردہ ڈال دیا تھا۔اس واسطے مذہب صرف خُداشناسی تک پہنچانے اور اِنسان کو اُس کی اصلی پاکیزہ فطرت کا تصور دلانے کا ضامن ہے۔اور یہی اُس کا نفس مضمون ہے۔ کشش ثقل (وہ کشش جو ہر شے کو مرکز زمین کی طرف مائل کرتی ہے) کے قانون کی واقفیت اِنسان کے طبعی بگاڑ کو دور کر کے اُسے پاک وراست نہیں بنا سکتی۔پس سائنس کا دائرہ عمل اس خارجی مادی عالم کی طبعی حقیقتوں تک محدود ہے۔اور سائنس کی حدود سے آگے مذہب کی عمل داری ہے۔ وہ لا محدود، غیر مادی، غیر مرئی (وہ جس کو دیکھا نہ جاسکے) رُوحانی حقیقتوں کے علم وعرفان کا سرمایہ دار ہے۔اگر مذہب کا کام صرف سائنس بیان کرنا ہوتا تو پھر مذہب کی عدم ضرورت ثابت ہے۔ کیونکہ سائنس کی تحقیقات کے نتائج مذہب سے حاصل نہیں ہوئے۔ بلکہ عقل اِنسانی کے محدود وغور خوض کا ماحصل (حاصل) ہیں۔ یہ بھاری غلطی مدتوں سے اس واسطے پڑی ہوئی ہے کہ مجرد عقل (اکیلی عقل) پر بھروسہ کر کے اصولات عقلیہ اور اُصولاتِ دین ومذہب قرار دے کر اِنسان نے مذہب کو مجرد عقل کا مشغلہ اور دماغی ورزش کا تختہ مشق سمجھا ہوا ہے۔ عقل کا کام۔۔۔ یہ ہے کہ کسی شئے کا امکان یا ضرورت ثابت کرے۔اس سے آگے اِنسان کو۔۔۔ دود آمیز روشنی میں کچھ نظر نہیں آتا۔ عقل صرف یہ حکم کرتی ہے کہ یہ کارخانہ حیات ایک نہایت اعلیٰ اور بے نظیر صنعت (ایسی کاریگری جس کی کوئی مثال نہیں) ہے۔اور کوئی بڑے سے بڑا حکیم فلاسفر یا سائنس دان نیچر (فطرت) کی ادنیٰ سے ادنیٰ شئے کا مثل بنا نہیں سکتا۔اس سے آگے عقل یہ کہتی ہے کہ نیچر کی اس بے نظیر کل (مشین، آلہ) کے پُرزوں کو حرکت دینے والا کوئی انجینئر بھی ایسا ہی بے مثل ہونا چاہئے۔اور وہی انجینئر مصنوعات فطرت کا صانع (کاریگر) بھی ہوگا لیکن یقینی طور پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ کوئی صانع یا کاریگر ہے۔ کیونکہ اگر ہے تو عقل کے پاس اُس کا کیا ثبوت ہے؟ عقل ایسے نادیدہ اور **الطف وادق وجود** کا کوئی ثبوت جو قابل **اشارہ حسی** ہو دے نہیں سکتی۔ عقل کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ "ہونا چاہئے نہ کہ ہے"۔ مثلاً ایک خوابیدہ شخص کے پاس سے ایک گدھا گزرتا اور غائب ہو جاتا ہے۔اور بیدار ہونے پر وہ اُس کے آثارِ قدم دیکھتا ہے۔ تو اُس کے دل میں فوراً دو خیال پیدا ہوتے ہیں۔ کہ یا تو کوئی گدھا یہاں سے گذرا ہے اور یا گھوڑی کا بچھیرا۔ کیونکہ ان دونوں کے پاوں کی بناوٹ اور کمیت وکیفیت میں کچھ فرق وامتیاز نہیں ہے۔ اگر گدھے کے نقشِ قدم کہے تو اُس کے پاس کوئی ثبوت نہیں کیونکہ گدھا وہاں موجود نہیں ہے۔اور نہ ہی بچھیرے کے نقشِ پاء (قدموں کے نشان) کہہ سکتا ہے کیونکہ یہ امر یقینی نہیں ہے۔اور ہر دو کے سموں میں کوئی مابہ الامتیاز (کچھ فرق) نہیں۔ پس ثابت ہوا کہ وہ عقل اس معاملہ میں محض امکان ہی ثابت کر سکتی ہے نہ کہ حقیقت جب کہ مجرد عقل فطرت کے روزانہ صدہا (بہت زیادہ) واقعات کے یقینی ثبوت کے لئے کوئی قطعی حکم نہیں لگا سکتی، تو اُس فوق الفطرت اور بعید از فہم وادراک صانع حقیقی ومالک تحقیقی کو کیسے ثابت کر سکتی ہے۔اور غیر مرئی (وہ جس کو دیکھا نہ جاسکے) رُوحانی حقائق کی تفہیم وتعقل (سمجھنا، سوچنا) میں کیسے کامیاب ہو سکتی ہے۔اس منزل پر پہنچ کر عقل طبعی کے پَر جلتے ہیں اور وہ معطل وحیران ہو جاتی ہے۔ "کیا تو تلاش سے خُدا کو پا سکتا ہے؟ کیا تو قادرِ مطلق کا بھید کمال کے ساتھ دریافت کر سکتا ہے" (ایوب ۱۱: ۷)۔ "خُداوند خُدائے اَبدی وتمام زمین کا خالق تھکتا نہیں اور ماندہ نہیں ہوتا۔اُس کی حکمت ادراک سے باہر ہے" (یسعیاہ ۴۰: ۲۸)۔

عقل کا دائرہ عمل

کولھو کے بیل کی نقل وحرکت ایک خاص دائرہ تک محدود ہوتی ہے اور وہ اُس مخصوصہ محیط (خاص دائرہ) سے باہر نہیں جاسکتا۔ وہی اُس کا دائرہ عمل ہوتا ہے۔ اسی طرح عقل کا دائرہ علم وادراک محض محسوسات ومرئیات تک ہی محدود ہے۔ اور محسوسات ومادیات کے متعلق ہی عقل کے تجربات قابلِ تقسیم ہوسکتے ہیں۔ اور بدیہی حقائق کی تحقیق وتدقیق (باریک بینی، سوچ بچار) کے لئے عقل خالق نے اچھی رہنما بخش دی ہے۔ اور وہ محض ظاہری وباطنی حواسِ عشرہ کی مدد سے خارجی عالم کی طبعی حقیقتوں کی دریافت کرسکتی ہے۔ حواسِ خمسہ (پانچ حواس دیکھنے، سُننے، سونگھنے، چکھنے اور چھونے کی پانچ قوتیں) ظاہری یہ ہیں۔ حس مشترک، خیال، وہم، حافظہ، قوت متصرفہ (تصرف کرنے والی طاقت، بعض صورتوں کو بعض معانی کے ساتھ نسبت دینے والی قوت)، جس طرح ظاہری کی تمام قویٰ کی درۃ التاج قوتِ باصرہ (انسانی قوت) ہے۔ اُسی طرح حواسِ باطنی میں قوت متصرفہ سب سے زیادہ کارآمد اور اعلیٰ ہے۔ بس عقل ان ہی حواس عشرہ (وہ دس قوتیں جن سے ادراک ہوتا ہے) کے کندھوں پر ہاتھ دھر کے چلنے والی ہے اور اُن کی محتاج ہے۔ جس طرح ایک جنگی سپہ سالار کی کامرانی ونصرت (فتح) کا تمام تر انحصار اچھی، قابل اور تربیت یافتہ پلٹن اور بہترین اصلاح محاربہ (لڑائی) پر ہوتا ہے۔ اور بغیر ان کے وہ معطل وبیکار ہوتا ہے۔ اسی طرح عقل اعضائے جسمانیہ کی سپاہ (گروہ، فوج) اور حواس عشرہ کے ہتھیاروں کے بغیر محض نکمی اور ناکارہ ہے۔ مثلاً اگر آنکھ نہ ہوتی تو حروف ایجاد نہ ہوتے۔ کتابیں لکھی نہ جاتیں۔ پریس اور مطابع کی اختراع نہ ہوتی۔ فوٹو گرافی، فلم سازی، رنگریزی ورنگسازی، نقاشی ومصوری خیاطی، نجاری، ہوائی جہاز، ریل گاڑی، اور دیگر ہر قسم کی مشینری کا وجود نہ ہوتا۔ علم النجوم، علم الاجسام، علم طب، علم جغرافیہ، علم اقلیدس اور خوردبین ودوربین وغیرہ ہرگز معرضِ ظہور میں نہ آتے۔ غرض یہ کہ اِنسان علم وفضل اور تہذیب وشائستگی سے قطعی بے بہرہ ہوتا۔ اور انسان وحیوان میں کوئی بالا امتیاز نہ رہتا۔ دیگر حواس پر آنکھ کو ہم نے اسی لئے فضیلت دی ہے کہ وہ عقل کے لئے سب سے زیادہ کارآمد آلہ ہے۔ اسی واسطے جناب خُداوند مسیح نے کیا خوب فرمایا کہ "بدن کا چراغ آنکھ ہے۔ اگر تیری آنکھ درست ہو تو تیرا سارا بدن روشن ہوگا۔ اور اگر تیری آنکھ خراب ہو تو تیرا سارا بدن تاریک ہوگا۔ پس اگر وہ روشنی جو تجھ میں ہے تاریکی ہو تو تاریکی کیسی بڑی ہوگی" (متی ۶: ۲۲-۲۴؛ لوقا ۳۴:۱۱-۳۶)۔ پس ثابت ہوا کہ تمام عقلی کارنامے محض حواس کی موجودگی کی برکت ہیں۔ اور جہاں حواس کام نہ دیں وہاں عقل مجرد بیکار ثابت ہوتی ہے۔ لہٰذا رُوحانی واخلاقی حقائق ودقائق (دقیقہ کی جمع، باریکیاں) جو کسی حس سے محسوس نہیں ہوسکتے اُن کی تفہیم وتعقل (سوچنا، سمجھ) عقل مجرد سے قطعی ناممکن ہے۔ اور عقلی وعلمی کمالیت سے روحانی واخلاقی ترقی لازم نہیں آتی۔ جب تک اُس میں کوشش نہ کی جائے۔ جو شخص کیمسٹری میں ماہر اور یگانہ عصر ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ اُسی علم کی روشنی میں الٰہیات کا بھی عالم ہو۔ عقلی باتیں تو عقل دریافت کرسکتی ہے۔ لیکن فوق العقل حقائق کو کیسے جان سکتی ہے؟ آگ جلادیتی ہے برف ٹھنڈی ہوتی ہے۔ پانی ہمیشہ نشیب کی طرف بہتا ہے۔ سورج سے روشنی اور حرارت صادر ہوتی ہے۔ ہوا اور پانی کے بغیر زندگی نہیں۔ سنکھیا (ہر وہ چیز جو زہر قاتل ہو) مہلک ہے۔ عسل (شہد) شیریں ہے۔ حنظل (اندرائن کا پھل جو سخت کڑوا ہوتا ہے، تُماں) تلخ ہے۔ حبّ (گولی) الملوک دست آور شے ہے۔ دو متوازی خطوط کا اتصال (ملاپ) محال ہے۔ دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ جو جُز میں ہے وہ کل میں ہے وغیرہ یہ سب بدیہی حقیقتیں ہیں۔ ان پر اور ایسے ہی اور ہزاروں امور پر تمام افرادِ عالم من حیث الاجتماع (بہت سے گروہ) اتفاق کلی رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تمام حقائق تجاربِ مشہود (تجربہ سے ثابت کیا گیا) پر مبنی اور حواس سے محسوس ہوسکتے اور بدیہی الظہور ہیں۔ لیکن طبعیات بدیہیات میں بھی بعض امور ایسے ہیں

جن پر سب لوگ اتفاق نہیں رکھتے۔ مثلاً آریہ وغیرہ مادہ وارواح اِنسانی کو قدیم مانتے ہیں۔اور مسیحی ومسلمان اور دیگر بہت لوگ حادث مانتے ہیں۔حالانکہ مادہ دیدنی کثیف اور عقلیات حسیات سے ہے۔اور ہر انسان اپنی رُوح کا کم وبیش وجدانی احساس رکھتا ہے۔جب بدیہیات میں ایک عقل دوسری عقل کے مخالف ہے۔اور عقلی نتائج میں بعد المشرقین ہے۔ تو عقل روحانی اور غیر مرئی (وہ جس کو دیکھا نہ جاسکے) وغیر محسوس حقائق لطیفہ اورامور دقیقہ کی دریافت میں کیسے کامیاب ہوسکتی ہے ؟ اور رُوحانیات ومذہبیات کے متعلق تضاد وتناقض فی العقول بدیہی ہے۔عالم کا عدم سے بحکم الٰہی موجود ہو جانا۔الہام معجزات ،گناہ اور نجات ،حیات بعد از ممات ،وجود ملائکہ قیامت ، عدالت ،اَبدی سزااور اَبدی زندگی وجود ایزد تعالیٰ وغیرہ امور سب مذہبیات وایمانیات سے متعلق ہیں۔اور سب فوق الفہم والعقل حقائق ہیں اور عقل کی رَسائی سے باہر ہیں اور جب تک کوئی صداقت یاحقیقت اپنے علم کا موقع نہ دے عقل خود بخود اُس کا علم حاصل نہیں کرسکتی۔پس عقل محدود ہے اور محدودات سے باہر اُس کی قوت پر بھروسہ رکھنالا حاصل ہے۔

ارتقائے عقل

ہم نے نہایت تفصیل کے ساتھ اس امر کو واضح کردیا کہ عقلِ اِنسانی محدود ہے اور وہ کسی حد کے اندر اندر رہ کر ہی اپنا کام کرسکتی ہے اور اس سے آگے نہیں جاسکتی۔درختوں کے اُوپر بے حد خلاء موجود ہے۔اُن کے آسمان تک بڑھ جانے میں کوئی شئے مانع (روکنے والا، ممانعت) نہیں۔تمام فضاءاُن کو آسمان تک بلند ہونے کے لئے دعوت دے رہی ہے۔لیکن دیکھئے کہ وہ اپنی مقررہ حدود تک ترقی کرلینے کے بعد رُک جاتے ہیں۔اسی طرح طبقہ نباتات ،حیوانات اور اِنسان کے قدو قامت کے آسمان تک بڑھ جانے میں کوئی شئے محدود ومُسد (بند کیا گیا) نہیں جہاں تک وہ بڑھنا چاہیں بڑھیں۔لیکن مشاہدہ یہ ثابت کرتا ہے کہ کوئی شئے ارتقائی (بتدریج بڑھنا) لحاظ سے اپنی مقررہ حُدود سے تجاوز نہیں کرسکتی۔تو بھلا عقل اِنسانی اپنی حدود سے کیسے متجاوز ہوسکتی اور کس طرح امور رُوحانیہ اور حقائق لطیفہ وغیر محسوسہ کو جان سکتی ہے ؟ خُدا نے ہر شئے کے ساتھ عقل کی بھی حد ٹھہرائی ہے۔"تُو نے اُس کی حدوں کو مقرر کردیا ہے جنہیں وہ پار نہیں کرسکتا"(ایوب ۱۵: ۱۴)۔"تُو نے حد باندھ دی تاکہ وہ آگے نہ بڑھ سکے"(زبور ۱۰۴: ۹،۹۶: ۱۹)۔

واضح ہو کہ گو خُدا نے عقل کو محدود بنایا ہے۔لیکن جس طرح تمام اشیاء میں اُس قادر مطلق نے ارتقائی قوتِ فطری طور پر رکھ دی ہے۔اور ہر شئے ابتدائی وسطی اور انتہائی منازل ترقی کو بتدریج (آہستہ آہستہ) طے کرتی جاتی ہے۔اسی طرح عقلِ اِنسانی کے لئے بھی میدان ترقی وسیع ہے۔ایک بیج جو زمین میں بویا جاتا ہے وہ تہ خاک ہی میں پورا درخت نہیں بن جاتا۔وہ خاک کے نیچے زیادہ سے زیادہ دو یا تین انچ لمبا ہو سکتا ہے۔کیونکہ ارتقاء انتہائی کے تمام سامان زمین کے نیچے موجود ہیں ہوتے۔پوری ترقی پودا زمین سے باہر نکل کر ہی کرسکتا ہے۔اسی طرح انڈے کے اندر جو چوزہ ہے وہ اُس خول کے اندر بقدر گنجائش ہی بڑھ سکتا ہے۔لیکن کمالیت اُس خول سے باہر نکل کر ہی حاصل کرسکتا ہے۔اس بیان سے پودے اور چوزے میں کمالیت کی عدم استعداد (قابلیت نہ ہونا) مراد نہیں، بلکہ ارتقائی صلاحیت واستعداد تو ہوتی ہے پر زمین اور خول بیضہ اُن کی کمالیت کے محدود ہوتے ہیں۔اور حصول کمال کے تمام وکمال سامان وہاں نہیں ملتے۔اسی طرح رُوحِ اِنسانی اسی جسمی خول کے اندر رہتے ہوئے حصول کی استعداد تو ذاتی طور پر رکھتی ہے، پر مخصوص حدود سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔اور رُوح کی قوتِ تعقل (سوچنے سمجھنے کی قوت) کو ترقی کے مواقع نہیں ملتے۔مقدس پولُس رسول نے اس حقیقت پر روشنی ڈالی ہے۔وہ فرماتا ہے کہ "اب ہم کو آئینے میں دھندلا سا دکھائی دیتا ہے۔مگر اُس وقت رُوبرو دیکھیں گے۔اس وقت میرا علم ناقص ہے مگر اُس وقت ایسے پورے طور پر پہچانوں گا جیسے میں پہچانا گیا ہوں"(۱۔کرنتھیوں ۱۲: ۱۳)۔"کیونکہ ہمارا علم ناقص ہے اور ہماری نبوت ناتمام لیکن جب کامل

آئے گا تو ناقص جاتا رہے گا"(ا۔ کرنتھیوں۹: ۱۳-۱۰)ہماری عقل اس جسم میں خول کے اندر رہ کر رُوحانی اور نادیدنی حقائق کو ایمان کی آنکھ سے دُھندلا سا دیکھتی ہے۔ لیکن ایک وقت آئے گا جب عقلِ انسانی سے حجاب اُٹھ جائے گا اور اُس وقت وہ رُوحانی حقیقتوں کو رُوبرو دیکھے گی۔ رُوحانی ترقی اس جسم میں شروع ہو جاتی ہے اور بتدریج اس فانی جسم سے آزاد ہو کر وہ ترقی کمال کو پہنچے گی۔ "اور ہم اُس جلالی صورت میں درجہ بدرجہ بدلتے جاتے ہیں"(ا۔ کرنتھیوں۱۸: ۳)۔اور ہمارے عقلی ورُوحانی قویٰ بقدر متناہی (انتہا کو پہنچنے والا) ترقی کرتے کرتے لامحدود نہ ہو جائیں گے۔ کیونکہ محدود شئے ابد تک ترقی کرنے سے بھی لامحدود نہیں ہو سکتی۔

عقل اور موالیدِ ثلٰثہ

ماہرین طبعیات تمام موجودات کو طبقاتِ ثلٰثہ (تین گروہ) میں منقسم کرتے ہیں۔ جمادات نباتات اور حیوانات اور انسان کو طبقہ حیوانات میں شامل کر کے اُسے حیوانِ ناطق (بولنے والا حیوان) کہتے ہیں۔ ان ہر سہ طبقات میں خاصیات وصفات کے لحاظ سے خاص امتیازات (فرق) نظر آتے ہیں۔ جو ایک طبقہ کو دوسرے سے اشرف یا ادنیٰ ٹھہراتے ہیں۔ مثلاً جمادات میں قوتِ نامیہ (بڑھنے کی قوت) مفقود (غائب) ہے اور نباتات جسم نامی ہے۔ یعنی اُس میں نمو کی قوت موجود ہے۔ ازیں وجہ وہ جمادات سے اعلیٰ ہے۔ پھر نباتات میں حس، ارادہ اور حرکت معدوم ہے۔ لیکن حیوانات میں قوتِ نامیہ کے علاوہ حِس، حرکت، ارادہ اور جان موجود ہے۔ حیوانات حساس، متحرک بالِارادہ اور ذی جان ہیں۔ اور انسان وحیوان میں وجہ امتیاز نفسِ ناطقہ ہے یعنی اِنسان ذی جان ہونے کے علاوہ ذی رُوح بھی ہے۔ اور اُس میں ادنیٰ طبقاتِ ثلٰثہ کی حیثیتیں اُس کے اعلیٰ وافضل مدراج میں پائی جاتی ہیں۔

وہ پتھر لکڑی اور ہتھیار کے نقصان سے بھی واقف ہیں۔ پھر طبقہ حیوانات کو اِنسان کی نسبت بہت ہی تھوڑا علم ہے۔ گائے بھینس، بیل، گھوڑا، اُونٹ، بھیڑ، بکری، گدھا، کتا، طوطا، مرغی وغیرہ اپنے مالک کو خُوب پہچانتے ہیں۔ اور غیر آدمی کو غیر سمجھتے ہیں۔ انسان کے غصہ اور نرمی وہمدردی میں امتیاز کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ بدیہی (ظاہر) بات ہے کہ وہ اِنسان کی حقیقت کو ایسا نہیں جان سکتے جیسا اِنسان اُن کو جان سکتا ہے۔ اِنسان جمادات کو جانتا ہے۔ پتھر کوئلے، سونا، چاندی، اور دیگر دھاتوں کے خواص وفوائد سے بخوبی واقف ہے۔ علمِ طب میں ہر نوع کی جڑی بوٹیوں اور پھولوں پھلوں کی تشریحات موجود ہیں۔ ان کے فوائد اور نقصانات سے کاملِ واقفیت رکھتا ہے۔ حیوانات کا پُورا علم رکھتا ہے۔ علم الاجسام، علم خواص الاشیاء، علم الانوار، علم النفس طب اور صدہا علوم وفنون جو اِنسانی تحقیقات کا ماحصل ہیں اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ اِنسان ہر سہ ادنیٰ طبقات کا علم کامل اور یقینی رکھتا ہے۔ برخلاف اس کے ادنیٰ طبقات کو اِنسان کا کچھ علم نہیں ہے۔ پھر طبقہ اِنسانی میں بھی عقلاء وجُہلا کی تفریق ہے۔ جو کچھ حکماء وعقلا طبقہ جُہلاء کے متعلق علم رکھتے ہیں وہ جُہلاء ان کے متعلق نہیں رکھتے۔ بچے والدین کی نسبت اس قدر علم نہیں رکھتے جس قدر والدین بچوں کی نسبت۔ اسی طرح اِنسان ضعیف البیان (کمزور، آدم) اور ناقص العقل ومحدود العلم کی ہستی جس قدر مذکورہ بالا تین طبقوں سے اعلیٰ ہے اُسی قدر بلکہ اُس سے بھی لاکھ درجہ خُدائے تعالیٰ بے حدود بے عد کے بالمقابل ادنیٰ ہے۔ تو بھلا اِنسانی عقل کی کیا مجال ہے کہ وہ طبقہ الٰہی اور حقائق رُوحانی ودقائق (دقیقہ کی جمع، باریکیاں) فوق الفہم کی حیطہ ادراک میں لاسکے۔ عقل اِنسانی محض من حیث الآثار ہی طبقہ الٰہی اور وجود لامتناہی کا کچھ تصور کر سکتی ہے۔ جس طرح حیوانات کا علم اِنسان کے متعلق بہت ہی معمولی اور ناقص ہے۔ اُسی قدر بلکہ اُس سے بھی بدرجہا کم اِنسان اپنی عقل متناہیہ وفہم محدود سے حقائق قُدسیہ الٰہیہ کی تفہیم کر سکتا ہے۔ اور بطور استدلال انی معلول (وہ شے جس کا کوئی باعث یا سبب ہو، اصطلاح منطق میں نتیجہ، پھل) سے علت (سبب) اور مصنوع سے صانع کا تصور کر سکتا ہے۔ "کیونکہ جو

کچھ خُدا کی نسبت معلوم ہو سکتا ہے وہ اُن کے باطن میں ظاہر ہے۔(اور وہ بھی)اس لئے کہ خُدا نے اُس کو اُن پر ظاہر کر دیا۔ کیونکہ اُس کی اَن دیکھی صفتیں یعنی اُس کی ازلی قدرت اور الوہیت دُنیا کی پیدائش کے وقت سے بنائی ہوئی چیزوں کے ذریعے سے معلوم ہو کر صاف نظر آتی ہیں۔ یہاں تک کہ اُن کو کچھ عذر باقی نہیں"(رُومیوں ۱۹:۱-۲۰)۔ مشاہدہ فطرت سے خُدا کا صرف مثالی علم ہی حاصل ہوتا ہے۔ لیکن اُس کی حقیقت کا یقینی علم محال ہے۔ اگر کائنات کے صرف مشاہدہ ہی سے خالق کا یقینی اور صحیح علم حاصل ہونا ممکن ہوتا۔ تو دُنیا میں اُس کی ہستی اور ماہیت کے متعلق خیالات و آراء میں منافقت و مخالفت نہ ہوتی۔ پس اِنسان محجوب الفہم (پوشیدہ سمجھ) من حیث العقل (عقل رکھنے والے) حقائق الٰہی اور وجود لا متناہی کے صحیح تصور میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ "واہ! خُدا کی ذات اور حکمت اور علم کیا ہی عمیق ہے۔ اُس کے فیصلے کس قدر ادراک سے پرے اور اُس کی راہیں کیا ہی بے نشان ہیں۔ خُداوند کی عقل کو کس نے جانا۔ یا کون اُس کا صلاح کار ہوا"؟(رُومیوں ۳۳:۱۱-۳۴)۔

عقل کی عدمِ صحت

واضح ہو کہ عقل طبعی کی کارگزاری کے نتائج عالم میں مختلف ہیں جس سے عقل ناقابل اعتبار ٹھہرتی ہے۔ اسی عقل نے ہزاروں لوگوں کی رہنمائی کی اور وہ خُدا کی ہستی سے منکر ہو گئے اور عقل کفر والحاد (سیدھے راستے سے کترا جانا، ملحد ہونا) کی موید (تائید کرنے والا) و بانی ٹھہری۔ اسی عقل کی رہنمائی میں لاکھوں اِنسان بتوں کو خُدا سمجھنے لگے۔ اسی عقل کی روشنی میں بیشمار لوگ بُت پرستی پر آمادہ ہو گئے۔ اسی عقل نے لاکھوں اِنسانوں کو گمراہ کر دیا۔ اور وہ گورپرستی (قبر پرستی) پیر پرستی، لنگ پرستی (عضو تناسل کی پرستش)، مردم (انسان) پرستی، عناصر پرستی، فطرت پرستی اور تناسخ جیسے غیر معقول و مجہول عقائد پر ضمیر فروشی کرنے لگے۔ اسی عقل نے ہدایت کی اور آریہ لوگ مادہ و ارواح کو قدیم ماننے لگ۔ اسی عقل کے اشاروں پر مسیحی و محمدی مادہ و ارواح کی ازلیت و قدامت کی تردید و تکذیب پر جھکے۔ غرضیکہ آج تک تفاوت فی العقول بدیہی طور پر ظاہر و باہر ہے۔ آخر یہ تمام عقائد یا عقل کے تمام نتائج تو صحیح نہیں ہو سکتے۔ ایک شخص کہتا ہے کہ پانچ اور پانچ نو ہوتے ہیں۔ دوسرا کہتا ہے گیارہ، تیسرا کہتا ہے سات اور چوتھا کہتا ہے دس، آخر ان چاروں کے جواب تو صحیح نہ ہوں گے۔ ایک ہی جواب درست ہو سکتا ہے۔ جب خُدا واحد و برحق ہے۔ اور تمام عقلیں بھی صحیح ہیں۔ تو مختلف عقائد اور متضاد خیالات کے وجود کے کیا معنی؟ ایک ہی خُدا اتنے متضاد و متناقض (نقص رکھنے والا) عقائد کا بانی نہیں ہو سکتا۔ پس اِنسانی عقلوں میں اختلاف و تناقص کی وجہ اُن کی عدم صحت ہے اور عدم صحت کا موجب گناہ۔ اس لئے موضوعاتِ عقلیہ کو کوئی حقیقی و الٰہی مذہب قرار دینا سراسر جہالت اور کج فہمی ہے۔ عقل کے تمام پُرزوں پر گناہ کا زنگ لگ گیا ہے۔ اس لئے اُس کی رفتار ہیں فرق ہے۔ اور ان آدمیوں میں ردوبدل پیدا ہوتا ہے "جن کی عقل بگڑ گئی ہے اور وہ حق سے محروم ہیں"(۱۔ تیمتھیس ۶:۵)۔ "کیونکہ اُن کی عقل تاریک ہو گئی ہے"(افسیوں ۱۸:۴)۔ "یہ ایسے آدمی ہیں جن کی عقل بگڑی ہوئی ہے اور وہ ایمان کے اعتبار سے نامقبول ہیں"(۲۔ تیمتھیس ۸:۳)۔ "جن کی عقلوں کو اس جہان کے خُدا(یعنی ابلیس) نے اندھا کر دیا ہے"(۲۔ کرنتھیوں ۴:۴)۔

میرا مطلب عقل کی عدم صحت سے یہ نہ سمجھا جائے کے گناہ کے باعث عقل کی قوتیں زائل ہو گی ہیں یا معدوم و ناپیدا نہیں ہو گئیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اصلی حالت پر نہ رہیں۔ مثلاً ہمارے سامنے میز پر دس گھڑیاں رکھی جائیں جو بخوبی چل رہی ہیں۔ بظاہر صاف اور صحیح معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن جب اُن میں وقت دیکھا جاتا ہے۔ تو سب میں دس دس، پندرہ پندرہ اور بیس بیس منٹ کا فرق ہے تو آخر کس بناء اُن کی رفتار پر صحت کا حکم لگایا جائے؟

گھڑیاں ثابت ہیں، پُرزے قائم ہیں۔ گھنٹے، منٹ اور سیکنڈ کی سوئیاں حرکت کررہی ہیں۔ مگر سب کے اوقات میں مطابقت ویکسانیت نہیں۔ اسی سے اُن کی عدم صحت ثابت ہوگی۔ یہی حالت جمیع عقول اِنسانی کی ہے۔ اس واسطے مجرد عقل کے نتائج وحاصلات کو کسی مذہب کا صحیح قرار دیناضلالت وگمراہی کو خوش آمدید کہنا ہے۔ عقل کی مذکورہ بالا حالت پر غور کرتے ہوئے ہمیں عقلی و نقلی طور پر عقل کی دو حالتیں معلوم ہوتی ہیں یعنی:۔

اوّل۔ پہلی حالت عقل کی وہ تھی جبکہ وہ کمالیت، صحت اور پاکیزگی کی حالت میں خالق کے ہاتھ سے نکلی۔ اس کے متعلق کلام اللہ کی شہادت یہ ہے ''اور خُدا نے اِنسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا'' (پیدائش ۱:۲۷)۔ یہاں خُدا کی صورت سے وجہ اللہ مراد نہیں ہے بلکہ اس صورت سے مراد رُوحانی صورت ہے۔ اکثر خبیث الطبع (ناپاک طبیعت) لوگ نادانی سے یہ سوال کیا کرتے ہیں۔ کہ چونکہ اِنسان خُدا کی صورت پر بنایا گیا ہے اور وہ جسم واعضاء رکھتا ہے۔ لہٰذا اِنسان کی طرح خُدا بھی جسم واعضاء رکھتا ہوگا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر اُن کے اس نامعقول معارضہ (جھگڑا) کا مدلل جواب لکھا جائے۔ اور گمراہوں کو راہ دکھائی جائے۔ جو لوگ علم تشبیہ واستعارہ سے واقف ہیں وہ ایسا بودا (بے مزہ، فرسودہ پُرانا) اعتراض نہیں کر سکتے۔ واضح ہو کہ ہر جگہ لفظی معنی لینا جائز نہیں۔ اور بالخصوص صحائف مطہرہ (پاک ہونے کا آلہ) کی عبارات کے سمجھنے میں زیادہ احتیاط برتنا چاہئے۔ ایک حکیم کہتا ہے کہ ''یہ نسخہ ہتھیلی پر سرسوں جمانے والا ہے'' تو اس سے لفظی معنی مراد نہ ہوں گے بلکہ محض دوا کی زُود اثری (جلد اثر کرنے والی) مراد ہوگی اور داؤد نبی خُدا سے یہ التجا کرتا ہے کہ ''مجھے اپنے پروں کے سایہ میں چھپالے'' (زبور ۸:۱۷)۔ تو کیا اس سے خُدا کو پرندہ سمجھا جائے گا؟ ہرگز نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ اَے خُدا مجھے اپنی پناہ وحفاظت میں رکھ۔ ''خُدا نے اِنسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا'' اس آیت میں اِنسان مُشبہ حسی ہے۔ خُدا مشبہ بہ عقلی اور وجہ شبہ مرکب عقلی ہے۔ جب مشبہ حسی اور مشبرہ عقلی ہو تو خدا کی صورت سے وجہ اللہ مراد لینا نادانی ہے۔ اگر مشبہ ومشبرہ دونوں حسی ہوں تو یہ سوال جائز ہو سکتا ہے۔ لیکن آیت زیر بحث میں تشبیہ تمثیل ہے۔ اور تشبیہ تمثیل میں وجہ شبہ مرکب حسی نہیں ہوا کرتی بلکہ مرکب عقلی ہوتی ہے۔ اور خُدا کے ساتھ اِنسان کا یہ اشتراک (شرکت، حصہ داری) صفاتی تشبیہی ہے۔ عین مطابقی نہیں۔ اور خلاصہ مطلب یہ ہوا کہ جس طرح خُدا پاک وفاعل مختار ذی عقل اور صاحب اِرادہ ہے۔ اُسی طرح اُس نے اِنسان کو بھی ان صفات سے مُتّصف (صفت رکھنے والا) فرمایا۔ خُدا کی صورت کے معنی ملاحظہ ہوں (افسیوں ۴:۲۴، کلسیوں ۳:۱۰) عقلی طور پر یہ حقیقت اس لحاظ سے درست ہے کہ اگر خُدا نے اِنسان کو پاک اور کامل نہیں بنایا تھا تو اُس کا گناہ میں گرنا خُدا سے انحراف وبغاوت نہیں۔ نہ ہی الٰہی سرتابی (نافرمانی) ہے اور خُدا نے اُس سے نیکی پاکیزگی اور اپنی متابعت (پیروی) کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ دوم خُدائے پاک وقدوس سے ناپاک طبیعت کے معلول کا اصدار محال ہے۔ پس ثابت ہوا کہ خُدا نے اِنسان کو پاک وراست بنایا تھا۔ یہ اِنسانی رُوح اور عقل کی حالت اوّلہ (بہتر) تھی (واعظ ۷:۲۹)۔

دوم۔ اور عقل کی حالتِ ثانیہ موجودہ متنزل اور بگڑی ہوئی حالت ہے۔ ''اُن کی عقل اور دل دونوں گناہ آلودہ ہیں'' (طیطس ۱:۱۵۔ ۲۔ تیمتھیس ۳:۸) عقل کے اسی انحطاط (کمی) وتنزل کے باعث پولُس رسول فرماتا ہے۔ ''مگر نفسانی آدمی خُدا کے رُوح کی باتیں قبول نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ اُس کے نزدیک بیوقوفی کی باتیں ہیں اور نہ وہ اُنہیں سمجھ سکتا ہے کیونکہ وہ رُوحانی طور پر پرکھی جاتی ہیں'' (۱۔ کرنتھیوں ۲:۱۴)۔ خُداوند یسوع مسیح نے جو مسرف بیٹے کی تمثیل (لوقا ۱۵:۱۱-۲۳) میں فرمایا ہے۔ وہ اِنسان کی اِسی دو قسم کی حالت کا مکمل فوٹو ہے۔ مسرف بیٹے کی پہلی حالت جب کہ وہ باپ سے رُخصت ہوا بہت دولتمندی اور خوشحالی وخوشی کی تھی۔ اور دوسری حالت انتہائی تنگدستی، ناداری اور کس مپرسی کی تی۔ چنانچہ رُوح وعقل اِنسانی کی

موجودہ حالت مسرف بیٹے کی حالتِ ثانیہ کے مطابق ہے۔اب خُداجو رحیم وکریم اور سرچشمہ محبت ہے کبھی ہو نہیں سکتا کہ اِنسان کو ابد تک اس عقلی وروحانی گمراہی میں رہنے دے۔اور ہم یہ بھی خوب جان گئے کہ محض عقل سے اوروہ بھی مریض ومتنزل عقل(بگڑی ہوئی عقل) سے خُدائے قادرِ مطلق کو جان نہیں سکتے۔کیونکہ عقل کے بازو ہم نے صدیوں آزمادیکھے۔اب عقلی مذاہب کے دعویٰ دار اور عقل کے شیدائی جواُس کواُس کے اصل مرتبہ سے بہت زیادہ بلند کرکے دکھاتے ہیں خوب غور کرلیں کہ عقل طبعی کس قدر قابلیت کی سرمایہ دار ہے۔اوراُس کواُس کے جائز درجہ سے بڑھ کر سمجھنا کس قدر کوراعتقادی(اندھایقین)،خوش فہمی اور حقیقت سے روگردانی ہے۔اب آخری ممکن اور صحیح صورت ہی ہوسکتی ہے کہ خُدائے تعالیٰ خود اپنا علم وعرفان اِنسان کو عطافرمائے۔اور کسی طرح سے اپنی ذات وصفات اور مرضی کواُس پر ظاہر کرے۔تاکہ اِنسان عقل کے پیچھے لگ کر گمراہی سے گمراہی کی طرف نہ بڑھتا چلا جائے۔اگلے باب میں ہم خُدا کے اُسی ذریعہ ووسیلہ کا بیان کریں گے جس کی وساطت سے ہم خُداشناسی تک پہنچ سکتے ہیں۔

(۵)

الہٰام کی ضرورت

جب رُوحِ اِنسانی پر انحطاط(کم ہونا) وتنزل نے قبضہ جمالیا اور اُس کا وہ نور بصیرت(دیکھنے کی قوت) جو خُدانے اُسے بخش دیا تھا گناہ کی تاریکیوں میں بالکل مدھم پڑ گیا اور چشم بصیرت پر معصیت(گناہ) کا پَردہ ساچھا گیا۔تواُس نے گناہ کی تیرگی میں ادھر اُدھر پاؤں مارنے شروع کئے اور اس ظلمت میں جو بھی پگڈنڈی(تنگ راستہ) اُسے سوجھی بس اُسی کو تھام لیا جیسے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا مگر راہِ حق کے حصول میں ناکام رہی۔عقل کی اس لاچاری اور بے بسی کی حالت میں خالق نے الہٰام کی مشعل سے صراطِ مستقیم(سیدھا راستہ) کی طرف اُس کی رہنمائی وہدایت فرمائی۔جس مدعا ومقصد کے حصول میں عقلِ اِنسانی ناکام رہی۔وہ خُدانے الہٰام کی وساطت سے عطافرمایا۔گویااُس فوق الفہم وادراہستی نے اِنسان سوءالفہم(خراب سمجھ) وفاسدالعقل(خراب عقل) اور محدودالعلم پر خود اپنی ذات وصفات اور مرضی کا انکشاف فرمایا کیونکہ اور کوئی صورت ممکن ہی نہ تھی۔

جوڑااور ترقی

یہ بدیہی(ظاہر) حقیقت ہے کہ فطرت کی کوئی شئے بغیر جوڑے کے کبھی ترقی نہیں کرسکتی۔ہر شئے جوڑے کے ساتھ مل کر بڑھ سکتی ہے۔ورنہ مجرد(تنہا) ہی رہتی ہے۔نباتات حیوانات اور انسان میں جوڑے کا وجود ترقی کی شرط ہے۔چنانچہ موجودات کی ہر ہر جنس میں مذکر ومونث اور نرومادہ کا وجود اس صداقت پر دال(دلیل) ہے۔آنکھوں کا جوڑا آفتاب ہے۔اگر آفتاب نہ ہو تو ہم کچھ بھی دیکھ نہ سکیں۔کان جوڑا ہوا ہے۔اگر ہوا نہ ہو تو ہم کوئی آواز بھی سن نہ سکیں۔بیج کا جوڑا زمین ہے۔اگر ایک بیج کو دس سال تک کسی ڈبی میں بند کر رکھیں تو وہ کبھی ترقی نہیں کرسکتا۔لیکن زمین میں بونے سے تیسرے دن اُگ آتا اور بتدریج کمال کو پہنچتا ہے۔اور ایک دانے کے درجنوں دانے ہوجاتے ہیں۔برقی تار کے دوسرے ہوتے ہیں۔ایک مثبت اور دوسرا منفی۔اگر ان دونوں کو باہم ملایا نہ جائے تو بجلی پیدا نہیں ہوسکتی۔لیکن ملانے سے فوراً بجلی پیدا ہوجاتی ہے۔اسی طرح عقل مجرد کولھو کے بیل کی

طرح ایک ہی مرکز کے گرد گھومتی رہتی ہے اور اپنی مخصوص حدود سے باہر نہیں جاسکتی۔ پس عقل کا جوڑا الہام ہے۔ جب دونوں کا ملاپ ہوتا ہے تو تیسری شئے پیدا ہوتی ہے اور وہ خُدا کی معرفت اور حقیقت کا علم ہے۔ موٹر صرف سمندر کے کنارے تک ہی پہنچا سکتی ہے۔ پار نہیں لے جاسکتی اور ممکن ہے کہ موٹر ڈرائیور یہ سمجھے کہ سمندر کے پَرے اور کوئی عالم نہیں۔ پس پانی ہی پانی ہے اور اسی طرح ویدانتی کی عقل بھی نیچر کے حالاتِ موجودہ اور تجاربِ مشہودہ (تجربات سے ثابت کیا گیا) کی بنا پر کہہ دے کہ اس عالم ناسوت (عالم اجسام، شریعت ظاہری عبادت) سے پرے اور کوئی رُوحانی عالم نہیں اور خُدا بھی کوئی غیر از نیچر شئے نہیں۔ بلکہ جو کچھ نظر آتا ہے وہی ہے۔ لیکن سمندر کے پار جہاز لے جاتا ہے، اور ثابت کرتا ہے کہ سمندر کے پار اور بھی دنیا بستی ہے اور اُس کی یہ کیفیت ہے۔ جس طرح موٹر اور جہاز دونوں کے ذریعے سمندر پار کی دُنیا کا علم حاصل ہوتا ہے۔ اُسی طرح عقل والہام کے ذریعے عالم ناسوت سے عالم لاہوت (ثروت کے بعیر، پونجی کے بغیر) تک پہنچنا اور اُس سے کم وبیش واقفیت حاصل کرنا ممکن ہے۔ اگر اِنسان میں عقل نہ ہوتی تو الہام بے معنی ہوتا۔ اور اگر الہام نہ ہوتا تو عقل رُوحانی اور الٰہی حقائق کے علم سے قاصر رہتی۔ بہر حال دونوں کا وجود ترقی کے لئے ضروری ہے۔ جب اِنسان اپنی کمزور عقل اور محدود حواس سے خُدائے بے حد کی ہستی کے متعلق صحیح علم حاصل کرنے میں قاصر اور مجبور ثابت ہوتو ایزد تعالیٰ نے اپنی ہستی اور عالم لاہوت کی کیفیت کو اپنی رُوح کے وسیلے بوساطت انبیاء مرسلین کے خود اُس پر آشکارا فرمایا۔ "جو چیزیں نہ آنکھوں نے دیکھیں نہ کانوں نے سُنیں۔ نہ آدمی کے دل میں آئیں وہ سب خُدا نے اپنے محبت رکھنے والوں کے لئے تیار کردیں۔ لیکن ہم پر خُدا نے اُن کو رُوح کے وسیلہ ظاہر کیا۔ کیونکہ رُوح (رُوح الٰہی) ساری باتیں بلکہ خُدا کی تہہ کی باتیں بھی دریافت کرلیتا ہے۔۔۔ اِسی طرح خُدا کے رُوح کے سوا خُدا کی باتیں کوئی نہیں جانتا" (ا۔ کرنتھیوں ۹: ۲-۱۱)۔

"رُوح خود ہماری رُوح کے ساتھ مل کر گواہی دیتا ہے" (رومیوں ۸: ۱۶)۔ اِنسانی عقل گویا منفی اور الہام الہیٰ (۲۔ تیمتھیس ۱۶: ۳۔۱۷)۔ مثبت ہے جب ان دونوں کا مِلاپ ہوا تو عقل اِنسانی میں نور آیا۔ اور الہام الٰہی وہ سلسلہ حقائق ودقائق لطیفہ رُوحانیہ اور نکات ومعارف (معرفت کی جمع، جان پہچان کے مقامات) قُدسیہ الٰہیہ ہے۔ جس کے ذریعے خُدا تعالیٰ تدریجی طور پر حصہ بہ حصہ اور طرح بہ طرح بنی نوع اِنسان پر اپنی مرضی ومنشا کا اظہار وانکشاف بذریعہ انبیاء مُلہمین (ملہم کی جمع، دل میں کوئی بات ڈالنے والا) کے فرماتا ہے۔ اور خُدا کی رُوح منزل علیہ کے ذہن عقل کو مکاشفہ دینے سے پہلے اس قابل بنالیتی ہے کہ وہ پیغامِ الٰہی کو قبول کرکے اُس کے مفہوم کو سمجھنے کی صلاحیت رکھے۔ "کیونکہ نبوت کی کوئی بات آدمی کی خواہش سے کبھی نہیں ہوئی۔ بلکہ آدمی رُوح القدس کی تحریک کے سبب خُدا کی طرف سے بولتے تھے" (۲۔ پطرس ۲۱:۱) اور عقلِ اِنسانی الہام الٰہی کے وصال سے لاانتہا نورانیت کے عالم میں پہنچ جاتی ہے۔ اور معرفتِ الٰہی کے اسرار سربستہ ورموز مخفیہ (پوشیدہ راز) کو سمجھنے کے قابل ہوجاتی ہے۔

عقل الہام کی متقاضی ہے

جس طرح امراض جسمانی وعوارض جسدانی (جسمانی ضروریات) اس دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ اور ہر شخص اُن کے متعلق ذاتی تجربہ رکھتا ہے اسی طرح عوارض رُوحانیہ بھی ہر شخص میں حقیقتاً اور بدیہی طور پر ظاہر ہیں۔ رُوح وجسم کے اجتماع کا نام اِنسان ہے۔ رُوح لطیف اور اشرف وجود ہے۔ اور جسم کثیف وادنیٰ شے ہے۔ چنانچہ رُوح کے بگاڑ سے جسم کا بگاڑ لازم آیا۔ جب رُوح پر مرض گناہ نے ڈیرے ڈال لئے تو جسم پر بھی اُس کے آثار ظاہر ہوئے۔ اور جسم بھی طرح طرح کے امراض میں پھنس کر قبضہ موت میں آگیا۔ اب یہ ہر دانشمند پر ظاہر ہے کہ امراض جسمانی کی مدافعت وازالہ کے لئے

خُدانے حکیم وقدیر نے بیشمار ادویہ اور جڑی بوٹیاں وغیرہ پیدا کر دی ہیں۔اور ماہرین طب اور حکماواطباء نے اُن کے خواص وفوائد کی مفصل تشریحات کتب طب میں فرمادی ہیں۔ یہ خُدا تعالیٰ کا وہ بے نظیر (بے مثال)انتظام ہے جس سے جسم کے تمام امراض کی مدافعت اور جسمانی زندگی کے استحفاظ واصلاح کے بارے میں اُس کی قدرت وحکمت ظاہر ہے۔ جس حال کہ اِنسان کی جسمانی زندگی کی صحت وقیام کے باب میں اُس نے اِس قدر سخاوت کے دریا بہادئے ہیں۔تو بڑے افسوس اور حیرت کا مقام ہوا گروہ اِنسان کی رُوحانی زندگی کی بہتری،اصلاح اور حفاظت کے باب میں بخل واغماض (کنجوسی اور چشم پوشی) سے کام لے۔ بلکہ جس طرح رُوح بہ نسبت جسم کے اعلیٰ اورانمول شئے ہے اُسی طرح اُس کی صحت وبقاکے لئے فطرت میں جسمانی اسباب کی بہ نسبت اعلیٰ رُوحانی اسباب ووسائل کاپیداکرنااوراعلیٰ قوانین کانفاذ زیادہ ضروری ولازمی ٹھہرتا ہے۔چنانچہ خُداوند کریم نے ایسا ہی کیااور رُوحانی امراض کی تشخیص(شناخت) ومدافعت کے لئے روحانی حکمت کی کتاب بھی نازل فرمائی۔اور وہ کتاب بائبل مقدس ہے۔"ہر ایک صحیفہ جو خُدا کے الہام سے ہے تعلیم اور الزام اوراصلاح اور راست بازی میں تربیت کرنے کے لئے فائدہ مند بھی ہے۔تا کہ مرد خُدا کامل بنے اور ہر ایک نیک کام کے لئے بالکل تیار ہو جائے"(۱۔تیمتھیس ۱۶:۳-۱۷)۔"کیونکہ جتنی باتیں پہلے لکھی گئیں وہ ہماری تعلیم کے لئے لکھی گئیں۔تا کہ صبر سے اور کتابِ مقدس کی تسلی سے اُمید رکھیں"(رومیوں ۱۵:۴)۔

پس عقل کے اس واجبی تقاضا کوالہام ہی پورا کر سکتا ہے۔اگر رُوحانی طب کی کتاب (الہام)اور روحانی اصلاح کے اسباب خُداوند کریم اس دُنیا میں ہمیں نہ بخشتا اور صرف جسمانی اسباب ہی کے دینے پر اکتفا کرتا تو اُس کی قدرت وحکمت پر دھبہ آتا تھا۔ لیکن اُس نے دونوں قسم کے انتظام کر کے ہمارے لئے عُذر کی کوئی وجہ نہیں چھوڑی۔

الہام اور باطنی شریعت

اِنسان فطرتاً عقلی اور اخلاقی وجود ہے اور خُدانے اُسے اپنی صورت پر پاک وراست،صاحب ارادہ اور فاعل مختار بنایا۔اور اپنی مرضی کا اظہار اُس پر فرمایا یعنی اخلاقی شریعت اُس کو بخشی۔وہ شریعت کسی ظاہری وتحریری صورت میں نہ تھی۔ بلکہ اِنسان کی عقل وضمیر پر مرتسم (مہرلگایا گیا) کی گئی تھی۔ جب اِنسان نے وہ باطنی اخلاقی شریعت کھودی۔اور گناہ کی تاریکی میں وہ انمول وبیش بہا شئے گم ہوگئی۔اورانسان کے دل سے خُدا کی وہ صورت جس کی مانند وہ بنایا گیا تھا محو ہوگئی تو اس کے لئے یہ مشکل پیش آئی کہ وہ کس طرح اُس گم شدہ الٰہی پاکیزہ صورت کی مانند خود کو پھر سے بنائے۔کیونکہ جب اصل شئے گم ہو جائے تو نقل کو اُس کے مطابق بنانا محال ہے۔جب نمونہ نادیدہ ہو تو دیدنی صورت کو اُس کے مشابہ کرنا مشکل ہے۔اب الہام الٰہی باطنی شریعت کی وہ ظاہری صورت ہے۔جس کے سانچے میں ڈھل کرانسان کمدر الصورت اور مفسد الطبع (باغی طبیعت) پھر سے اصلی پاکیزہ حالات پر آسکتا ہے۔شریعت الہامی (ظاہری) شریعت باطنی سے غیر نہیں۔ بلکہ اُسی کا اعادہ (دوہرانا) ہے۔الہام کی ضرورت یہی ہے کہ وہ اِنسان کو اس کی اصلی سرشت کی طرف دوبارہ رجوع کرائے۔اگر ابوالبشر (آدم) باطنی شریعت کو کھونہ دیتا تو کبھی اِنسان کو ظاہری الہامی شریعت دئے جانے کی ضرورت نہ ہوتی۔اِنسان کی اُس شوکت گذشتہ اور جلالت رفتہ کے آثار کچھ نہ کچھ اب تک موجود ہیں۔اور ہونا بھی یوں ہی چاہئے۔بقول شخصے۔

"از نقش ونگار ور ودیوار شکستہ   آثار پدید ست حنادید عجم را"

چنانچہ خلیفہ خُدا(اِنسان) کی ابتدائی پاکیزہ حالت اور شرع باطنی کا ثبوت تمام اقوامِ عالم میں نیکی وبدی کا وہ احساس واامتیاز ہے جو وہ خُدا کی ہستی اور الہام کے منکر ہونے کے باوجود فطری طور پر رکھتی ہیں۔ ''جو کچھ خُدا کی نسبت معلوم ہو سکتا ہے وہ اُن کے باطن میں ظاہر ہے'' (رومیوں ۱: ۱۹)۔ وہ نیکی کو نیکی اور بدی کو بدی کہتی ہیں۔ اگرچہ نیک وبداعمال کے تعین کے متعلق سب کے خیالات میں اتفاق کلی نہیں۔ تاہم نیکی کا خیال اور علم وعمل اور بدی سے نفرت ہر جگہ ہر قوم میں ظاہر ہے۔ اور باطنی شریعت کا بقیہ ہر منکر وملحد کے باطن میں موجود ہے۔ ''اس لئے کہ جب وہ قومیں جو شریعت نہیں رکھتیں اپنی طبیعت سے شریعت کے کام کرتی ہیں۔ تو باوجود شریعت (یعنی الہامی شریعت) نہ رکھنے کے وہ اپنے لئے خود ایک شریعت ہیں۔ چنانچہ وہ شریعت کی باتیں اپنے دلوں پر لکھی ہوئی دکھاتی ہیں اور اُن کا دل بھی ان باتوں کی گواہی دیتا ہے۔ اور اُن کے باہمی خیالات یا تو اُن پر الزام لگاتے ہیں اور یا اُن کو معذور رکھتے ہیں'' (رومیوں ۱۴: ۲-۱۵) پس ثابت ہوا کہ الہامی شرع اِنسان کی ابتدائی شرع باطنی کا اعادہ ہے۔ اُس سے علیٰحدہ نہیں بلکہ اُسی کے مطابق ہے اور الہام کی ضرورت ہی اس لئے ہوئی کہ شرع باطنی کو اِنسان نے گناہ کی تاریکی میں کھودیا تھا۔ گو اُس کا کچھ بقیہ ہر ایک کے دل میں موجود ہے پر وہ اِنسان کی کامل رہنمائی میں قاصر ہے۔ کیونکہ امتداد زمانہ اور ظاہری وباطنی انقلابات نے اُس میں بہت سی تبدیلی کر دی ہے۔ اب الہام خُدا کی طبیعت، مرضی اور رحمت ومحبت کا ظہور ہے۔ جس کے سانچے میں ڈھل کر اِنسان مجوب الطبع (ایسی طبیعت کا مالک جو پردہ میں رہنا پسند کرے) ومکدر الفطرۃ (کدورت آمیز فطرت) پھر ابتدائی پاکیزہ ومبارک حالت پر بحال ہو سکتا اور اپنی بگڑی ہوئی رُوحانی صورت کو آئینہ الہام میں سنوار کر دوبارہ خُدا کی صورت پر بن سکتا ہے گناہ کی تاریکی میں اِنسان خُدا سے بچھڑا گیا اور اپنے محبوب حقیقی کی فرقت (جدائی) سے بے قرار ہو کر اُس کی جستجو وتلاش میں مارا مارا پھرا کیا۔ لیکن اُس کے دیدار فیض آثار سے لطف اندوز نہ ہو سکا۔ دل میں آرزوئے دید کروٹیں لے رہی تھی۔ مگر اس حرماں نصیب کو اپنے پردہ نشین نادیدہ اور لامکاں محبوب کی آستاں بوسی کو فخر کبھی حاصل نہ ہوا۔ آخر خُدا نے خطوط ومراسلات (صحائف مطہرہ) کے ذریعے خود کو اُس پر آشکارا فرمایا اور اُس کی خواہشات کا جواب دیا۔ پس الہامی صحائف گویا خُدا کے مکتوب ہیں۔

شخصی مذہب

ہم گذشتہ صفحات میں دلیل وبراہین (دلیل) سے یہ امر پایہ ثبوت تک پہنچا چکے ہیں کہ اِنسانی عقل محدود ضعیف اور بگڑی ہوئی ہونے کے باعث معرفت حقانیہ اور حقائق رُوحانیہ کے افہام وتفہیم میں قاصر ہے۔ اور یہ بھی دکھا چکے کہ الہام ہی ایک ایسا ممکن اور معقول ذریعہ ہو سکتا ہے جو عقلِ اِنسانی پر غیر مرئی (وہ جس کو دیکھا نہ جاسکے) اور فوق الفطرت روحانی حقیقتوں کو مُنکشف کر سکتا ہے۔ چنانچہ الہامِ الٰہی پہلے شخصی طور پر خاص اشخاص پر نازل ہوا۔ ازمنہ سابقہ میں جب کہ مذہب الٰہی انفرادی صورت میں تھا خُداوند تعالیٰ نے خاص خاص اشخاص کے ساتھ کلام کیا۔ اور اپنی مرضی ومنشاء کو اُن پر شخصی طور سے ظاہر فرمایا۔ چونکہ تمام دُنیا اُس وقت گناہ کی غُلامی اور تاریکی میں مبتلا تھی اس لئے خُدا نے اُس میں سے خاص اشخاص کو انتخاب کرکے صراطِ مستقیم پر قائم کیا۔ مثلاً اُس نے ابراہام کو بُت پرستوں میں سے چُن لیا اور اُس سے یوں مخاطب ہوا (الہام دیا) ''تُو اپنے وطن اور اپنے ناطے داروں کے بیچ سے اور اپنے باپ کے گھر سے نکل کر اُس ملک میں جا جو میں تجھے دکھاؤں گا۔ اور میں تجھے ایک بڑی قوم بناؤں گا اور برکت دونگا اور تیرا نام سرفراز کروں گا۔ سو تو باعث برکت ہو۔ جو تجھے مبارک کہیں اُن کو میں برکت دُوں گا۔ اور جو تجھ پر لعنت کرے اُس پر میں لعنت کروں گا۔ اور زمین کے سب قبیلے تیرے وسیلے سے برکت پائیں گے'' (پیدائش ۱: ۱۲-۳)۔ ''اور ابراہام نے اُسی جگہ پر جہاں خُدا اُسے کسی دیدنی صورت میں نظر آیا تھا ایک قربان گاہ بنائی

اور وہاں خُدا کی عبادت کی‘‘(پیدائش ۱۲: ۷-۸) پھر یعقوب کے ساتھ خُدا ہمکلام (الہام) ہوا۔ ملاحظہ ہو (پیدائش ۲۸: ۱۳-۱۵) اور اُس نے بھی اُسی جگہ جہاں خُدا اُس سے ہمکلام ہوا ایک پتھر کا مذبح بنا کر اُس کا نام بیت ایل (خُدا کا گھر) رکھا اور خُدا کی عبادت کی (پیدائش ۱۸: ۲۸-۱۹) پھر کوہِ حورب کے نزدیک خُدا موسیٰ پر ایک جھاڑی میں لگی ہوئی آگ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اور اُس سے کلام کیا۔ اور اُس کے آباواجداد کے ساتھ کئے ہوئے وعدوں کو دوہرا۔ اور موسیٰ نے الٰہی حضور کو محسوس کر کے ازراہِ تعظیم اپنے پاؤں سے جوتی اُتاری اور مُنہ چھپایا (خروج ۳ باب)۔

قومی مذہب

پہلے الہام الٰہی شخصی تھااور مذہب الٰہی بھی شخصی۔اس لئے خُدا خاص اور چیدہ اشخاص کے ساتھ تنہائی میں ہمکلام ہوتااور اُن سے اپنے احکام کی تعمیل طلب کرتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ وہی مذہب الٰہی انفرادی خصوصیت سے نکل کر قومیت میں منتقل ہوگیا۔اور مذہب الٰہی ایک قومی مذہب اور الہام الہٰی ایک قومی الہام ہوگیا۔اور خُدائے تعالیٰ نے اپنے وعدے کے مطابق جو ابراہام سے کیا تھااُس کی نسل کو جواَب ایک قومی صورت اختیار کرچکی تھی چن کر تمام بت پرست اور مشرک اقوام سے الگ کیا۔اور اپنی خاص قوم بنایااور فرمایا۔ کیونکہ تُم خُداوند اپنے خُدا کے لئے ایک مقدس قوم ہو۔خُداوند تمہارے خُدا نے تُم کو رُوئے زمین کی اور سب قوموں میں سے چن لیا ہے تاکہ تم اُس کی خاص اُمت ٹھہرو"(استثنا۷: ۶)۔اوراس خاص قوم (بنی اسرائیل) پر موسیٰ کے وسیلے اپنی مرضی کااظہار فرمایا۔اوراپنے اوامر ونواہی کواُن پر نازل فرماکے اُن پر اُن کی تفصیل طلب کی۔"اس لئے جو فرمان اور آئین اوراحکام میں آج کے دن تم کو بتاتاہوں تم اُن کو مانااوراُن پر عمل کرنا"(استثنا۷:۱۶)اور وہ شرع الٰہی تین قسم کی تھی۔یعنی شریعت ملکی۔شریعت رسمی اور شریعت اخلاقی۔اور ملکی ورسمی شرائع کی رُوح رواں اور مرکز شرعِ اخلاقی تھی۔اب ہم نہایت مختصر طورپر شرائع ثلاثہ کاجُداجُدا بیان کریں گے۔

شریعت رسمی

قربانیاں،ختنہ،عیدیں،نئے چاند،نذریں،علت وحرمت،طہارتِ بدنی،روزہ اور کاہن وسردار کاہن اور لاویوں اور عام قوم کے فرائض وغیرہ سب رسمی شریعت میں شامل ہیں۔اس شریعت کا بیان پیدائش کی کتاب کے سواتوریت کی چاروں کتابوں میں موجود ہے۔

شریعت اخلاقی

اس میں احکام عشرہ موجود ہیں۔جو خُدا نے پتھر کی دونوں لوحوں پر لکھے لکھائے موسیٰ کو سونپے (خروج ۳۱: ۱۸،۳۲: ۱۵۔ ۱۶؛ ۳۴: ۲۸)اور یہ دس احکام (خروج ۱:۲۰۔ ۱۷) میں پائے جاتے ہیں۔اور احبار ۱۹ باب اور استثنا کے چند ابتدائی ابواب میں اُن کی مفعقل شرح موجود ہے۔ اوراس شرع اخلاقی کا خلاصہ بدیں(اس سے)الفاظ موجود ہے۔"تواپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری طاقت سے خُداوند اپنے خُدا سے محبت رکھ"(استثنا۶: ۵) یہ دس احکام کی لوح اول کے چار احکام کا خلاصہ ہے۔"اپنے ہمسایہ سے اپنی مانند محبت رکھ"(احبار۱۹: ۱۸) یہ لوح ثانی کے چھ احکام کا خلاصہ ہے۔اور خُداوند مسیح نے بھی اخلاقی شریعت کو ہر قسم کی شریعت رسمی وملکی کی جان ٹھہرایا۔اوراسی خلاصہ شرع اخلاقی کااعادہ فرماتے ہوئے یہ کہاکہ ان ہی دوحکموں پر تمام توریت اور انبیاء کے صحیفوں کا مدار ہے(متی ۲۲: ۴۰)۔

ملکی شریعت

اس میں بادشاہوں، قاضیوں اور حاکموں اور رعیت کے فرائض ہیں۔ اور حکام قوم اسرائیل شرائع رسمی واخلاقی کے محافظ تھے۔ شرع کی خلاف ورزی کرنے والے تعزیرات (تعزیر کی جمع، تبدیلی) ملکی کے ماتحت مختلف سزائیں پاتے تھے۔ تاکہ احکامِ الٰہی کی پابندی کی رُوح اُن میں پیدا ہو اور قوم خُدا کی مرضی ومنشاء کی قدر ومنزلت کو پہچانے۔

اخلاقی وجسمانی ہر دو قسم کے قوانین پہلو بہ پہلو اس قوم میں چلے آئے۔ اور بہت سے انبیاء یکے بعد دیگرے مختلف زمانوں اور متفرق حالتوں میں پیغامِ الٰہی لے کر اس قوم میں مبعوث ہوتے رہے۔ اور اپنے اپنے وقت میں قوم کی معاشرتی واخلاقی اِصلاح مختلف طریقوں سے کرتے آئے۔ اور ہزاروں برس کے طویل عرصہ میں خُدا کی اس برگزیدہ وچنیدہ قوم کی مذہبی واخلاقی حالت نے کئی رنگ پلٹے۔ کئی بار شرعِ الٰہی سے سرتابی وانحراف کرکے مورد عتاب ٹھہری۔ کئی بار توبہ واستغفار کے ذریعے بحال کی گئی۔ خُدا کا عادل ہے۔ اور اُس عادل نے قوانین کا نفاذ فرما کے اُن پر اس مخصوصہ گروہ کا مخصوص عمل طلب کیا۔ لیکن اُس نے بجائے فرمانبرداری کے عدول حکمی کی۔ اس لئے خُدا نے عادل ہونے کی حیثیت میں قانون شکن کو سزا دی۔ اور معیاد تعزیر (سزا کا دور) کے اختتام پر اُن کو رہائی دیتا رہا۔ اس قوم کا سب سے بڑا گناہ جو خُدائے غیور کی غیرت کو جوش دِلاتا رہا بُت پرستی تھا۔ جب جب اس قوم کو ارد گرد کی دیگر بے خُدا اور بُت پرست اقوام کے ساتھ ملنے کے مواقع ملے ان کی باطل پرستی اور کفر وشرک سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہی۔ اور خُدا نے ان ہی معائب ونقائص کے زنگ کو اُن کو طبائع سے مٹانے کے لئے بارہا اُنہیں مصیبت کی آگ میں ڈالا تاکہ وہ کندن کی طرح صاف اور خالص ہو جائیں۔ "جب وہ مجھے تالے گا تو میں سونے کی مانند نکل آوں گا" (ایوب ۱۰: ۲۳، زبور ۱۰: ۶۶)۔

شریعت کا مرکز

بنی اسرائیل قوم کے فرائض مذہبی کی انجام دہی کا مرکز پہلے تو خیمہ تھا جس کا مفصل احوال (خروج باب ۲۵) میں پایا جاتا ہے۔ خیمہ کو دینی امور کا مرکز اُس وقت اس وجہ سے بنایا گیا کہ ابھی قوم اسرائیل خود آوارہ غربت تھی۔ اور خیموں میں قیام کرتی تھی۔ اس لئے اُن کی مذہبی ضرورت کو عارضی طور پر پورا کرنے کے لئے خُدا نے خیمہ بنانے کا حکم دیا۔ اور ہر قسم کی شرع رسمی، ملکی واخلاقی کا تعلق اُسی سے تھا۔ اور جب یہ قوم رفتہ رفتہ ملک موعود کنعان پر قابض ہوئی اور وہاں ہر سکونت کے لئے مکان بنائے اور قصبے وشہر آباد کئے تو عبادتِ الٰہی کے لئے بھی ایک مکان بنایا گیا۔ اور وہ ہیکل تھی جو سلیمان بن داؤد نے شہر یروشلیم میں کوہ موریا پر تعمیر کی تھی۔ اور عبادت کے تمام لوازمات واسباب خیمہ موسوی سے اس ہیکل میں منتقل ہوئے اور ہیکل کی تعمیر کے متعلق خُدا نے پہلے ہی اُن کے ایام مسافرت میں فرمادیا تھا۔ "لیکن جب تم یردن پار جا کر اُس ملک میں جس کا مالک خُداوند تمہارا خُدا تم کو بناتا ہے بس جاؤ۔ اور وہ تمہارے سب دشمنوں کی طرف سے جو گردا گرد ہیں تم کو راحت دے اور تم امن سے رہنے لگو۔ تو وہاں جس جگہ کو خُداوند تمہارا خُدا اپنے نام کے مسکن کے لئے چن لے وہیں تم یہ سب کچھ جس کا میں تم کو حکم دیتا ہوں لے جایا کرنا۔ یعنی اپنی سوختنی قربانیاں اور اپنے ذبیحے اور اپنی دہ یکیاں۔ اور اپنے ہاتھ کے اُٹھائے ہوئے ہدئے اور اپنی خاص نذر کی چیزیں" (استثنا ۱۰: ۱۲-۲۶، ۱۸، ۱۱)۔

اس ہیکل کے ساتھ قوم بنی اسرائیل کے سوااور کسی قوم کا کوئی تعلق نہ تھا۔اور نہ ہی عام اجازت تھی کہ غیر اقوام اُس سے تعلق رکھیں۔اور نہ ہی شرعِ الہیٰ کی نشرواشاعت کا دیگر اقوام میں حکم تھا۔ ہیکل ایک مختص بالقوم وزمان عبادت گاہ تھی۔اور قوانین وشرع الٰہی بھی محدود بالقوم وزمان تھی۔ مدتوں تک مذہبِ الٰہی اُس خاص قوم کے ساتھ خاص رہا۔اور قوم اسرائیل کو ختنہ ،قربانی،روزہ،سبت،طہارت اور حلت وحرمت کے احکام دینے اوران تمام فرائض کی انجام دہی کا مرکز یروشلیم کی ہیکل کو ٹھہرانے سے خُدا کا مقصد یہ تھا کہ ایک تواردگرد کی تمام دیگر بت پرست اقوام سے قوم مخصوصہ الٰہیہ کا افتراق وامتیاز(جدائی) صاف نظر آئے۔ جس طرح فوجی لوگ خاص امتیازی نشانات وعلامات کے باعث بادشاہ کی رعیت کے عام افراد سے جُداگانہ اور ممتاز نظر آتے ہیں۔دوسرے یہ کہ اُن ظاہری اور رسمی دستورات اور ابتدائی اصولوں کی پابندی سے اُن کے اندر متابعت(فرمانبرداری)الٰہی کی بنیاد رکھی جائے۔تاکہ جہاں وہ اپنے مویشی اور مال واسباب کو عقیدت الٰہی کے مذبح پر قربان کرتے ہیں وہاں کسی وقت اپنی شخصیت کو نثار کرنے میں بھی دریغ نہ کریں۔ چنانچہ خُداوند تعالیٰ نے یہ ابتدائی سبق اُنہیں انبیاء کے ذریعے خوب سکھایااوران رسمی قربانیوں اور دیگر ظاہری اور جسمانی رسومات کی تکمیل وتعمیل کے مطالبہ سے مقصدِالٰہی یہ تھا کہ فرمانبرداری اور اطاعت کے بیج کو اُن کے دلوں میں بو یا جائے۔اور وہ خاص روحانی مقصد جوانِ عارضی وظاہری رسوم کے دائرہ کا مرکز تھا۔بدیں الفاظ ظاہر کیا گیا ہے۔"تُو خُداوند اپنے خُدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری طاقت سے محبت رکھ" (استثنا۶:۵)۔

عہدِ عتیق مختص بالقوم اور مختص بالزمان تھا

اگر کوئی متلاشی حق وصدق صاف باطنی سے عہدِ عتیق کا اول سے آخر تک مطالعہ کرے تو وہ یہ اقرار کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ توریت کا مذہب ایک مختص بالقوم ولزمان تھا۔ توریت میں ذاتی طورپر ایک عالمگیر مذہب ہونے کی صلاحیت نہیں ہے۔اور نہ ہی اُس کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ ہر زمانے اور ہر قوم کے لئے دی گئی ہے۔اُس کے تمام احکام وشرائع اور دستورات واصولات خاص قوم بنی اسرائیل سے ہی مختص تھے۔اور شریعت موسوی کی تعمیل وتکمیل کا مرکز یروشلیم کی ہیکل تھا۔یہودیت کے دائرہ خاص سے باہر نہ تواُس کی تبلیغ واشاعت کا حکم کہیں موجود ہے۔اور نہ ہی کبھی یہودی انبیاء نے اُس کی ترویج کو غیر اقوام میں جائز رکھا۔ بلکہ وہ توبُت پرست غیر اقوام کے درمیان خُدا کا نام لینا بھی خُدا کی بے عزتی وحقارت سمجھتے تھے۔جب شاہ نبو کدنظر تمام یہودیوں کو اسیر کرکے بابل لے گیا تواُس وقت اُن کی دینی غیرت اور خُدا کے نام کی توقیر کا اظہار ان الفاظ سے عیاں ہے۔"ہم بابل کی ندیوں پر بیٹھے۔اور صیون کو یاد کرکے روئے۔وہاں بید کے درختوں پر ہم نے اپنی ستاروں کو ٹانگ دیا۔کیونکہ وہاں ہم کو اسیر کرنے والوں نے گیت گانے کا حکم دیا۔اور تباہ کرنے والوں نے خوشی کرنے کا۔اور کہا صیون کے گیتوں میں سے ہم کو کوئی گیت سُناو۔ہم پردیس میں خُداوند کا گیت کیسے گائیں"(زبور ۱۳۷ :۱-۴)وہ غیر اقوام میں خُدا کا نام لینا خُدا کو ٹھٹھوں میں اُڑانے کے برابر سمجھتے تھے۔ ملکی ورسمی شرائع بہ نفسہ کمزور اور مختص بالقوم ولزمان تھیں۔اور اُن میں تمام دُنیا کا دستور العمل ہونے کی صلاحیت ہی مفقود تھی۔اور شرع اخلاقی قوم وزمان کی قیود سے آزاد تھی۔ چنانچہ وہ اب تک یہودی مسیحی اور کئی دیگر مہذب اقوام کا دستور العمل بنی ہوئی پہلی آتی ہے۔ عہدِ عتیق کے انبیاء خود توریت کی قربانیوں اور دیگر رسموں کو کمزور اور ناقص بتاتے گئے ہیں۔ مثلاً سموئیل نبی کہتا ہے کہ "کیا خُداوند سوختنی قربانیوں اور ذبیحوں سے اتنا ہی خوش ہوتا ہے جتنا اس بات سے کہ خُداوند کا حکم مانا جائے ؟ دیکھ فرمانبرداری قربانی سے اور بات ماننی مینڈھوں کی چربی سے بہتر ہے"(۱۔سموئیل ۱۵: ۲۲)داؤد نبی کا قول(زبور ۱۶:۵۱-۱۷)سلیمان نبی کا قول(امثال ۲۱: ۳)ہوسیع

نبی کا قول (ہوسیع ۶:۶) دانی ایل نبی کا قول (دانی ایل ۲۴:۹-۲۷) بنی اسرائیل میں قربانیاں چڑھاتے چڑھاتے یہ سُوعقیدت (خراب ایمان) پیدا ہو گیا کہ قربانی کی اصل رُوح اور غرض وغایت سے لاپرواہ ہو کر گناہ کرنے میں آزاد اور بے خوف ہو گئے۔ اور عمداً و قصداً گناہ کر کر کے قربانیوں اور دیگر رسُوم کو رواجی و رسمی طور پر انجام دینے لگے۔ اور اس بات کو بھول گئے کہ خُدا کی فرمانبرداری قربانی چڑھانے سے بہتر ہے۔ اُنہوں نے عمداً گناہ کر کر کے اُن کی تلافی کے لئے قربانیاں چڑھانا ایک دستور العمل ہی بنالیا۔ اور اس لئے خُدا نے انبیاء کے ذریعے اس دستور کو نامقبول ٹھہرا کے تنبیہہ وہدایت فرمائی۔ ''خُداوند فرماتا ہے لیکن میں اُس شخص پر نگاہ کروں گا۔ اُسی پر جو غریب اور شکستہ دل ہے۔ اور میرے کلام سے کانپ جاتا ہے۔ جو بیل ذبح کرتا ہے اُس کی مانند ہے جو کسی آدمی کو مار ڈالتا ہے اور جو برہ کی قربانی کرتا ہے اُس کے برابر ہے جو کتے کی گردن کاٹتا ہے۔ جو ہدیہ لاتا ہے گویا سور کا لہو گذرانتا ہے جو لُبان جلاتا ہے اُس کی مانند ہے جو بُت کو مبارک کہتا ہے۔ ہاں انہوں نے اپنی اپنی راہیں چن لیں اور اُن کے دل اُن کی نفرتی چیزوں سے مسرور ہیں'' (یسعیاہ ۲:۶۶-۳؛ ۱۱:۱-۱۴) یہودی لوگ سال میں تین مرتبہ عیدیں منانے کے لئے یروشلیم میں جایا کرتے تھے۔ اور ان تینوں عیدوں یعنی عید فسح۔ عید خیام اور عید پنتیکست کا تعلق ہیکل کے ساتھ تھا۔ اور ان عیدوں، قربانیوں اور دیگر تمام مذہبی رسوم کی ادائیگی کا مرکز ہیکل تھی۔ اُس کے علاوہ اور کسی جگہ ان فرائض کی انجام دہی ممنوع تھی۔ ''اور خبردار رہنا تا ایسا نہ ہو کہ جس جگہ کو دیکھ لو وہیں اپنی سوختنی قربانی چڑھاؤ بلکہ فقط اُسی جگہ جسے خُداوند تمہارے کسی قبیلہ میں چُن لے تُم اپنی سوختنی قربانیاں گذراننا اور وہیں سب کچھ جس کا میں تم کو حکم دیتا ہوں کرنا'' (استثنا ۱۳:۱۲-۱۴) اور ہیکل کا ایک خاص مقام یروشلیم ہی سے متعلق ہونا اس بات کا پختہ ثبوت ہے کہ اُس میں عالمگیر دینی مرکز ہونے کی قابلیت نہ تھی۔ کیونکہ بالفرض اگر تمام دُنیا توریت کی پیروی پر آمادہ ہوتی تو تمام دُنیا کا عیدوں، قربانیوں اور دیگر رسموں کی ادائیگی کے لئے یروشلیم میں سال میں تین مرتبہ حاضر ہونا محال ہوتا۔ اوّل تو اس قدر ہجوم کی وہاں گنجائش ہی نہ ہو سکتی تھی۔ اور جو وہاں نہ جاتا وہ خُدا کا نافرمان ٹھہرتا۔ اور پھر تین مرتبہ سال میں وہاں حاضر ہونا لازمی تھا۔ تو اس صورت میں ہزاروں کوس سے دور دراز ممالک کے باشندے وہاں کیسے پہنچ سکتے۔ اُن کا تو سال بھر آمد ورفت ہی میں ختم ہو جایا کرتا۔ اور پھر ذرائع آمد ورفت کی دشواریاں توریت کی توسیع اشاعت میں سدِراہ (حائل ہونا، روک بننا) تھیں۔ اور ہیکل کا تمام عالم کے لئے مرجع دینی ہونے سے اُمور معاشرت میں سخت نقصان ہو کر جسمانی زندگی معرض خطر میں پڑ جاتی۔ پھر آمد ورفت کے بھاری اخراجات ومصارف (مصرف کی جمع، اخراجات) سے محروم رہنے کے علاوہ خُدا کے مجرم ٹھہرتے۔ اور یہ ایک سخت ترین آسمانی سزا بنی نوع اِنسان کے لئے ہوتی۔ چنانچہ کعبہ اور تیرتھوں کا وجود اسلام اور ہندوازم کے مختص بالقوم وملک ہونے کی ایک بین اور مسکت دلیل ہے۔ ہم پیچھے خوب دِکھا چکے ہیں کہ مذہب الٰہی کس طرح انفرادیت سے قومیت میں منتقل ہوا۔ اب عقل خواہ مخواہ یہ سوال کرتی ہے کہ کیا خُدا صرف ایک خاندان یا ایک قوم ہی کا خُدا ہے؟ کیا وہ محض یہودی قوم ہی کو اپنے علم وعرفان سے مستفید فرما کر فقط اُسی سے اپنی عبادت واطاعت اور بندگی کا مطالبہ کرتا ہے؟ کیا خُدا صرف یہودیوں ہی کا ہے۔ غیر قوموں کا نہیں؟ بیشک غیر قوموں کا بھی ہے (رومیوں ۲۹:۳) وہ تمام دیدنی ونادیدنی عالم کا خالق ورازق ہے۔ ''اور اُس نے ایک ہی اصل سے آدمیوں کی ہر ایک قوم تمام رُوئے زمین پر رہنے کے لئے پیدا کی'' (اعمال ۲۶:۱۷)۔ ''تُو نے آسمان اور آسمانوں کے آسمان کو اور اُن کے سارے لشکر کو اور زمین کو اور جو کچھ اُس پر ہے۔ اور سمندروں کو اور جو کچھ اُن میں ہے بنایا اور تُو سبھوں کا پروردگار ہے اور آسمان کا لشکر تجھے سجدہ کرتا ہے'' (نحمیاہ ۶:۹) چنانچہ اسی بنا پر وہ تمام دُنیا سے استحقاق عبادت رکھتا ہے۔ اس لئے لازمی امر ہے کہ اُس کا مذہب انفرادی اور قومی نہ ہو بلکہ عالمگیر ہو۔

توریت میں ایک عالمگیر نئے عہد کی خبر

عہدِ عتیق کے حدِ رواج اور مختص بالقوم وزمان ہونے کا مفصل ذکرِ ہم نے اُوپر کر دیا ہے۔ صحائف عتیقہ اپنے حدِ رواج کی خبر کے علاوہ ایک اور عہد کی خبر بھی دئے گئے ہیں۔ تا کہ جب اُس کے رواج کا زمانہ اختتام کو پہنچے تو وہ عہد شروع ہو جائے۔ اور جس طرح پہلے پہل مذہب الٰہی انفرادیت کی صورت میں تھا اور پھر قومیت میں بدل گیا تو ضروری امر ہے کہ اس قومی مذہب کے بعد جو بھی مذہب ہو وہ تدریجی ترقی کی طرف گامزن ہو۔ اور بجائے قومی ہونے کے عالمگیر ہو۔ چنانچہ اُس آنے والے نئے عہد کے متعلق عہدِ عتیق یہ خبر دیتا ہے۔ "دیکھ وہ دن آتے ہیں خُداوند فرماتا ہے جب میں اسرائیل کے گھرانے اور یہوداہ کے گھرانے کے ساتھ نیا عہد باندھوں گا۔ اُس عہد کے مطابق نہیں جو میں نے اُن کے باپ دادا سے کیا۔۔۔۔۔۔۔ بلکہ یہ وہ عہد ہے جو میں اِن دنوں کے بعد اسرائیل کے گھرانے سے باندھوں گا۔۔۔۔۔" (یرمیاہ ۳۱: ۳۱-۳۴) خط عبرانی کا مصنف اپنے خط میں اسی مقام کو اقتباس کر کے آخر میں فرماتا ہے کہ جب اُس نے نیا عہد کیا تو پہلے کو پُرانا ٹھہرایا۔ اور جو چیز پُرانی اور مُدت کی ہو جاتی ہے وہ مٹنے کے قریب ہوتی ہے (عبرانیوں ۸: ۱۳) اور یہ عہد قومیت کی انقیادی (فرمان برداری) خصوصیت سے آزاد اور عالمگیر بیان کیا گیا ہے۔ جو یسعیاہ نبی نے خُدا سے بذریعہ الہام خبر پا کے اس طرح بیان کیا ہے۔ "اور بیگانے کی اُولاد بھی جنہوں نے آپ کو خُداوند سے پیوستہ کیا ہے کہ اُس کی خدمت کریں اور خُداوند کے نام کو عزیز رکھیں۔ اور اُس کے بندے ہوں وہ سب جو سبت کو حفظ کر کے اُسے ناپاک نہ کریں۔ اور میرے عہد پر قائم رہیں، میں اُن کو بھی اپنے کوہِ مقدس پر لاؤں گا۔ اور اپنی عبادت گاہ میں اُن کو شادمان کروں گا اور اُن کی سوختنی قربانیاں اور اُن کے ذبیحے میرے مذبح پر مقبول ہوں گے کیونکہ میرا گھر سب لوگوں کی عبادت گاہ کہلائے گا۔ خُداوند خُدا جو اسرائیل کے پراگندہ لوگوں کو جمع کرنے والا ہے یوں فرماتا ہے کہ میں اُن کے سوا جو اُسی کے ہو کر جمع ہوئے ہیں اَوروں کو بھی اُس کے پاس جمع کروں گا" (یسعیاہ ۵۶: ۶-۸)۔ "وہ وقت آتا ہے کہ میں تمام قوموں اور اہلِ لغت کو جمع کروں گا۔ اور وہ آئیں گے اور میرا جلال دیکھیں گے"۔۔۔۔۔۔۔ "اور خُداوند فرماتا ہے کہ میں اُن میں سے بھی کاہن اور لاوی ہونے کے لئے لوں گا"۔۔۔ "اور یوں ہو گا خُداوند فرماتا ہے کہ ایک نئے چاند سے دوسرے تک اور ایک سبت سے دوسرے تک ہر فردِ بشر عبادت کے لئے میرے حضور آئے گا" (یسعیاہ ۶۶: ۱۸، ۲۱، ۲۳) اور جس طرح عہدِ عتیق کا بانی اور ضامن موسیٰ تھا۔ اُسی طرح اُس نے عہد کے بانی وضامن کی خبر بھی توریت میں بالتصریح وتفصیل موجود ہے۔ ہم توریت ہی کے الفاظ میں اُس کو مفصل طور پر قلمبند کریں گے۔

نئے عہد کے بانی کے متعلق مفصل خبریں

قول المسیح۔ "تُم کتاب مقدس میں ڈھونڈتے ہو۔ کیونکہ سمجھتے ہو کہ اُس میں ہمیشہ کی زندگی تمہیں ملتی ہے۔ اور یہ وہ ہے جو میری گواہی دیتی ہے" (یوحنا ۵: ۳۹)۔

۱۔ وہ یہوداہ کے فرِقہ داؤد کے خاندان سے ہو گا۔ "دیکھ وہ دن آتے ہیں خُداوند فرماتا ہے کہ میں داؤد کے لئے ایک صادق شاخ پیدا کروں گا۔ اور اُس کی بادشاہی ملک میں اقبال مندی اور عدالت اور صداقت کے ساتھ ہو گی۔ اُس کے ایام میں یہوداہ نجات پائے گا اور

اسرائیل سلامتی سے سکونت کرے گا۔اور اُس کا نام یہ رکھا جائے گا خُداوند ہماری صداقت ہے"(یرمیاہ۵:۲۳-۶؛یسعیاہ۱:۱۱-۲؛زکریاہ۱:۱۳مطابق یوحنا۴۲:۷)۔

۲۔اُس کا ایک پیشرو ہو گا۔ "دیکھو میں اپنے رسول کو بھیجوں گا اور وہ میرے آگے راہ درست کرے گا"(ملاکی ۳:۱)۔"پکارنے والے کی آواز! بیابان میں خُداوند کی راہ درست کرو۔ صحرا میں ہمارے خُدا کے لئے شاہراہ ہموار کرو۔یوحنا بپتسمہ دینے والا"(یسعیاہ ۴۰:۳مطابق متی ۳:۱-۳)

۳۔وہ کنواری سے پیدا ہو گا۔ لیکن خُداوند آپ تُم کو ایک نشان بخشے گا۔دیکھو ایک کنواری حاملہ ہو گی اور بیٹا پیدا ہو گا۔اور وہ اُس کا نام عمانوایل رکھے گی"(یسعیاہ۷:۴مطابق متی ۱:۲۳)۔

۴۔شہر بیت الحم میں پیدا ہو گا۔ "لیکن اَے بَیت الحم افراتاہ اگرچہ تو یہوداہ کے ہزاروں میں شامل ہونے کے لئے چھوٹا ہے۔تو بھی تجھ میں سے ایک شخص نکلے گا۔اور میرے حضور اسرائیل کا بادشاہ ہو گا۔اور اُس کا مصدر زمانہ سابق ہاں قدیم الایام سے ہے"(میکاہ۵:۲مطابق متی ۲:الوقا ۲:۴)۔

۵۔اُس کو سجدہ کرنے کے لئے مجوسی آئیں گے۔ "وہ سب سبآ سے آئیں گے اور سونا لوبان لائیں گے اور خُداوند کی حمد کا اعلان کریں گے"(یسعیاہ۶۰:۶مطابق متی ۱:۲-۲)

۶۔ مصر میں پناہ پائے گا۔ "جب اسرائیل ابھی بچہ ہی تھا میں نے اُس سے محبت رکھی۔اور اپنے بیٹے کو مصر سے بلایا"(ہوسیع ۱:۱۱مطابق متی ۲:۱۳-۱۴)۔

۷۔ معصوم بچوں کا قتل۔ "رامہ میں ایک آواز سُنائی دی نوحہ اور زار زار رونا۔راخل اپنے بچوں کو رو رہی ہے۔وہ اپنے بچوں کی بابت تسلی پذیر نہیں ہوتی۔کیونکہ وہ نہیں ہیں"(یرمیاہ۳۱:۱۵مطابق متی ۲:۱۶-۱۸)۔

۸۔وہ رُوح القدس سے ممسوح ہو گا۔ "خُداوند خُدا کی رُوح مجھ پر ہے۔کیونکہ اُس نے مجھے مسح کیا۔تاکہ خوشخبری (انجیل) سُناوں"(یسعیاہ ۱:۶۱)"اور خُداوند کی رُوح اُس پر ٹھہرے گی۔حکمت اور خرد کی رُوح مصلحت اور قدرت کی رُوح معرفت اور خُداوند کے خوف کی رُوح"(یسعیاہ۲:۱۱؛مطابق متی ۳:۱۶)۔

۹۔ قومیں اُس سے برکت پائیں گی۔ "اور زمین کے سب قبیلے تیرے وسیلے سے برکت پائیں گے"(پیدائش ۱۲:۳مطابق اعمال ۳:۲۵-۲۶)۔

۱۰۔ گلیل میں اُس کا نام۔ ''لیکن اندوہگیں کی تیرگی جاتی رہے گی۔اُس نے قدیم زمانہ میں زبلون اور نفتالی کے علاقوں کو ذلیل کیا۔پر آخری زمانہ میں قوموں کی گلیل میں دریا کی سمت یردن کے پار بزرگی دے گا۔جو لوگ تاریکی میں چلتے تھے اُنہوں نے بڑی روشنی دیکھی۔جو موت کے سایہ کے ملک میں رہتے تھے اُن پر نور چمکا'' (یسعیاہ ۱:۹-۲؛مطابق متی ۴:۱۲-۱۷)۔

۱۱۔اُس کے معجزات۔ ''اُن کو جو کچ دلے ہیں کہو ہمت باندھو مت ڈرو۔۔۔۔اُس وقت اندھوں کی آنکھیں وا کی جائیں گی۔اور بہروں کے کان کھولے جائیں گے۔تب لنگڑے ہرن کی مانند چوکڑیاں بھریں گے۔اور گونگے کی زبان گائے گی'' (یسعیاہ ۴:۳۵-۶؛مطابق متی ۱۱:۴–۵؛اعمال ۲:۲۲)۔

۱۲۔گدھے پر سوار ہو کر یروشلیم میں داخل ہونا۔ ''اَے دُخترِ یروشلیم خوب للکار۔کیونکہ دیکھ تیرا بادشاہ تیرے پاس آتا ہے۔وہ صادق ہے اور نجات اُس کے ہاتھ میں ہے۔وہ حلیم ہے اور گدھے پر بلکہ جوان گدھے پر سوا ہے'' (زکریاہ ۹:۹؛مطابق متی ۵:۲۱-۷)۔

۱۳۔یہود و غیر اقوام اُسے رد کریں گے۔ ''قومیں کس لئے جوش میں ہیں اور لوگ کیوں باطل خیال باندھتے ہیں۔خُداوند اور اُس کے مسیح کے خلاف زمین کے بادشاہ صف آرائی کر کے اور حاکم آپس میں مشورہ کر کے کہتے ہیں۔۔'' (زبور ۲:۱-۲؛اعمال ۴:۲۵-۲۸)۔

۱۴۔اپنے ایک شاگرد کے ہاتھوں گرفتار ہو گا۔ ''بلکہ میرے دلی دوست نے جس پر مجھے بھروسہ تھا اور جو میری روٹی کھاتا تھا مجھ پر لات اُٹھائی'' (زبور ۴۱:۹؛۵۵:۱۲؛مطابق یوحنا ۱۳:۱۸،۲۶–۲۷)۔

۱۵۔ تیس روپے میں بیچا جائے گا۔ ''اور اُنہوں نے میری مزدوری کے لئے تیس روپے تول کر دئے۔اور خُداوند نے مجھے کہا کہ اُسے کمہار کے سامنے پھینک دے۔یعنی اُس بڑی قیمت کو جو انہوں نے میرے لئے ٹھہرائی۔اور میں نے یہ تیس روپے لے کر خُداوند کے گھر میں کمہار کے سامنے پھینک دئے'' (زکریاہ ۱۱:۱۲-۱۳؛مطابق متی ۲۶:۱۴؛۲۷:۳-۱۰)۔

۱۶۔ شاگرد اُس سے بیوفائی کریں گے۔ ''رب الافواج فرماتا ہے اَے تلوار تُو میرے چرواہے یعنی اِنسان پر جو میرا رفیق ہے بیدار ہو۔چرواہے کو مار کہ گلہ پراگندہ ہو جائے'' (زکریاہ ۱۳:۷؛مطابق متی ۲۶:۳۱،۵۶)۔

۱۷۔ جھوٹے گواہوں کی شہادت۔ ''جھوٹے گواہ اُٹھتے ہیں اور جو باتیں میں نہیں جانتا وہ مجھ سے پوچھتے ہیں۔وہ مجھ سے نیکی کے بدلے بدی کرتے ہیں'' (زبور ۳۵:۱۱۔۱۲؛۲۷:۱۲؛مطابق مرقس ۱۴:۵۵–۵۸)۔

۱۸۔اُس کے منہ پر طمانچے ماریں گے۔ ''ہمارا محاصرہ کیا جاتا ہے۔وہ اسرائیل کے حاکم کے گال پر چھڑی سے مارتے ہیں'' (میکاہ۵:۱؛مطابق متی ۲۷:۳۰؛مرقس ۱۵:۱۹)۔

۱۹۔اُس کے منہ پر تُھوکیں گے اور ٹھٹھّے ماریں گے۔ ''میں نے اپنی پیٹھ پیٹنے والوں کے اور اپنی داڑھی نوچنے والوں کے حوالے کی۔میں نے اپنا مُنہ رسوائی اور تھوک سے نہیں چھپایا''(یسعیاہ۵۰:۶؛مطابق مرقس ۱۵:۱۹-۲۰)۔

۲۰۔وہ تمام اذّیتوں کو خاموشی سے سہے گا۔ ''وہ ستایا گیا تو بھی اُس نے برداشت کی اور مُنہ نہ کھولا۔جس طرح برّہ جسے ذبح کرنے کو لے جاتے ہیں۔اور جس طرح بھیڑ بال کترنے والوں کے سامنے بے زبان ہے اُسی طرح وہ خاموش رہا''(یسعیاہ۵۳:۷؛مطابق متی ۲۷:۱۲-۱۴)۔

۲۱۔اُس کی صلیبی حالت۔ ''میں پانی کی طرح بہ گیا۔میری سب ہڈیاں اُکھڑ گئیں۔میرا دل موم کی مانند ہو گیا۔وہ میرے سینہ میں پگھل گیا۔میری قوت ٹھیکرے کی مانند خشک ہو گی۔اور میری زبان میرے تالو سے چپک گئی۔اور تونے مجھے موت کی خاک میں ملا دیا۔کیونکہ کتّوں نے مجھے گھیر لیا ہے۔بدکاروں کا گروہ مجھے گھیرے ہوئے ہے۔وہ میرے ہاتھ اور میرے پاؤں چھیدتے ہیں۔میں اپنی سب ہڈیاں گن سکتا ہوں وہ مجھے تاکتے اور گھورتے ہیں''(زبور ۲۲:۱۴-۱۷؛مطابق متی ۲۷:۲۷-۴۴)۔

۲۲۔اُس کی پوشاک پر قرعہ اندازی۔ ''وہ میرے کپڑے آپس میں بانٹتے ہیں اور اور میری پوشاک پر قرعہ ڈالتے ہیں''(زبور ۲۲:۱۸؛مطابق متی ۲۷:۳۵)۔

۲۳۔پِت اور سرکہ پلانا۔ ''اُنہوں نے مجھے کھانے کو پِت دیا۔اور میری پیاس بجھانے کو اُنہوں نے مجھے سرکا پلایا''(زبور ۲۱:۲۹؛مطابق متی ۲۷:۳۴؛یوحنا ۲۸:۱۹--۳۰)۔

۲۴۔وہ چھیدا جائے گا۔ ''وہ میرے ہاتھ اور میرے پاوں چھیدتے ہیں''(زبور ۲۲:۱۶)''اور وہ اُس پر جس کو اُنہوں نے چھیدا ہے نظر کریں گے''(زکریاہ ۱۰:۱۲؛مطابق یوحنا ۱۹:۳۴،۳۷)۔

۲۵۔اُس کی ہڈی توڑی نہ جائے گی۔ ''وہ اُس کی سب ہڈیوں کو محفوظ رکھتا ہے۔اُن میں سے ایک بھی توڑی نہیں جاتی''(زبور ۳۴:۲۰؛مطابق یوحنا ۱۹:۳۲۔۳۶)۔

۲۶۔ برضا ور غبت وفات پائے گا۔ ''قربانی اور نذر کو تو پسند نہیں کرتا۔ تو نے میرے کان کھول دئے ہیں۔۔۔۔ کتاب کے طومار میں میری بابت لکھا ہے۔ اَے میرے خُدا میری خوشی تیری مرضی پوری کرنے میں ہے'' (زبور ۴۰: ۶-۸؛ مطابق یوحنا ۱۰: ۱۷-۱۸)۔

۲۷۔ ہمارے گناہوں کے بدلے مرے گا۔ ''یقیناً اُس نے ہماری مشقتیں اُٹھا لیں۔ اور ہمارے غموں کو برداشت کیا پر ہم نے اُسے خُدا کا مارا کوٹا اور ستایا ہوا سمجھا۔ حالانکہ وہ ہماری خطاؤں کے سبب سے گھائل کیا گیا۔ اور ہماری بدکرداری کے باعث کچلا گیا۔ ہماری ہی سلامتی کے لئے اُس پر سیاست ہوئی۔ تاکہ اُس کے مار کھانے سے ہم شفا پائیں۔۔۔۔ خُداوند نے ہم سب کی بدکاری اُس پر لادی'' (یسعیاہ ۴: ۵۳-۶؛ دانی ایل ۹: ۲۶؛ مطابق مرقس ۱۰: ۴۵؛ اعمال ۸: ۳۰-۳۵؛ ۱۔ پطرس ۲: ۲۴)۔

۲۸۔ تیسرے روز قبر سے زندہ ہو گا۔ ''وہ دو روز کے بعد ہم کو حیات تازہ بخشے گا اور تیسرے روز اُٹھا کھڑا کرے گا۔ اور ہم اُس کے حضور زندگی بسر کریں گے'' (ہوسیع ۶: ۲) ''اسی سبب سے میرا دل خُوش اور میری رُوح شادمان ہے۔ میرا جسم بھی امن وامان میں رہے گا۔ کیونکہ تو نہ میری جان کو پاتال میں رہنے دے گا نہ اپنے مقدس کو سڑنے دے گا۔ تو مجھے زندگی کی راہ دکھائے گا'' (زبور ۱۶: ۹-۱۱؛ مطابق اعمال ۲: ۳۱-۳۲؛ ۲: ۲۴-۲۸؛ لوقا ۲۴: ۵-۷)۔

۲۹۔ تُوما کو اپنے زخم دکھانا۔ ''اور جب کوئی اُسے پوچھے گا کہ تیری چھاتی پر یہ زخم کیسے ہیں تو وہ جواب دے گا۔ یہ وہ زخم ہیں جو میرے دوستوں کے گھر میں لگے'' (زکریاہ ۱۳: ۲؛ مطابق یوحنا ۲۰: ۲۴-۲۵، ۲۷)۔

۳۰۔ زندہ ہو کر آسمان پر صعود فرمائے گا۔ ''تُو نے عالمِ بالا کو صعود فرمایا تو قیدیوں کو ساتھ لے گیا'' (زبور ۶۸: ۱۸) ''یہواہ نے میرے خُداوند سے کہا تو میرے داہنے ہاتھ بیٹھ جب تک کہ میں تیرے دشمنوں کو تیرے پاؤں کی چوکی نہ کر دوں'' (زبور ۱۱۰: ۱؛ مطابق لوقا ۲۴: ۵۱؛ اعمال ۱: ۹؛ ۲: ۳۴-۳۵)۔

۳۱۔ دوبارہ آئے گا اور تاابد سلطنت کرے گا۔ ''خُداوند میرا خُدا آئے گا۔ اور سب قُدسی اُس کے ساتھ'' (زکریاہ ۵: ۱۴؛ مطابق ۲۔ تھسلنیکیوں ۱: ۷؛ متی ۱۶: ۲۷)۔ ''ایک شخص آدم زاد کی مانند آسمان کے بادلوں کے ساتھ آیا اور قدیم الایام تک پہنچا۔ وہ اُسے اُس کے حضور لائے۔ اور سلطنت اور حشمت اور مملکت اُسے دی گئی۔ تاکہ سب لوگ اور اُمتیں اور اہل لغت اُس کی خدمت گزاری کریں۔ اُس کی سلطنت ابدی سلطنت ہے جو جاتی نہ رہے گی اور اُس کی مملکت لازوال ہو گی'' (دانی ۷: ۱۳-۱۴؛ مطابق متی ۲۸: ۱۸؛ یوحنا ۵: ۲۲-۲۳؛ فلپی ۲: ۹-۱۱؛ ۲۔ پطرس ۱: ۱۱)۔

''اس لئے ہمارے لئے ایک لڑکا تولد ہوا اور ہم کو ایک بیٹا بخشا گیا۔ اور سلطنت اُس کے کاندھے پر ہو گی۔ اور اُس کا نام عجیب مشیر۔ خُدائے قادر ابدیت کا باپ۔ سلامتی کا شہزادہ ہو گا۔ اُس کی سلطنت کے اقبال اور سلامتی کی کچھ انتہا نہ ہو گی۔ وہ داؤد کے تخت اور اُس کی مملکت پر آج سے ابد تک حکمران رہے گا۔ اور عدالت اور صداقت سے اُسے قیام بخشے گا۔ رب الافواج کی غیوری یہ کرے گی'' (یسعیاہ ۹: ۶؛ مطابق لوقا ۱: ۳۱-۳۳)۔

عہدِ عتیق اور عہدِ جدید کے بانیوں کی باہمی مشابہت

قول المسیح۔ ”ضرور ہے کہ جتنی باتیں موسیٰ کی توریت اور نبیوں کے صحیفوں اور زبور میں میری بابت لکھی ہیں پوری ہوں“ (لوقا ۲۴: ۴۴)۔

ہم اُوپر عہدِ جدید کے ہونے والے بانی کی تمام زندگی کی مکمل تصویر نبیوں کے صحیفوں اور زبور کی پیشین گوئیوں میں دکھا چکے ہیں۔ اب صرف توریت کی شہادت باقی ہے جو ہم ابھی پیش کرنے والے ہیں۔ تمام الہامی انبیاء اپنے صحائف منزلہ الٰہیہ میں بانی عہدِ جدید کی تصویر کے جُدا جُدا پہلو ظاہر کرتے ہیں۔ اگر ناظرین مندرجہ بالا اِکتیس (۳۱) پیشین گوئیوں میں کھینچی ہوئی تصویر کو بانی عہدِ جدید کی تصویر کے ساتھ جو انجیل مقدّس (عہد جدید) میں موجود ہے ملا دیکھیں تو دونوں میں سرِ مو (ذراسا) فرق نہ پائیں گے۔ وہ تصویر جو موسیٰ اور مابعد کے متعدد انبیاء نے اُس موعود کی کھینچی ہے اُس کے تمام خط وخال خُداوند مسیح کے ساتھ پورے پورے طور پر ملتے ہیں۔ تمام اخبار عتیق واذکار (ذکر کی جمع) سابقہ کا کھوج سوائے سرورِ کائنات وسرچشمہ حسنات جناب فضیلت مآب خُداوند مسیح کی عدیم النظیر اور فقید المثال (جس کی مثال نہ ہو) ہستی کے کسی بھی دوسری ہستی اصلاً نہ ملے گا۔ ہم اپنے اس دعویٰ کی صداقت اور حقیقت کو عہدِ عتیق کے بانی موسیٰ نبی کی زبانی اور بھی زیادہ صفائی سے پایہ ثبوت کو پہنچائیں گے۔ موسیٰ توریت کی پانچویں کتاب میں یوں فرماتا ہے۔ ”اور خُداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں سوٹھیک کہتے ہیں۔ میں اُن کے لئے اُن ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا۔ اور اپنا کلام اُس کے منہ میں ڈالوں گا۔ اور جو کچھ میں اُسے حکم دوں گا وہی وہ اُن سے کہے گا۔ اور جو کوئی میری اُن باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سُنے تو میں اُن کا حساب اُس سے لوں گا“ (استثنا ۱۸: ۱۷-۱۹)۔ اس کے ساتھ مسیح کا قول بھی ملاحظہ ہو۔ ”کیونکہ اگر تم موسیٰ کا یقین کرتے تو میرا بھی یقین کرتے۔ اس لئے کہ اُس نے میرے حق میں لکھا ہے“ (یوحنا ۵: ۴۶)۔ خُداوند نے موسیٰ سے کہا کہ اُن ہی کے بھائیوں میں ”تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا“۔ یہاں موسیٰ اُس ہونے والے نبی کو اپنی مانند کہتا ہے۔ تو اب یہ دیکھنا مناسب ہے کہ موسیٰ اور مسیح میں کن کن باتوں میں مشابہت پائی جاتی ہے۔ اور اگر ان دونوں میں خاص خاص صفات مشترک نہ ہوں تو مشابہت قائم نہیں رہ سکتی۔ اور نہ ہی ہم مسیح پر اس پیش گوئی کو چسپاں کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ لیکن اگر مشابہت ثابت ہو جائے تو پھر خُداوند مسیح ہی اس خبر کے مفہوم کا مصداق ہوگا نہ کوئی اور مندرجہ ذیل امور متقابلہ پر غور کیجئے۔

۱۔ موسیٰ کی پیدائش کے وقت اسرائیلوں کے لڑکے شاہ فرعون کے حکم سے مروائے جاتے تھے (خروج ۱: ۱۵-۱۶، ۲۲)۔	۱۔ مسیح کی پیدائش کے وقت شاہ ہرودیس کے حکم سے لڑکے قتل کروائے گئے (متی ۲: ۱۶)۔
۲۔ موسیٰ کی بچپن میں خُدا نے عجیب حکمت سے بادشاہ کے دستِ ستم سے بچایا (خروج ۵: ۲-۱۰)۔	۲۔ مسیح کو بچپن میں خُدا نے فرشتے کے ذریعے آگاہی دے کر عجیب طور پر شاہ ہرودیس کے دستِ ستم سے بچایا۔ اور لطف یہ کہ موسیٰ نے بھی مصر میں پناہ پائی اور مسیح نے بھی مصر ہی میں پناہ پائی (متی ۲: ۱۳-۱۵)۔
۳۔ موسیٰ بارہ قبیلوں کا ہادی تھا۔	۳۔ مسیح کے شاگرد بھی بارہ تھے۔ بعد ازاں وہ تمام دُنیا کا ہادی ٹھہرا۔

۴۔موسیٰ کا پہلا معجزہ یہ تھا کہ اُس نے پانی کو خون بنا دیا (خروج ۷: ۱۹-۲۰)۔	۴۔ مسیح کا پہلا معجزہ یہ تھا کہ اُس نے پانی کو مے بنایا (یوحنا ۷: ۲-۹)
۵۔ موسیٰ نے معجزانہ طور پر بحرِ قلزم کے دو حصے کر دئے۔ اور بنی اسرائیل سلامتی سے اُس میں سے گذر گئے اور دریا سے کسی جان کا بھی نقصان نہ ہوا (خروج ۱۴: ۲۱-۲۲)۔ ۶۔ موسیٰ نے حورب کی چٹان سے پانی نکالا اور قوم کی پیاس بجھا کر اُنہیں مرنے سے بچایا (خروج ۱۷: ۳-۶)۔	۵۔ مسیح نے اعجازی قوت سے جھیل کے طوفان کو روکا اور اپنے شاگردوں کی جانیں ہلاکت سے بچائیں (لوقا ۸: ۲۲-۲۵)۔ ۶۔خُداوند مسیح نے فرمایا زندگی کا پانی میں ہوں۔ جو کوئی مجھ سے پیتا ہے وہ کبھی پیاسا نہ ہوگا (یوحنا ۴: ۱۴)۔ اور پولُس رسول حورب کی چٹان کو جس سے موسیٰ نے پانی نکالا خُداوند مسیح سے ملاتا ہے (۱۔کرنتھیوں ۱۰: ۶)۔
۷۔موسیٰ نے قوم اسرائیل کو مَن کھلایا جو معجزانہ طور پر آسمان سے نازل ہوتا تھا (خروج ۱۶: ۱۴-۱۵)۔	۷۔ مسیح نے ایک دفعہ پانچ ہزار کی بھیڑ اور دوسری دفعہ چار ہزار کی بھیڑ کو معجزانہ طور پر صرف چند روٹیوں سے آسودہ کیا اور بہت روٹی بچ بھی رہی (متی ۱۴: ۱۵—۲۱، ۱۵۔ ۳۲-۳۸) اور پھر فرمایا تمہارے باپ دادو ں نے بیابان میں مَن کھایا اور مر گئے۔ میں ہوں وہ زندگی کی روٹی جو آسمان سے اُتری۔ اگر کوئی اس روٹی میں سے کھائے تو ابد تک زندہ رہے گا (یوحنا ۶: ۴۹-۵۱)۔
۸۔موسیٰ نے اسرائیلوں کو شاہِ مصر کی غلامی سے چھڑایا۔	۸۔ مسیح نے ابلیس، گناہ اور موت کی غلامی سے ایمانداروں کو آزاد کیا (یوحنا ۸: ۳۴-۳۶، عبرانیوں ۲: ۱۵)۔
۹۔ موسیٰ نے اپنے مِن جانب خُدا نبی ہونے کو معجزات سے ثابت کیا (استثنا ۳۴: ۱۰—۱۲)۔	۹۔ مسیح نے فرستادہ (بھیجا ہوا، قاصد) خُدا ہونے کے ثبوت میں معجزات پیش کئے (یوحنا ۵: ۳۶، اعمال ۲: ۲۲)۔
۱۰۔موسیٰ چالیس روز تک بغیر کھائے پیئے خُدا کے حضور میں رہا (خروج ۳۴: ۲۸)۔	۱۰۔ مسیح چالیس روز تک بلا خورد و نوش جنگل میں خُدا کی قربت میں رہا (متی ۴: ۱-۲)۔

۱۱۔ موسیٰ کا چہرہ خُدا کے جلال کی تجلی سے چمکنے لگا۔ اور اُس کی صورت تبدیل ہو گئی۔ یہاں تک کہ لوگ اُس سے ڈرنے لگے (خروج ۳۴: ۲۹-۳۵؛ ۲۔ کرنتھیوں ۳: ۸)۔	۱۱۔ مسیح کی صورت کوہِ حرمون پر تبدیل ہو گئی اور سورج کی مانند چمکنے لگی۔ اور اُس کے شاگرد نہایت خوفزدہ ہوئے اور لطف یہ کہ موسیٰ بھی اُس وقت ایلیاہ کی ہمراہی میں مسیح کے ساتھ پایا گیا (متی ۱۷: ۲-۸، مرقس ۹: ۲-۸ لوقا ۹: ۲۸—۳۶)۔ موسیٰ کی صورت کوہِ سینا پر نورانی ہو گئی۔ موسیٰ کی صورت کوہِ سینا پر تبدیل ہوئی اور مسیح کی صورت کوہِ حرمون پر نورانی ہو گئی۔ دونوں نظارے پہاڑی ہیں۔
۱۲۔ پرانا عہد موسیٰ کے ذریعے خون سے باندھا گیا (خروج ۸: ۲۴؛ عبرانیوں ۹: ۱۸۔ ۲۰)۔	۱۲۔ نیا عہد مسیح کے خون سے باندھا گیا (لوقا ۲۰: ۲۲؛ ۱۔ کرنتھیوں ۱۱: ۲۵؛ عبرانیوں ۹: ۱۱—۲۲)۔
۱۳۔ شریعت تو موسیٰ کے ذریعے دی گئی (یوحنا ۱: ۱۷)۔	۱۳۔ مگر فضل اور سچائی یسوع مسیح کی معرفت پہنچی (یوحنا ۱: ۱۷)۔
۱۴۔ موسیٰ نے آخری وقت یشوع پر ہاتھ رکھ کر اُسے مخصوص کیا۔ اور اپنی جگہ اُسے قوم کا ہادی بنا کر وصیت کی (گنتی ۲۷: ۱۵-۲۳، استثنا ۳۴-۹)۔	۱۴۔ مسیح نے آخری وقت اپنے شاگردوں کو برکت دی۔ اور رُوح القدس سے مَسح کر کے اپنی جگہ قائم مقام بنا کر وصیت کی (متی ۲۸: ۱۸-۲۰، یوحنا ۲۰: ۲۱-۲۳)۔
۱۵۔ موسیٰ کی قبر عدیم البتہ ہے۔ کوئی اُس کی بابت نہیں جانتا (استثنا ۳۴: ۶، خط یہوداہ ۹ آیت)۔	۱۵۔ خُداوند مسیح کی قبر بھی معدوم (ناپید) ہے۔ اگر ہے تو خالی ہے۔ مسیح زندہ ہو گیا (متی ۲۸: ۵-۷، لوقا ۲۴: ۳-۷، ۱۔ کرنتھیوں ۱۵: ۲۰، اعمال ۲: ۳۴)۔

اُوپر ہم نے پندرہ اُمور میں موسیٰ اور خُداوند مسیح کی مشابہت دکھائی ہے جس سے بتمام و کمال طور سے ثابت ہوتا ہے کہ موسیٰ کی وہ خبر جو اُس نے اپنی مانند ایک نبی کے برپا ہونے کے متعلق دی تھی وہ بجز خُداوند مسیح کے اور کسی نبی یا رسول پر ہر گز ہر گز صادق نہیں آسکتی۔ اور پھر یشوع کے زمانے تک کسی ایسے نبی کی بعثت (پیغمبر کا بھیجا جانا) کا اشارہ تک نہیں ہے۔ بلکہ برعکس اس کے یوں لکھا ہے۔ "اور اُس وقت سے اب تک بنی اسرائیل میں کوئی نبی موسیٰ کی مانند" جس سے خُداوند نے روبرو باتیں کیں نہیں اُٹھا (استثنا ۳۴: ۱۰)۔ اور اُس کے بعد بھی کسی نبی نے نہ تو بالصراحت (تشریح) اور نہ بالاِشارت اُس موعود نبی کے آچکنے کا کہیں ذکر کیا۔ اس لئے عہدِ عتیق کے سب سے آخری نبی نے بھی موسوی شریعت ہی کی طرف قوم کی توجہ کی رہنمائی کی۔ **اگر وہ موعود نبی اُس کے زمانہ تک آچکا ہوتا تو وہ قوم کی اُس کی طرف توجہ دلاتا نہ کہ موسیٰ کی طرف۔ لیکن وہ شرع موسوی ہی کی یاددہانی کرواتا** ہے۔ "تُم میرے بندے موسیٰ کی شریعت یعنی اُن فرائض واحکام کو جو میں نے حورِب پر تمام بنی اسرائیل کے لئے فرمائے یاد رکھو" (ملاکی ۴: ۴)۔ پس

ثابت ہوا کہ توریت کے سب سے آخری نبی یعنی ملاکی کے زمانہ تک بھی وہ نبی ظاہر نہ ہوا تھا۔اس لئے اُس نبی کی کھوج ہمیں ملاکی نبی کے بعد کے زمانہ میں کرنی پڑے گی دریں حال یہ کہ ملاکی نبی نے بھی اُس موعودہ نبی اور اُس کے پیشرو (یوحنا اصطباغی) کے ظہور آیندہ کی صریح خبر بدیں(اس سے)الفاظ دی۔ ''دیکھو میں اپنے رسول کو بھیجوں گا۔اور میرے آگے راہ درست کرے گا۔اور خُداوند جس کے تم طالب ہو ناگہاں اپنی ہیکل میں آموجود ہو گا۔ہاں عہد کا رسول جس کے تم منتظر ہو آئے گا۔رب الافواج فرماتا ہے''(ملاکی ۱:۳؛ مطابق مرقس ۲:۱،لوقا ۷:۲۷،یوحنا ۲:۱۳-۱۷)۔چنانچہ ملاکی نبی کے بعد کے زمانہ میں خُداوند یسوع مسیح کا ظہور ہوا۔اور وہ عدیم اُلمثیم شخصیت اور فقید المثل (جس کی کوئی مثال) ہستی تمام انبیاء کی پیش خبریوں کو پورا کرنے اور قوم کے طویل انتظار کا جواب دینے کے لئے زینت افزائے کاشانہ گیتی (دُنیا ایک چھوٹا سا گھر ہے) ہوئی۔پُرانے عہد کے موعود نبی و بادشاہ اور نئے عہد کے خُداوند مسیح کی فوٹو میں سرِ مو (ذرہ) فرق نہیں۔وہ دونوں ایک ہی ہیں۔ایک خواب ہے تو دوسرا اُس کی تعبیر ہے۔اگر عہدِ عتیق انتظار کی دراز تیرہ شب ہے تو عہدِ جدید اُس انتظار کا جواب اور حصولِ مقصود کا روزِ روشن ہے۔اور خُداوند مسیح نے بارہا اخبار انبیاء سابقہ کو خود اپنی ذات پر چسپاں کیا۔ملاحظہ ہو (لوقا ۴۴:۲۴؛ ۱۷:۴-۲۱؛ متی ۴۲:۲۲-۴۶؛ یوحنا ۳۹:۵)۔پس ثابت ہوا کہ توریت میں جو ایک عالمگیر نئے عہد کی خبر پائی جاتی ہے وہ عہدِ مسیحیت ہے۔اور جس بانی عہدِ جدید کی خبریں عہدِ عتیق نے دی ہیں۔وہ بانی خُداوند یسوع مسیح ہے جس نے اس عالم آب و گل کو اپنے مبارک قدموں کی برکت سے سرفراز فرمایا۔

الہام ومذہب الٰہی کی تدریجی کمالیت

اگر صحیفہِ فطرت پر ایک غائر(گہرا، وسیع)اور تحقیقی نظر ڈالی جائے تو ایک قانون نظر آتا ہے۔ جو تمام موجودات عالم میں مشترک طور پر جاری وساری ہے۔ وہ قانون ہے تدریجی ارتقاء(آہستہ آہستہ بڑھنا)ہر شئے ادنیٰ سے اعلیٰ اور ناقص سے کامل کی طرف ترقی کرتی ہوئی صاف نظر آتی ہے۔ یعنی یہ نہیں کہ رات کو جامن کا بیج بویا جائے اور صبح کو وپچاس فُٹ اُونچا درخت ہو کر پھل دینے لگے۔ بلکہ رفتہ رفتہ درجہ بدرجہ ایک مخصوص وقت پر کمال کو پہنچتا ہے۔ ہر شئے کی پیدائش، وسطی اور انتہائی حالت اس حقیقت کی تائید وتصدیق کرتی ہے۔ جب کہ جسمانی ومادی عالم میں تدریجی ارتقاء کا قانون خالق نے موضوع کر دیا ہے۔ تو لازمی امر ہے کہ اخلاقی وروحانی امور میں بھی ایسا ہی ہو۔ کیونکہ صحیفہِ فطرت اور صحیفہِ الہام دونوں کا مُصنف خُدا تعالیٰ ہے۔ کائنات جس خُدا کا فعل ہے الہام اُسی کا قول ہے۔ لہٰذا دونوں میں مطابقت ومناسبت کا ہونا ضروری ہے۔ عقلی وعلمی ارتقاء میں بھی تدریجی ترقی وکمالیت کا اٹل قانون جاری وساری نظر آتا ہے۔ طالب علم جُوں جُوں عقلی منازل کو طے کرتا جاتا ہے ہر مرحلہ پر اُس کے حسب لیاقت کُتب درسی پڑھائی جاتی ہیں۔ یہ نہیں کہ پہلے ہی روز بچے کے ہاتھ میں گلستان بوستان دے دی جائیں۔ یہی حال نزول الہام الٰہی کا ہے۔ خُدا اہلِ دُنیا کی حالت اساسی وسطی اور انتہائی کے تناسب سے اپنے مکاشفے والہام نازل فرماتا ہے۔ اُس نے اپنا الہام ومکاشفہ انفرادیت سے شروع کیا۔ اور خاص اشخاص کو چند سادہ احکام وقوانین دے کر اُن سے اُن کی تعمیل طلب کی۔ پھر اُس نے ایک خاص قوم کو چُن لیا اور اپنے احکام وقوانین زیادہ تعداد میں موسیٰ کی معرفت اُن پر نازل کئے۔ اور اُن کی تعمیل وتقلید کی تاکید زمانہ بہ زمانہ طرح بہ طرح انبیاء کی معرفت فرماتا رہا۔ وہ الہام صرف قوم اسرائیل ہی سے متعلق تھا اور مذہب الٰہی قومی مذہب تھا۔ اور ضروری تھا کہ مذہب الٰہی انقیادی(فرمان برداری)خصوصیت سے نکل کر عمومیت میں تبدیل ہو جائے۔ اور ایسا ہی ہوا جیسا ہم پیشتر بالتفصیل دکھا چکے ہیں۔ چونکہ خصوصیت عمومیت کی ایک فرد ہے۔ لہٰذا خُدا نے اپنا الہام ومکاشفہ ابتدائی خاص سے شروع کر کے عام تک پہنچایا۔ پہلے اُس نے خاص افراد کو چُنا۔ پھر اُس نے ایک خاص قوم کو چُن لیا۔ جس طرح خُداوند مسیح نے بھی پہلے بارہ شاگردوں کو چن لیا اور اُنہیں فرمایا"میں نے تمہیں چن لیا اور تُم کو مقرر کیا کہ جا کر پھل لاؤ"(ا۔یوحنا ۱۶:۱۵)اور اس عالمگیر مذہب کے بانی نے اپنی خدمت کو اُسی جگہ سے شروع کیا جہاں انبیاء عہدِ عتیق نے اپنے کام کو چھوڑا تھا۔ یعنی یہودی قوم سے شروع کر کے تمام اقوام عالم تک اور یروشلیم سے شروع کر کے تمام دُنیا کی حدود تک اپنی خدمت کو وسعت دی(لوقا ۲۴:۴۷)مرکز سے شروع کر کے محیط کی طرف بڑھنا مسیح کا مقصد تھا۔ اسی لئے آپ نے ایک جگہ فرمایا"میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا"(متی ۲۴:۱۵)۔ یہ ہی تھا مرکز سے شروع کرنا، یروشلیم سے شروع کرنا۔ لیکن بعد میں آپ نے فرمایا" میری اور بھی بھیڑیں ہیں جو اس بھیڑ خانے(قوم اسرائیل)کی نہیں۔ مجھے اُن کو بھی لانا ضرور ہے اور وہ میری آواز سُنیں گی۔ پھر ایک ہی گلہ اور ایک ہی چرواہا ہو گا"۔ یہی تھا محیط تک پہنچنا۔ زمین کی انتہا تک گواہ ہونا(یوحنا ۱۶:۱۰؛ اعمال ۱:۸)دُنیا کی ہر شئے مرکز سے محیط کی طرف بڑھتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اور خُداوند مسیح نے بھی اس مقررہ قانون کے مطابق اپنے کام کو مرکز سے آغاز کر کے دائرہ کی طرف بتدریج بڑھایا۔ اور قومی مذہب کو بتدریج عالمگیر مذہب میں منتقل فرمایا۔ اور الہام الٰہی کی تدریجی کمالیت کے متعلق خط عبرانی کا مصنف یوں فرماتا ہے۔" اگلے زمانے میں خُدا نے باپ دادوں سے حصہ بہ حصہ اور طرح بہ طرح نبیوں کی معرفت کلام کر کے اس زمانے کے آخر میں ہم سے بیٹے کی معرفت کلام کیا"(عبرانیوں ۱:۲)۔

(۶)

عالمگیر مذہب

عالمگیر مذہب وہ ہوسکتا ہے جو جغرافیائی حدود و قیود سے آزاد ہو۔ تمام نسلوں اور قوموں کی رُوحانی اور اخلاقی زندگی پر یکساں طور پر اثرانداز ہو اور جس میں مِن کل الوجوہ تمام عالم کے دستور العمل ہونے کی کامل صلاحیت و قابلیت موجود ہو۔اور بنی نوع اِنسان کی اخلاقی ضروریات اور رُوحانی جذبات کی تسکین وآسودگی کا ضامن ہو۔اور کامل تحقیق کے بعد فردِواحد بھی یہ کہنے کی جرات نہ کرسکے کہ اس مذہب میں میری رُوحانی حوائج (حاجت کی جمع) وضرورت کا جواب نہیں ہے۔ ہم مسیحی مذہب کو اس معنیٰ کا عالمگیر مذہب ادلہ یقینیہ (ایسی دلیلیں جن سے یقین لازمی آئے گا) وبراہین شافعیہ (ایسی دلیل جس سے شفاعت کا عنصر عیاں ہو) قطعیہ (وہ امور جن پر شک وشبہ نہ ہو) سے ثابت کریں گے۔ ذرا انصاف پروری اور صدق دلی سے تمام دلائل پر غور فرمایئے۔

عہدِ جدید کی بنیاد عہدِ عتیق پر

عہدِ جدید کی بنیاد عہدِ عتیق پر رکھی گئی ہے۔اور نئے عہد کے بانی نے پُرانے عہد کے سلسلے کو توڑا نہیں۔ بلکہ اُسی کی بنیاد پر ردّے لگا کر قومی مذہب کی عمارت کو بتدریج تکمیل تک پہنچایا ہے۔اور جہاں عہدِ عتیق کے انبیاء نے اپنا کام چھوڑا تھا۔ خُداوند مسیح نے اُسی جگہ سے شروع کرکے اُسے قومی دائرہ سے نکال کو بتدریج عمومیت کی طرف ترقی دی۔اور جو مخالفین مسیحیت ہٹ دھرمی اور تعصب کی سیاہ عینکیں لگا کر اصل حقیقت کو مشکوک نظروں سے دیکھتے اور یہ کہا کرتے ہیں کہ خُداوند مسیح نے توریت کو رد اور باطل کردیا ہے۔ یہ اُن کی خوش فہمی، ضد اور محض کوتاہ اندیشی (کم فہمی) ہے۔ اور حقیقت اس کے برعکس ہے توریت کی خبر ملاحظہ ہو۔ "دیکھ وہ دن آتے ہیں۔ خُداوند فرماتا ہے جب میں اسرائیل کے گھرانے اور یہوداہ کے گھرانے کے ساتھ نیا عہد باندھوں گا" (یرمیاہ ۳۱:۳۱)۔ پھر اس آنے والے عہد کی عمومیت کی خبر پر غور کرو۔ "وہ وقت آتا ہے کہ میں تمام قوموں اور اہل لغت کو جمع کروں گا۔اور وہ آئیں گے اور میرا جلال دیکھیں گے" (یسعیاہ ۶۶: ۱۸)۔ الفاظ وہ دن آتے ہیں اور وہ وقت آتا ہے قابل غور ہیں۔اور یہ اُس آنے والے نئے عہد اور اُس کے ہونے والے بانی کے متعلق صریح (صاف) پیش خبری ہیں۔ خُدا کے علم وارادہ میں توریت کا حدِ رواج مسیح تک تھا۔ "لیکن جب وقت پورا ہوگیا تو خُدا نے اپنے بیٹے کو بھیجا جو عورت سے پیدا ہوا۔اور شریعت کے ماتحت پیدا ہوا۔ تاکہ شریعت کے ماتحتوں کو مول لے اور ہم کو لے پالک ہونے کا درجہ ملے" (گلتیوں ۴: ۴-۵)۔اور لازم تھا کہ عہدِ جدید کا بانی شریعت کے ماتحت پیدا ہو۔ تاکہ شریعت سابقہ کا سلسلہ نہ ٹوٹے۔ جو شریعت موسوی کو کامل کرنے آیا تھا وہ پہلے خود اُس کا پابند ہوا۔ "چنانچہ آٹھویں روز اُس کا ختنہ ہوا" (لوقا ۲: ۲۱؛ مطابق احبار ۱۲: ۳) اور مریم مقدسہ شرع موسوی کے مطابق پاک ہونے کے دن پورے ہونے پر ہیکل میں قربانی چڑھانے گئی (لوقا ۲: ۲۲-۲۴ مطابق احبار ۱۲: ۶-۸) مسیح نے بپتسمہ بھی لیا (متی ۳: ۱۳-۱۷)۔ وہ ہر سال عیدوں کے لئے یروشلیم کو جایا کرتا تھا (لوقا ۲: ۴۱-۴۲ مطابق خروج ۲۳: ۱۴، ۱۷) وہ ہیکل کا محصول ادا کرتا تھا (متی

۲۴:۱۷ -۲۷ مطابق خروج ۱۳:۳۰)۔ یہودی روزہ رکھتے تھے مسیح نے بھی چالیس دن روزہ رکھا(متی ۱:۴؛لوقا ۲:۴ بمطابق احبار ۲۹:۱۶؛یسعیاہ ۳:۵۸-۷)۔ آپ نے ایک کوڑھی کو معجزانہ طور سے شفادی اوراُسے موسوی دستور کی ہدایت فرمائی (متی ۱:۸-۴ بمطابق احبار ۱:۱۴-۷)اور آپ نے اپنی خدمت کے آغاز ہی میں فرمایا۔"یہ نہ سمجھو کہ میں توریت یانبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیاہوں۔ منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا(کامل) کرنے آیاہوں"(متی ۱۷:۵)۔ چنانچہ آپ نے شریعت دی۔اُس کی تردید و تنسیخ (منسوخ) نہیں بلکہ تکمیل فرمائی اوراُس کو انقیادی خصوصیت سے نکال کر عمومیت میں تبدیل کیا۔اور تمام اقوام عالم کادستور العمل ہونے کی صلاحیت اُس میں پیدا کردی۔ جس طرح ایک گورنر کارُعب واقتدار اور حکومت واختیار صرف ایک ہی صوبہ تک محدود و مختص ہوتاہے۔اوراُس کے اپنے صوبہ سے باہر اُس کے احکام و قوانین کچھ اثر نہیں رکھتے۔اسی طرح موسوی شرائع واحکام کادائرہ اثر صرف یہودی قوم تک ہی محدود تھا۔اور یہودیت کے باہر انبیاء کے قوانین اوراُن کی آواز کا کچھ اثر نہ تھا۔تعزیرات پاک وہند کے قوانین ودفعات صرف ان ممالک کی حدود کے اندر ہی زور رکھتے ہیں۔اور فرانس جرمنی اورامریکہ کے لوگوں سے اُن کی تعمیل کا مطالبہ نہیں کیاجاسکتا۔ اسی طرح شریعتِ موسوی تمام دُنیا کادستور العمل ہونے کی بنفسہ کوئی صلاحیت نہیں رکھتی۔اور خُداوند مسیح کی آمد اور ظہور کاسب سے اعلیٰ مقصد یہی تھا کہ مذہب الٰہی عالمگیر ہوجاتے۔چونکہ خُدا تمام دُنیاکاواحد مالک اور شہنشاہ ہے اس واسطے مسیح شریعت کو جو مختص بالقوم والزمان ہونے کے باعث کمزور اور ادھوری تھی کامل کرنے آیا۔"اور فرمایاکہ میں توریت کو منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا(کامل) کرنے آیاہوں۔ہم آگے چل کر اچھی طرح دکھائیں گے کہ توریت کی تکمیل مسیح نے کس صورت میں فرمائی۔اور کس طرح قومی مذہب کو عالمگیر مذہب کی صورت دے دی۔

توریت کا تجزیہ

توریت کا تجزیہ کیاجائے تواُس میں تین قسم کے مضامین دستیاب ہوتے ہیں۔اول احکام، دوم اخبار سوم۔ تعلیم ،اَحکام کی دوقسمیں ہیں۔یعنی اَمر اور نہی اَمر وہ احکام ہیں جن پر عمل کرنے کی تاکید پائی جاتی ہے۔ مثلاً"توسبت کادن پاک ماننا"۔"تُو اپنے باپ اوراپنی ماں کی عزت کرنا۔" وغیرہ اس قسم کے تمام احکام کواوامر (امر کی جمع ،احکام) کہتے ہیں۔اور نہی وہ احکام کہلاتے ہیں جن میں کسی کام کے کرنے کی ممانعت پائی جائے۔مثلاً"تُو اپنے لئے کوئی تراشی ہوئی مورت نہ بنانا۔نہ کسی چیز کی صورت بنانا جواُوپر آسمان میں یانیچے زمین پر یازمین کے نیچے پانی میں ہے۔تُواُن کے آگے سجدہ نہ کرنا۔اور نہ اُن کی عبادت کرنا"۔وغیرہ اِس قسم کے امتناعی احکام کو نواہی کہتے ہیں۔پھر اخبار تین قسم کی ہیں۔یعنی حال کی، ماضی کی،اور مستقبل کی۔

اوّل۔اخبار حال وہ ہیں جو موسیٰ اور دیگر انبیاء نے اپنے اپنے زمانہ میں واقعات موجودہ اور تجارب مشہودہ (تجربہ سے ثابت کیاگیا) کی بناپر لکھیں۔

دوم۔اخبار ماضی جیسے موسیٰ نے دُنیا کی پیدائش، آدم کی نافرمانی واستخراج از جنت العدن اور طوفان نوح کے واقعات لکھے۔اوراُن اخبار سابقہ کوالہام الٰہی کی روشنی میں قلمبند کیا۔

سوم۔اخبار مستقبل۔ جیسے موسیٰ اوراُس کے ماقبل ومابعد کے انبیاء نے خُداوند مسیح کے متعلق خبریں دیں۔ یہ خبریں انبیاء خُدا سے حاصل کرکے بوساطت الہام لکھتے تھے۔اوراِنہیں کو پیش گوئی کہتے ہیں۔اوامر ونواہی اور اخبار باقسام ثلٰثہ (یہ تینوں قسم کی خبریں) توتمام صحائف عتیقہ وجدیدہ کو من

حیث المجوعہ (پرانے اور نئے عہد نامے کے صحائف کو ایک خزانۂ کلیات کی حیثت حاصل ہے) شامل ہیں۔یعنی انجیل میں بھی توریت کی طرح موجود ہیں۔ لیکن احکام کی دو اور خاص قسمیں ہیں جو صرف توریت ہی سے متعلق ہیں۔**یعنی احکامِ خاص اور احکامِ عام**۔اب ہم اُن کا مفصل بیان کریں گے۔

اَحکامِ خاص

قربانیاں، ختنہ، روزہ، نذریں، طہارت بدنی، سبت، عیدیں اور حلت و حرمت (حلال و حرام) وغیرہ جو سب ہیکل کے ساتھ متعلق تھے۔ اور احکام وقضاۃ وشاہان بنی اسرائیل کے متعلق سیاسی قوانین وفرائض سب احکام خاص میں شامل ہیں۔اور شرائع رسمی وملکی ان ہی سے متعلق تھیں۔ان کا تعلق صرف قوم اسرائیل کے ساتھ تھا۔دیگر اقوام میں نہ تو کبھی ان کی ترویج کی کوشش کی گئی اور نہ ایسا کرنے کا کوئی حکم ہی تھا۔احکامِ خاص اپنی ذات اور مقصد میں تمام دُنیا کا دستور العمل ہونے کی صلاحیت ہی نہ رکھتے تھے۔ان کا تعلق صرف یہودی مذہب۔تمدن ومعاشرت اور قومیت سے تھا۔ مثلاً عیدیں یہودی تاریخ کے خاص واقعات کی یادگاہیں تھیں۔

یہودیت سے باہر کی دنیا کو اُن سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔کیونکہ وہ اُس کی تاریخ سے کچھ واسطہ نہیں رکھتیں۔مثلاً ایک فوجی آدمی اگر اپنے لباس پر تمغے لگاتا ہے تو وہ اُس کی جنگی زندگی کے واقعات کی یادگاریں اور نشانیاں ہیں۔اگر دوسرے لوگ جن کو محاربہ ومکابرہ (لڑائی اور جنگ) سے کبھی واسطہ ہی نہیں پڑا اُس فوجی کی دیکھا دیکھی اپنے لباس پر تمغے لگالیں۔تو وہ بے مطلب اور بے معنی ہوں گے۔فوجی لوگوں کے چند خاص ظاہری امتیازات ہوتے ہیں۔جن کے باعث وہ عوام الناس سے ممتاز نظر آتے ہیں۔اور وہ امتیازی علامات اُن ہی کے لئے خاص ہوتی ہیں نہ کہ تمام لوگوں کے لئے۔اسی طرح توریت کی رسمی وملکی شرائع یہودیت کو اُس وقت کی تمام دیگر اقوام سے ممتاز کرتی تھیں۔اور دوسری وجہ احکام خاص کے نفاذ کی یہ تھی کہ ان ظاہری اور جسمانی قوانین کے ذریعے اُن میں الہٰی متابعت وفرمانبرداری کی رُوح پیدا کی جائے۔یہ گویا ایک ابتدائی تربیت تھی۔اور اس تربیت اوّلہ سے منتہائے (آخر) مقصود یہ تھا کہ اخلاقی وروحانی شریعت کی پابندی کرنا سیکھیں۔جیسے حروف تہجی بچوں کو محض اس لئے سکھائے جاتے ہیں کہ اُن کے ذریعے وہ کسی وقت اعلیٰ علمی کتابیں پڑھ سکیں۔اسی طرح اَحکام خاص بھی اُس قوم کے لئے بطور ابتدائی سبق کے تھے۔اور جب کوئی طالب علم مولوی فاضل بن جاتا ہے تو پھر اُسے حروف تہجی پر مغز مارنے کی ضرورت نہیں رہتی۔اور قاعدہ حروف تہجی کے متروک ہونے سے وہ قاعدہ ردوباطل نہیں ہوجاتا بلکہ جس حد تک پہنچانا اُس کا مقصود تھا اُس تک پہنچ کر اُس کی ضرورت نہیں رہتی۔اسی طرح احکام خاص اعلیٰ اخلاقی وروحانی شریعت تک پہنچا کر متروک العمل ہوگئے۔اور پھر پھر کر اُن کی رَٹ لگانا ایسا ہی عبث ہے جیسے کوئی مولوی فاضل ہوکر دوبارہ حروفِ تہجی کی مشق شروع کرے۔چراغ کی ضرورت اُس وقت تک ہوا کرتی ہے جب تک آفتاب طلوع نہ ہو۔لیکن آفتاب کی آمد سے چراغ ردوباطل نہیں ہوجاتا بلکہ اُس کی ضرورت نہیں رہتی۔پس سورج کی موجودگی میں مٹی کے چراغ جلانا نادانی ہے۔"اور ہمارے پاس نبیوں کا وہ کلام ہے جو زیادہ معتبر ٹھہرا۔اور تُم اچھا کرتے ہو جو یہ سمجھ کر اُس پر غور کرتے ہو کہ وہ ایک چراغ ہے جو اندھیری جگہ میں روشنی بخشتا ہے۔جب تک پَو نہ پھٹے اور صبح کا ستارہ تمارے دلوں میں نہ چمکے" (۲۔پطرس ۱:۱۹)۔اور وہ شرعی زمانہ مذہب الہٰی کی طفولیت کا زمانہ تھا۔اور خُداوند مسیح نے اُسی کو شباب کے عہد تک پہنچایا۔"جب میں بچہ تھا بچوں کی طرح بولتا تھا۔بچوں کی سی طبیعت تھی۔بچوں کی سی سمجھ تھی لیکن جب جوان ہوا تو بچپن کی باتیں ترک کردیں" (۱۔کرنتھیوں ۱۱:۱۳)۔"پس شریعت مسیح تک پہنچانے کو ہمارا اُستاد بنی۔ تاکہ ہم ایمان کے سبب راستباز ٹھہریں۔مگر جب ایمان آچکا تو ہم اُستاد کے ماتحت نہ رہے" (گلیتوں ۲۴:۳-۲۵) اب ذرا لتفصیل کے ساتھ دکھایا جائے گا

کہ کس طرح احکام خاص کا تکملہ عہدِ جدید میں آکر ہو گیا۔اور شرع رسمی میں سے چند بڑی بڑی رسوم کو لے کر انجیلِ مقدس میں اُن کی تکمیل دکھائی جائے گی۔یعنی اُس کا آغاز کا انجام دکھایا جائے گا۔اُسی خواب کی تعبیر پیش کی جائے گی۔

قُربانیاں

لفظ قربانی کا مادہ ''قرب'' (نزدیکی) ہے۔یعنی قربانی ایک ایسا شرعی فعل ہے جس کے ذریعے اِنسان خاطی وعاصی تقربِ الٰہی کو حاصل کرسکے۔ شرعِ موسوی میں بنی اسرائیل قوم کو قربانی چڑھانے کے خاص احکام تھے۔اور وہ بموجب فرمانِ الٰہی پانچ قسم کی قربانیاں گذرانتے تھے۔احبار کی کتاب میں اُن کا مفصل بیان مل سکتاہے۔

واضح ہو کہ اِنسان اِس دُنیا کی کسی بھی شئے کا مالک نہیں بلکہ مختار ہے۔اور خُدا سب دُنیا کا واحد مالک ہے۔''زمین اور اُس کی معموری خُداوند کی ہے۔جہان اور اُس کے باشندے بھی'' (زبور ۱:۲۴)۔''اور ہزاروں پہاڑوں کے چوپائے میرے ہی ہیں۔میں پہاڑوں کے سب پرندوں کو جانتاہوں اور میدان کے درندے میرے ہی ہیں۔اگر میں بھوکا ہوتا تو تجھ سے نہ کہتا۔کیونکہ دُنیا اور اُس کی معموری میری ہی ہے'' (زبور ۱۰:۵۰-۱۲)۔اور انسان کے قبضے میں ان اشیاء کی ذاتوں کے منافع اور فوائد ہی ہیں۔اور اِنسان کو یہی حکم تھا کہ ان جانوروں کی ذاتوں کے فوائد کو قربان کرنے کے لئے اُن کو ذبح کرناپڑتا تھا۔اور بغیر ذبح کئے وہ فوائدِ عقیدتِ الٰہی کے مذبح پر قُربان نہیں کئے جاسکتے تھے۔اس واسطے قربانی کے لئے جانور ذبح کئے جاتے تھے۔اور یہ ایک طرح کا اِیثار تھا جو وہ خُدا کے حکم کے مطابق اُس کی خوشنودی ورضاجوئی کے لئے کرتے تھے۔اور اس سے مقصود یہ تھا کہ تقریب الٰہی کے حصول کی خاطر ان معمولی منافع کو قربان کرتے کرتے اُن میں خُدا کی محبت یہاں تک بڑھ جائے کہ کسی وقت وہ اپنی جان بھی اُس کی خاطر قربان کردینے میں دریغ نہ کریں۔ اور ایک طرف تو خود اِنکاری وایثار کی رُوح اُن میں پیدا ہو جائے۔دوسری طرف وہ یہ احساس کرنے لگ جائیں کہ خُدا کی شریعت کا عدول کرنے سے جو موت اُنہوں نے کمائی وہ جانوروں پر وارد ہو رہی ہے۔اور خُدا ہماری جانوں کو اس قدر عزیز رکھتاہے کہ ان بیگناہ جانوروں کی جانوں کو ہماری جانوں کا مُبادلہ ٹھہراتاہے۔تو بھی ''ممکن نہیں کہ بیلوں اور بکروں کا خون گناہوں کو دور کرے'' (عبرانیوں ۴:۱۰)۔''بلکہ وہ قربانیاں سال بہ سال گناہوں کو یاد دِلاتی ہیں'' (عبرانیوں ۳:۱۰)۔چونکہ خُدا عادل ہے اور عدل کا تقاضا ہے کہ جان کے بدلے جان لی جائے۔اس لئے عارضی طور پر یہ حیوانی مجازی قربانیاں مسیح کی حقیقی قُربانی کے انبیاء کے طور پر قائم رہیں۔اور جب خُداوند مسیح نے حقیقی اور اصلی قُربانی دے دی تو اُن مجازی قربانیوں کا رواج اُسی وقت سے بند ہو گیا۔اور موسوی قربانیاں مسیح کی قربانی کی ایک تمثیل ہی تھیں۔''کیونکہ شریعت جس میں آئندہ کی اچھی چیزوں کا عکس ہے اور اُن چیزوں کی اصلی صورت نہیں'' (عبرانیوں ۱:۱۰)۔

اگر بالفرض محال حیوانی قُربانی عدلِ الٰہی کے تقاضا کو پورا کرسکتی ہے تو سوال لازم آتاہے کہ قُربانی سے عابد کو فائدہ پہنچتاہے یا معبود کو اور یا مذبوح کو؟ اگر کہاجائے کہ عابد کو تو یہ خلافِ انصاف ہے۔کیونکہ مجرم کو فائدہ پہنچانا عدل نہیں۔بلکہ از روئے عدل مجرم کو خسارہ کا متحمل ہونا لازمی ہے۔اور جب کہ گناہ کے باعث مجرم اِنسان سزائے موت کا مستحق ہے۔(رومیوں ۲۳:۶) تو اُس کی جان کا مبادلہ حیوان کیسے ہوسکتاہے؟ یہ بھی عدل کو پورا نہیں کرتا۔ اور پھر جانور کسری طور (علم حساب میں اکائی کا ایک حصہ یا کمی حصے) پر قربان کیا جاتاہے۔اور فعلِ کسری نہ تو نیک ہو سکتاہے نہ بد۔یہ تو ایسا ہی ہوا کہ ایک خُونی کی جان کے عوض میں سرکار کو ایک بکرا یا بیل پیش کیا جائے۔اور اگر کہاجائے کہ قربانی سے خُدا کو فائدہ پہنچتاہے تو یہ اُس کی ذات بے نیاز، لااحتیاج

کے منافی ہے۔ اُس میں کوئی کمی نہیں۔ وہ غنی ہے اس لئے اُس کو کسی فائدہ کے حصول کی ضرورت ہی نہیں۔ اور اگر کہا جائے کہ جانور کی ذات کو فائدہ پہنچتا ہے۔ تو یہ خلافِ عقل ہے۔ کیونکہ ہلاکت کسی ذی جان کے لئے فائدہ مند ہو نہیں سکتی۔ اور اگر کہا جائے کہ قربانی سے کسی کو بھی کو فائدہ نہیں ہوتا۔ تو اس صورت میں قربانی ایک فضول اور بے بنیاد کام ٹھہرتا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ حیوانی قربانی اگر خُداوند مسیح کی حقیقی و اخلاقی قربانی کی علامت نہ سمجھی جائے تو وہ ظُلم و تشدد کے سوا کچھ نہ تھی۔ اور خُداوند مسیح کی آمد پر قُربانیوں کے رواج بند ہو جانے کی خبر خود عہدِ عتیق میں موجود ہے۔ ملاحظہ ہو۔ "اور باسٹھ ہفتوں کے بعد مسیح قتل کیا جائے گا۔ اور وہ ایک ہفتہ کے لئے بہتوں سے عہد قائم کرے گا۔ اور نصف ہفتہ میں ذبیحہ اور ہدیہ موقوف کرے گا" (دانی ایل ۹:۲۶-۲۷)۔ جس طرح موسم برسات کی بافراط و بہتات بارشیں فصلوں کو چاہی آبپاشی کی طرف سے بے نیاز کر دیتی ہیں۔ اور پھر آبپاشی کے محدود انسانی ذرائع بند ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح مسیح کی حقیقی اور کامل قُربانی کے بعد پھر کسی حیوانی قُربانی کی ضرورت نہ رہی۔ جانور کی قربانی کسری اور مجہول ہوتی تھی۔ اور خُداوند مسیح کی قُربانی اختیاری اور معلوم قُربانی ہے۔ آپ کا فرمان ملاحظہ ہو۔

"باپ مجھ سے اس لئے محبت رکھتا ہے کہ میں اپنی جان دیتا ہوں۔ تاکہ اُسے پھر لے لوں۔ کوئی اُسے مجھ سے چھینتا نہیں۔ بلکہ میں اُسے آپ ہی دیتا ہوں۔ مجھے اُس کے دینے کا بھی اختیار ہے۔ اور اُسے پھر لینے کا بھی اختیار ہے۔ یہ حکم میرے باپ سے مجھے ملا" (یُوحنا ۱۷:۱۰-۱۸)۔

ختنہ

ختنہ کا آغاز ابراہام سے ہوا۔ خُدا تعالیٰ نے اُس کے ساتھ عہد باندھا تھا اور ختنہ اُس عہد کے لئے بطور ایک نشان کے ٹھہرایا۔ خُداوند نے ابراہام سے فرمایا۔ "اور میرا عہد جو میرے اور تیرے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ہے۔ اور جسے تُم مانو گے سو یہ ہے کہ تُم میں سے ہر ایک فرزند نرینہ کا ختنہ کیا جائے۔ اور تُم اپنے بدن کو کھلڑی کا ختنہ کیا کرنا۔ اور یہ اُس عہد کا نشان ہو گا جو میرے اور تمہارے درمیان ہے" (پیدائش ۱۷:۱۰-۱۱)۔ اور ختنہ کا حکم صرف بنی اسرائیل کے ساتھ ہی خاص تھا۔ ابرہام کی نسل سے باہر کسی اور قوم کو اُس کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ تمام اقوام عالم ابراہام کی نسل سے نہیں ہیں۔ بلکہ اقوام کی تفریق تو نُوح کے بیٹوں سم، حام اور یافت ہی سے ہو جاتی ہے۔ صرف یہودی قوم ہی ابراہام کی نسل تھی۔ اس لئے ختنہ کا حکم صرف اُسی کے لئے دیا گیا تھا۔ اور اس رسم کا روحانی مطلب بھی توریت میں بدیں الفاظ موجود ہے۔ "اس لئے اپنے دلوں کا ختنہ کرو اور آگے کو گردن کش نہ رہو" (استثنا ۱۶:۱۰)۔ "اور خُداوند تمہارا خُدا تمہارے اور تمہاری اولاد کے دل کا ختنہ کرے گا" (استثنا ۶:۳۰، یرمیاہ ۴:۴)۔ اگرچہ وعدے کی نسل ہونے کے سبب سے یہودی قوم کے لئے ختنہ لازمی تھا۔ لیکن اگر تمام دُنیا کی اقوام کے لئے ختنہ کا حکم خُدا دیوے تو وہ روحانی معنی میں ہی ہو سکتا ہے۔ اور ختنہ کا روحانی مفہوم ہی دل کی غلاظت کو کاٹ پھینکنا تھا۔ روحانی مفہوم و مطالب کا محسُوسات و جسمانیات کے پیرایہ میں متمثل ہونا کوئی امر جدید اور دُور از فہم بات نہیں۔ پولُس رسول فرماتا ہے۔ "کیونکہ وہ یہودی نہیں جو ظاہر کا ہے۔ اور نہ وہ ختنہ ہے جو ظاہری و جسمانی ہے۔ بلکہ یہودی وہ ہے جو باطن میں ہے۔ اور ختنہ وہی ہے جو دل کا اور روحانی ہے نہ کہ لفظی" (رومیوں ۲۸:۲-۲۹)۔ "نہ ختنہ کوئی چیز ہے نہ نامختونی بلکہ نئے سرے سے مخلوق ہونا" (گلیتوں ۱۵:۶؛ ۱۔ کرنتھیوں ۱۹:۷؛ گلتیوں ۲:۵-۳؛ کلیسوں ۱۱:۲)۔ ختنہ بعض حالتوں میں طبّی لحاظ سے مفید ہوتا ہے لیکن اس سے کوئی روحانی فائدہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ مختون اور نامختون ہر دو قسم کے لوگ دنیا میں موجود ہیں اور دونوں فریق گناہ کے ماتحت ہیں۔ اگر ختنہ سے روحانی اخلاقی زندگی کی اصلاح و بہبود ممکن ہوتی تو لازم تھا کہ مختون بلحاظ رُوحانیت و پاکیزگی کے نامختونوں سے بدرجہا افضل ہوتے۔ لیکن مشاہدہ اس کے

خلاف ہے۔ خُداوند مسیح کا ختنہ ابراہام کی نسل ہونے کے سبب ہوا لیکن غیر یہودی چونکہ ابراہام کی نسل سے نہیں ہیں اس لئے اُن پر ختنہ کروانا لازمی نہیں ہے۔ اسی واسطے مسیحیت کے قیام پر ختنہ موقوف ہوگیا۔ اور اُس کی جگہ نئے عہد میں بپتسمہ کی رسم قائم ہوئی (متی ۱۹:۲۸)۔

سبت

آفرینشِ عالم (دُنیا کی پیدائش) کے عظیم الشان اور لاثانی واقعہ کی یادگار کے طور پر سبت کو مقدس ٹھہرا گیا۔ اُس روز خُدا نے تمام بے جان اور جاندار، دیدنی اور نادیدنی اشیاء کو بنا کر فراغت پائی۔ (پیدائش ۲: ۳) اور خُدا نے سبت کا دن شریعت میں دو وجوہات کے ماتحت شامل کیا۔

اوّل سبت کو آفرینش عالم کی یادگار ٹھہرانے اور شریعت میں داخل کرنے سے خُدا کا ایک مقصد یہ تھا کہ لوگ مابعد زمانوں میں اِس دُنیا کی علت فاعلی کسی وہمی ہستی کو نہ ماننے لگ جائیں۔ اور خیالات باطلہ و توہمات مظنونہ میں نہ پھنس جائیں۔ بلکہ جب جب سبت کو منائیں تو یہ یاد کریں کہ یہ وہ دن ہے۔ جس میں خُدا نے تخلیق عالم سے فراغت پائی تھی۔ ''ایمان ہی سے ہم معلوم کرتے ہیں کہ تمام عالم خُدا کے کہنے سے ہے ہیں۔ یہ نہیں کہ جو کچھ نظر آتا ہے ظاہری چیزوں سے بنا ہو'' (عبرانیوں ۳:۱۱)۔

دوم۔ سبت کے دن کو مقدس ٹھہرانے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ قوم اسرائیل دُنیوی دھندوں اور فکروں وا لجھیڑوں میں یہاں تک نہ پھنس جائے کہ خُدا کی یاد ہی بِسر جائے۔ اس واسطے مصلحتاً پابندی اور عبودیت (بندگی، عبادت) کی رُوح اُن میں پیدا کرنے کے لئے یہ خاص دن اُن کے واسطے جسمانی دھندوں سے فراغت پانے اور عبادت میں صرف کرنے کے لئے مقرر کیا گیا۔ لیکن جو شخص سیدھی اور صاف نیت سے خُدا کی عبادت نہیں کرتا اُس کے لئے سبت اور باقی سب دن برابر ہیں۔ یہودیوں میں سبت کے متعلق ایسی سوء عقیدت (ایمان کی خرابی) پیدا ہوگئی کہ وہ اُس روز میں نیکی کرنا بھی گناہ سمجھنے لگے۔ اسی واسطے خُداوند مسیح نے بارہا اُن کے اس غلط خیال کی اصلاح کی کوشش کی۔ اور ایک دفعہ فرمایا۔ ''میں تم سے پوچھتا ہوں کہ آیا سبت کے دن نیکی کرنی روا ہے یا بدی کرنا؟ جان کو بچانا یا ہلاک کرنا'' (لوقا ۶:۹)۔ ''اور جب آپ نے اُس مریض کو تندرست کر دیا تو وہ آپے سے باہر ہو کر ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ ہم یسوع کے ساتھ کیا کریں؟'' (آیت ۱۱) ایک اور موقع پر مسیح نے سبت کے روز ایک کبڑی عورت کو جو (۱۸) برس سے کسی بدروح کے باعث مریض تھی شفا بخشی تو عبادت خانے کا سردار ناراض ہو کر کہنے لگا۔ ''چھ دن ہیں جن میں کام کرنا چاہیے۔ پس اُن ہی میں آ کر شفا پاؤ نہ کہ سبت کے دن''۔ لوقا ۱۳: ۱۴)۔ وہ سبت کے روز سوئی تک کو ہاتھ لگانا بھی گناہ سمجھتے تھے۔ اُن کی سُوء عقیدت (ایمان کی خرابی) اور فضول نمائش کو مٹانے کے لئے مسیح کے زندہ ہو کر صعود فرمانے کے بعد رسولی عہد میں سبت کی جگہ ہفتے کا پہلا دن (اتوار) مقرر ہوا۔ اور جس طرح سبت آفرینش عالم (دُنیا کی پیدائش) کے عدیم النظیر (پُرانی مثل) واقعہ کی یاد دلاتا ہے۔ اسی طرح ہفتے کا پہلا دن مسیح کے گناہ، موت اور قبر پر فوق الفطرت طاقت سے غالب آنے کی فقید المثل (جس کی کوئی مثال نہ ہو) واقعہ کی یادگار ٹھہرا۔ سبت وہ دن ہے جو تمام دُنیا میں زندگی کا مبداء سمجھا جاتا ہے۔ یعنی اُس روز خُدا تعالیٰ نے قالب گیتی میں رُوح پھونکنے کے کام کو تمام کیا۔ اور ہفتے کا پہلا دن وہ ہے جس میں اِنسان بلکہ تمام مخلوقات کو گناہ موت اور بطالت وفنا کے قبضہ سے چھڑا کر کھوئی ہوئی زندگی کو پھر سے بحال کیا گیا (رومیوں ۸:۲۰-۲۱)۔ اور خُداوند مسیح نے فرمایا۔ ''سبت آدمی کے واسطے بنا ہے نہ کہ آدمی سبت کے واسطے۔ پس ابن آدم سبت کا بھی مالک ہے'' (مرقس ۲:۲۷-۲۸)۔ اور صرف سبت کے روز ہی عبادت کو کافی نہیں ٹھہراتا بلکہ فرمایا۔ ''ہر وقت دُعا مانگتے

رہنا اور ہمت ہارنی چاہیئے"(لوقا۱۸: ۱)۔"اور ہر وقت اور ہر طرح سے روح میں دُعا اور منت کرتے رہو۔ اور اسی غرض سے جاگتے رہو کہ سب مقدسوں کے واسطے بلاناغہ دُعا مانگا کرو"(افسیوں۱۸:۶)۔ اگر اب کوئی سبت کے دن کو دُنیا کی تخلیق کی یادگار سمجھ کر اُس کی تعظیم کرے تو اس میں کوئی برائی نہیں۔ پر یہودیوں کی طرح اُس کی سطحی وظاہری پابندی جس میں نیکی کرنا بھی گناہ میں داخل ہے سراسر معیوب ہے۔ اس لئے سبت تمام عالم کا دستورالعمل ہونے کے ناقابل ہے۔ اسی لئے پولُس رسول فرماتا ہے۔"پس کھانے پینے یا عید یا نئے چاند یا سبت کی بابت کوئی تم پر الزام نہ لگائے۔ کیونکہ یہ آنے والی چیزوں کا سایہ ہیں۔ مگر اصل چیزیں مسیح کی ہیں"(کلسیوں ۲: ۱۶؛ گلتیوں۴: ۹-۱۰)۔ خُداوند مسیح نے سارے دن پاک رکھنے اور اُن میں عبادت کرنے کی تاکید فرمائی۔ پس سبت کی کوئی خصوصیت نہ رہی۔

ظاہری طہارت

شریعتِ موسوی میں بدنی طہارت پر بہت زور دیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو(گنتی ۷:۱۹-۲۲)اور اس ظاہری وجسمانی طہارت سے منشائے الٰہی یہ تھا کہ وہ لوگ باطنی اور رُوحانی پاکیزگی کے طالب ہوں۔ اور اُس کے لئے کوشش کریں۔ اگرچہ جسمانی صفائی، تندرستی وصحت کے زاویہ نگاہ سے نہایت ضروری ولازمی ہے۔ اور ایسی صفائی سے خُدا ناراض نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی خوش ہوتا ہے۔ تاہم روحانی زندگی کے ارتقاء میں اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ باطنی پاکیزگی وہ ہے جس کے لئے داؤد نبی خُدا سے یوں التجا کرتا ہے۔"اے خُدا! میرے اندر پاک دل پیدا کر اور میرے باطن میں از سر تو مستقیم رُوح ڈال"(زبور ۵۱: ۱۰)۔

اگرچہ ہندو لوگ تیرتھوں پر جاکر باطنی پاکیزگی کی بے کار اور موہوم(فرضی) اُمید پر اشنان(غُسل) وغیرہ کرتے ہیں۔ تو بھی تیرتھ اشنان کرنے والوں اور نہ کرنے والوں میں بلحاظ پاکیزگی کوئی مابہ آلا متیاز نظر نہیں آتا۔ بلکہ ہر دو قسم کے لوگ گناہ کی غلامی میں خوب پھنسے ہوئے ہیں۔ کہنیوں تک ہاتھ دھونے، وضو کرنے۔ اور اشنان کرنے سے باطنی طہارت ناممکن ہے۔ اسی واسطے ظاہر دار فقہیہ وفریسی خُداوند مسیح کے سامنے اُس کے شاگردوں کی یوں شکایت کرنے آئے کہ۔"تیرے شاگرد بزرگوں کی روایت کو کیوں ٹال دیتے ہیں کہ روٹی کھاتے وقت ہاتھ نہیں دھوتے"(متی ۱۵: ۲)۔ تو خُداوند مسیح نے اُنہیں یوں جواب دیا کہ۔"جو چیز منہ میں جاتی ہے وہ آدمی کو ناپاک نہیں کرتی۔ مگر جو منہ سے نکلتی ہے وہی آدمی کو ناپاک کرتی ہے"(آیت ۱۱)۔ اور شاگردوں کی فرمائش پر اپنے جواب کی یوں تفصیل فرمائی"جو کچھ منہ میں جاتا ہے وہ پیٹ میں پڑتا اور پاخانے میں نکل جاتا ہے۔ مگر جو باتیں منہ سے نکلتی ہیں وہ دل سے نکلتی ہیں۔ اور وہی آدمی کو ناپاک کرتی ہیں۔ کیونکہ برے خیال، خون ریزیاں، زناکاریاں حرام کاریاں، چوریاں، جھوٹی گواہیاں، بدگوئیاں دل ہی سے نکلتی ہیں۔ یہی باتیں ہیں جو آدمی کو ناپاک کرتی ہیں۔ مگر بغیر ہاتھ دھوئے کھانا کھانا آدمی کو ناپاک نہیں کرتا"(متی ۱۵: ۱۷-۲۰؛ مرقس ۷: ۱۷-۲۲)۔ اور فقہیوں اور فریسیوں کی ظاہرداری وتصنوع کے خلاف ہمیشہ ملامت کی۔"اے ریاکار فقہیو اور فریسیو! تُم پر افسوس ہے کہ پیالے اور رکابی کو اوپر سے صاف کرتے ہو۔ مگر وہ اندر لوٹ اور ناپرہیزگاری سے بھرے ہیں"(متی ۲۵: ۲۳-۲۸،۲۶)۔ تمام اناجیل باطنی طہارت اور اندرونی پاکیزگی کی تعلیم وتلقین سے مملُو(بھرا ہوا) ہیں۔ بلکہ اگر یوں کہیں تو زیادہ حق ہوگا کہ مسیح کی تعلیم کا تمام تر مقصد ومدعا ہی باطنی پاکیزگی تھا۔ پس مسیح کی کامل شریعت کی آمد سے توریت کی ظاہری اور ادُھوری شریعت خود بخود متروک ہوگئی۔ اور جس اعلیٰ مقصد کی انجام دہی کے لئے خُدا نے وہ ابتدائی اور ناکامل شریعت دی تھی اُس نے مسیح کی کامل واکمل شریعت کے ذریعے تکمیل پائی۔ اور وہ مختص بالقوم وزمان شرع(احکام خاص)

عالمگیر اور ابدی ودائمی شرع کی آمد پر متروک العمل ہوگئی۔ ''کیونکہ وہ صرف کھانے پینے اور طرح طرح کے غسلوں کی بناء پر جسمانی احکام ہیں جو اصلاح کے وقت تک مقرر کئے ہیں'' (عبرانیوں ۱۰:۹) خُداوند مسیح کی کامل شریعت کا حکم طہارت باطنی کے متعلق ملاحظہ ہو۔ ''پس اَے عزیزو! چونکہ ہم سے ایسے وعدے کئے گئے۔ تو آو۔ اپنے آپ کو ہر طرح کی جسمانی اور روحانی آلودگی سے پاک کریں۔ اور خُدا کے خوف کے ساتھ پاکیزگی کو کمال تک پہنچائیں'' (۲۔ کرنتھیوں ۱:۷)۔

حِلتِ و حُرمت

توریت میں بعض اشیاء کھانے پینے کے لحاظ سے حلال اور بعض حرام ٹھہرائی گئی تھیں۔ (استثنا ۱۴: ۳-۲۱) امورِ معاشرت میں حلال و حرام اور پاک وناپاک کے متعلق اوامر ونواہی (وہ احکام جن کے کرنے اور نہ کرنے کا حکم ہو) خُدا نے دو اعلیٰ رُوحانی مقاصد کے تحت فرمائے۔ **اوّل** یہ کہ وہ منازل جسمانیہ سے شروع کرکے بتدریج منازل رُوحانیہ کی طرف قدم اُٹھائیں۔ ادنیٰ سے آغاز کرکے اعلیٰ کی طرف بڑھنا سیکھیں۔ اور جسم سے شروع کرکے روح کی طرف بڑھیں۔ حرام کا رُوحانی مفہوم گناہ اور حلال کا روحانی مطلب نیکی وپاکیزگی ہے۔ ''بدی سے نفرت رکھو نیکی سے لپٹے رہو'' (رومیوں ۹:۱۲)۔ **دوم** یہ کہ خُدا کی برگزیدہ قوم اور غیر اقوام میں امتیاز نظر آئے۔ اور رفتہ رفتہ رُوحانی واخلاقی امتیاز جسمانی اور معاشرت امتیازات کی جگہ لے لے۔ اور کسی وقت وہ روحانی امتیاز خصوصیت کی قیود سے نکل کر عمومیت میں منتقل ہو جائے۔ ''تمہاری روشنی آدمیوں کے سامنے چمکے۔ تاکہ لوگ تمہارے نیک کاموں کو دیکھ کر تمہارے باپ کی جو آسمان پر ہے بڑائی کریں'' (متی ۵:۱۶)۔ ''بے ایمانوں کے ساتھ ناہموار جوئے میں نہ جتو۔ کیونکہ راستبازی اور بے دینی میں کیا میل جول؟ یا روشنی وتاریکی میں کیا شراکت؟ مسیح کو بلی یعل کے ساتھ کیا موافقت؟ یا ایماندار کا بے ایمان کے ساتھ کیا واسطہ؟ اور خُدا کے مقدس کو بتوں سے کیا مناسبت ہے؟'' (۲۔ کرنتھیوں ۱۴:۶-۱۶)۔ یہ امتیاز تھا جو اُس معاشرتی وجسمانی امتیازات کی جگہ لینے والا تھا۔ اسی واسطے حلت وحرمت کے قومی اور زمانی اَحکام کا باطنی اور رُوحانی مفہوم خُداوند مسیح نے یوں ظاہر فرمایا۔ ''جو چیز منہ میں جاتی ہے وہ آدمی کو ناپاک نہیں کرتی۔ مگر جو منہ سے نکلتی ہے وہی آدمی کو ناپاک کرتی ہے'' (متی ۱۱:۱۵)۔ مقدس پطرس رسول نے بھی توریت کے حکم کے مطابق خُدا کی اُتاری ہوئی چیزوں میں حلال وحرام کا امتیاز ظاہر کیا تھا۔ لیکن خُدا نے فرمایا۔ کہ ''جن کو خُدا نے پاک ٹھہرایا ہے تو اُنہیں حرام نہ کہہ'' (اعمال ۱۱: ۱۱-۱۵)۔ قابل غور امر یہ ہے کہ جب خُدا خود پاک ہے تو اُس نے ناپاک چیزیں کیسے پیدا کردیں؟ کیا کبھی سورج سے تاریکی برآمد ہوسکتی ہے؟ ایک نقیض دوسرے نقیض کی علت ہوسکتا ہے؟ ہر گز نہیں لہٰذا جب خُدا پاک ہے تو اُس نے کوئی شے بذاتہ ناپاک پیدا نہیں کی۔ اور حلت وحرمت کے احکام کا نفاذ محض فرمانبرداری اور پابندی کی رُوح بنی اسرائیل میں پیدا کرنے کی غرض سے ہوا تھا۔ مقدس پولُس رسول فرماتا ہے۔ ''خُدا کی پیدا کی ہوئی ہر چیز اچھی ہے۔ اور کوئی چیز انکار کے لائق نہیں۔ بشرطیکہ شکر گزاری کے ساتھ کھائی جائے'' (۱۔ تیمتھیس ۴:۴)۔ ''کوئی بذاتہ حرام نہیں۔ لیکن جو اُس کو حرام سمجھتا ہے اُس کے لئے حرام ہے'' (رومیوں ۱۴:۱۴)۔ پھر فرماتا ہے۔ ''کھانا ہمیں خُدا سے نہیں مِلائے گا۔ اگر نہ کھائیں تو ہمارا کچھ نقصان نہیں اور اگر کھائیں تو کچھ نفع نہیں'' (۱۔ کرنتھیوں ۸:۸)۔ ''کیونکہ خُدا کی بادشاہت کھانے پینے پر نہیں بلکہ راستبازی اور میل ملاپ اور اُس خوشی پر موقوف ہے جو رُوح القدس کی طرف سے ہوتی ہے'' (رومیوں ۱۷:۱۴) البتہ اگر ہمارے کھانے پینے سے کسی کے جذبات کو ٹھیس لگنے کا احتمال ہو تو اس نیت سے کہ کسی کو ٹھوکر نہ لگے

اور محبت کا قاعدہ نہ ٹوٹے احتیاط لازمی ہے۔(رومیوں ۱۵: ۱۴؛ ۱۔ کرنتھیوں ۱۳: ۸) کیونکہ ساری شریعت پر ایک ہی بات سے پورا عمل ہو جاتا ہے۔ یعنی اس سے کہ "تُو اپنے پڑوسی سے اپنی مانند محبت رکھ"(گلتیوں ۱۴:۵)۔

روزہ

جس روحانی مقصد سے روز کا حکم قوم یہود کو دیا گیا وہ بہت گہرا تھا۔ اس میں ایک تو عابد کے جسمانی ایثار کی علامت پائی جاتی ہے۔ کہ عابد اپنے معبود حقیقی کے عشق و محبت میں یہاں تک محو ہو جائے کہ کوئی جسمانی فکر اُس کی اس عقیدت و محبت پر غالب نہ آسکے۔ بلکہ اگر اُس کو اپنی تمام لذایذ و حظائظ نفسانی اور آرائش و زیبائش جسمانی اپنے محبوب حقیقی کی قربان گاہ عقیدت و محبت پر نثار کرنی پڑھائیں تو مطلق دریغ نہ کرے۔ اور وہ یہ سمجھنے لگ جائے کہ "آدمی صرف روٹی سے جیتا نہیں رہتا۔ بلکہ ہر بات سے جو خُدا کے مُنہ سے نکلتی ہے"(متی ۴: ۴)۔ دوم یہ کہ بعض دفعہ عابد اپنے معبود کی طبیعت اور مرضی کے خلاف کوئی گناہ کرکے اُس کی ناراضگی کو محسوس کرتا ہے۔ اور اُس کی ناراضگی کے باعث طبیعت میں بے چینی۔ اضطراب اور قلق (بے چینی) اس درجہ بڑھ جاتا ہے کہ کھانا پینا قدرتی طور پر اچھا نہیں لگتا اور انسان خورد و نوش اور آسائش و زیبائش کو یکسر ترک کرکے سوگوار حالت میں بیٹھتا ہے۔ جیسے داؤد نبی سے جب خلاف مرضی خُدا گناہ سرزد ہوا اور اُس نے خُدا کی ناراضگی کو محسوس کیا تو نہایت غمگیں اور بے چین ہو کر روزہ رکھا اور تخت کو چھوڑ کر ٹاٹ اوڑھا اور فرش پر پڑا رہا۔(۲۔ سموایل ۱۶:۱۲-۱۷؛ یوناہ ۵:۳) سوم۔ حضرت ابوالبشر (آدم) کے گناہ میں گر جانے کے باعث تمام بنی آدم موروثی ناپاکی میں مبتلا ہیں۔ اور گناہ تمام دُنیا پر مرض کی طرح غالب ہے۔ اور اس مرض نے زندگی کے شیریں چشمہ کو کڑوا کر دیا ہے۔ اور انسان اپنی ذاتی کوشش و تدبیر سے پاک بننے میں قطعی قاصر ہے۔ اس واسطے جب تک اُن کے اس مرض روحانی کا کوئی حکیم و شافی ظاہر نہ ہو تب تک مریضان گناہ کا غمگیں حالت میں رہنا اور روزہ رکھنا ضروری ہے۔ اور مرض کی حالت میں ویسے بھی کھانا پینا اچھا نہیں لگتا۔ اور خُداوند تعالیٰ نے زکریاہ نبی کی معرفت گویا مرضِ گناہ کے حکیم حاذق (اپنے فن میں ماہر استاد) خُداوند مسیح کی خبر دی اور فرمایا۔ "کہ چوتھے اور پانچویں اور ساتویں اور دسویں مہینے کا روزہ بنی یہوداہ کے لئے خوشی اور خُرمی کا دن اور شادمانی کی عید ہو گا"(زکریاہ ۸:۱۹)۔ اور یوحنا کے شاگرد اور فریسی جو روزہ کے بڑے پابند تھے مسیح کے شاگردوں کی شکایت کرنے لگے کہ وہ روزہ کیوں نہیں رکھتے؟ خُداوند مسیح نے اُنہیں جواب دیا کہ "کیا بَراتی جب تک دُولھا اُن کے ساتھ ہے روزہ رکھ سکتے ہیں؟"(مرقس ۲:۱۹)۔ گویا مسیح کی آمد سے مریضان گناہ کے دلوں میں ایک زبردست اُمید اس بات کی جھلک رہی تھی کہ اب غم کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ہمارے گناہوں کو مٹانے والا ظاہر ہو گیا ہے۔ اب کیوں مایوس رہیں۔ "یسوع نے سُن کر اُن سے کہا تندرستوں کو حکیم درکار نہیں۔ بلکہ بیماروں کو میں راستبازوں کو نہیں بلکہ گنہگاروں کو بلانے آیا ہوں"(مرقس ۲:۱۷)۔ یہودی لوگ دیگر دینی رسوم کی طرح روزہ کی رَسم پر بھی ظاہرداری اور ریاکاری کی رنگ آمیزی کر چکے تھے۔ اس لئے خُدا نے اُنہیں یوں ملامت کی۔ اور روزہ کی اصل غایت کو اُن پر بدیں الفاظ ظاہر فرمایا۔ "کیا یہ وہ روزہ ہے جو مجھ کو پسند ہے؟ ایسا دن ہ اُس میں آدمی اپنی جان کو دکھ دے۔ اور اپنے سَر کو جھاؤ کی طرح جھکائے۔ اور اپنے نیچے ٹاٹ اور راکھ بچھائے؟ کیا تو اس کو روزہ اور ایسا دن کہے گا جو خُداوند کا مقبول ہو؟ کیا وہ روزہ جو میں چاہتا ہوں یہ نہیں کہ ظُلم کی زنجیریں توڑیں اور جوئے کے بندھن کھولیں۔ اور مظلوموں کو آزاد کریں۔ بلکہ ہر ایک جوئے کو توڑ ڈالیں؟ کیا یہ نہیں کہ تُو اپنی روٹی بھوکوں کو کھلائے اور مسکینوں کو جو آوارہ ہیں اپنے گھر میں لائے اور جب کسی کو ننگا دیکھے تو اُسے پہنائے۔ اور تُو اپنے ہم جنس سے روپوشی نہ کرے"(یسعیاہ ۵:۵۸-۷)۔ اور خُداوند مسیح نے بھی فرمایا۔ "اور جب تم روزہ رکھو تو ریاکاروں

کی طرح اپنی صورت اُداس نہ بناؤ۔ کیونکہ وہ اپنا مُنہ بگاڑتے ہیں تاکہ لوگ اُنہیں روزہ دار جانیں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا اَجر پاچکے بلکہ جب تو روزہ رکھے تو اپنے سر میں تیل ڈال اور مُنہ دھو۔ تاکہ آدمی نہیں بلکہ تیرا باپ جو پوشیدگی میں ہے تجھے روزہ دار جانے" (متی ۶:۱۶-۱۸)۔ انجیلِ مقدس میں روزہ کے متعلق نہ تو تاکید ہے اور نہ امتناع (روک) بلکہ عابد کی اپنی مرضی پر منحصر ہے کہ جب ایسے حالات پیش آئیں جن سے روزہ کی نوبت پہنچے تو روزہ رکھے۔ اور ایسا ہی ہوتا بھی ہے پر کسی خاص دن یا مہینہ یا موسم کی تخصیص (خصوصیت، محفوظ کرنا) کی کوئی ہدایت نہیں اور نہ ہوتی چاہئے۔ روزہ ایمانداروں کی تمام زندگی پر حاوی ہے۔ پس نئے عہد کی کامل شریعت میں آکر روزہ لازمی حکم نہ رہا اختیاری امر ہوگیا۔

عیدیں

یہودیوں کے لئے تین عیدیں مقرر تھیں۔ "تُو سال بھر میں تین بار میرے لئے عہد منانا" (خروج ۱۴:۲۳)۔ اور یہ عیدیں اُن کی گذشتہ تاریخ کے واقعات کی یادگاریں تھیں۔

(ا) پہلی عیدِ فسح تھی جو مارچ یا اپریل میں ہوتی تھی۔ یہ بنی اسرائیل کے مصر کی غلامی سے چھٹکارے کی یادگار تھی۔ اس موقع پر بُھنا ہوا گوشت بے خمیری روٹی اور کڑوی ترکاری کے ساتھ کھانے کے حکم تھا (خروج ۸:۱۲) اس کے بعد ہی سات روز تک خمیر کو گھروں سے جُدا کرنے کا حکم تھا۔ اسی واسطے اس کو عیدِ فطیر بھی کہا گیا۔ کڑوی ترکاری کھانے سے مراد یہ تھی کہ جب جب یہ عید مَنائی جائے مصر کے گذشتہ دُکھوں کو یاد کیا جائے۔ اور خمیر کو جُدا کرنے سے مراد تھی کہ گناہ وشرارت کو اپنے دلوں سے نکالیں۔ عین اُس وقت جب کہ عید فسح کا موقع تھا خُداوند مسیح نے اپنی جان تمام جہان کے اسیران گناہ کی خاطر دے کر انہیں شیطان اور گناہ کی شدید غلامی سے آزاد فرمایا۔ (عبرانیوں ۱۴:۲-۱۵) اور یہودی عیدِ فسح کا تکملہ مسیح کی قربانی میں ہوگیا۔ اور کڑوی ترکاری کھانے کی رسم اور بُھنا ہوا گوشت کھانے میں مسیح کے صلیبی دُکھوں اور اُس کے جسمانی ورُوحانی صدمات کی پیش گوئی موجود ہے۔ "پھر اُس نے روٹی لی اور شُکر کرکے توڑی اور یہ کہہ کر اُن کو دی کہ یہ میرا بدن ہے۔ جو تمہارے واسطے دیا جاتا ہے۔ میری یادگاری کے لئے یہی کیا کرو۔ اسی طرح کھانے کے بعد پیالہ یہ کہہ کر دیا کہ یہ میرے اُس خون میں نیا عہد ہے جو تمہارے واسطے بہایا جاتا ہے" (لوقا ۱۹:۲۲-۲۰)۔ جس طرح فسح کی عید یہود کے لئے مصر کی غُلامی سے آزاد ہونے کی یادگاری تھی۔ اُسی طرح پاک عشاء ربانی کی رسم ابلیس وگناہ کی غلامی سے چھٹکارے کی ابدی اور دائمی یادگار ٹھہری مقدس پولُس رسول فرماتا ہے۔ "پرانا خمیر نکال کر اپنے آپ کو پاک کرلو۔ تاکہ تازہ گندھا ہوا آٹا بن جاؤ۔ چنانچہ تُم بے خمیر ہو۔ کیونکہ ہمارا بھی فسح یعنی مسیح قربان ہوا۔ پس آؤ عید کریں نہ پرانے خمیر سے اور نہ بدی وشرارت کے خمیر سے بالکل صاف دلی اور سچائی کی بے خمیر روٹی سے" (۱۔ کرنتھیوں ۷:۵-۸) اور یوں ہو مختص بالقوم وزمان یادگار ایک عالمگیر اور دائمی روحانی عید میں منتقل ہوگئی۔

عید پنتی کوست یا ہفتوں کی عید

یہ عید مصر کی غُلامی سے چھٹکارے کے پچاسویں دن قائم ہوئی۔ ماہ مئی یا جون کے درمیان میں ہوتی تھی۔ یہ ایک طرف مصر سے آزادی کی اور دوسری طرف شریعت الٰہی کے دئے جانے کی یادگاری تھی۔ اس میں یہودی لوگ اپنے گیہوں اور جَو کے پہلے پھل خُدا کی لئے نذر کرتے تھے۔ یہ عید روح القدس میں گناہ سے آزاد ہونے کی گویا علامت تھی "کیونکہ جہاں خُدا کا روح ہے وہاں آزادی ہے" (۲۔ کرنتھیوں ۱۷:۳) چنانچہ خُداوند مسیح کے

صعود کے دس روز بعد روح القدس اسی عید کے موقع پر نازل ہوا تھا۔اور روحانی معنی میں پہلے پھل وہ تین ہزار مرد تھے جنہوں نے اپنے آپ کو خُدا کے لیے نذر کردیا(اعمال ۲: ۴۱)۔انجیل میں اپنی شخصیت کو نذر کرنے کا حکم ہے (رومیوں ۱۲: ۱؛ کلیسوں ۱: ۱؛ عبرانیوں ۱۳: ۱۵)۔عید پنتی کوست کا تکملہ رُوح القدس کے نزول پر ہوگیا اور روح القدس اُن پر آگ کی پھٹی ہوئی زبانوں کی صورت میں نازل ہوا۔اور وہ غیر زبانیں بولنے لگے۔ہر ایک اپنے اپنے ملک کی بولی وہاں سنتا تھا۔یہ گویا الٰہی اشارہ تھا کہ خُدا کا مذہب قومی دائرہ سے نکل کر تمام اہل لغت کا دستور العمل بن جائے۔اور پاک صحائف کے تراجم تمام دُنیا کی زبانوں میں ہو جائیں۔تاکہ سب قومیں بلا امتیاز و خصوصیت اُن سے فائز المرام (کامیاب، مراد پانے والا) ہو سکیں۔اور مذہبِ الٰہی تمام دُنیا کا مذہب ہو جائے۔

عیدِ خیام

یہ عید قوم یہود کی غریب الوطنی اور دشت نوردی کی یادگار تھی۔ستمبر یا اکتوبر میں ہوتی تھی۔اُن کی مسافرت کے ایام اور خیموں کی سکونت کے دوران میں فیوض (فیض کی جمع، نیکی، بھلائی) الٰہی و برکات سماوی کے نزول کی یادگار تھی۔آخر اُن کی دشت گردی اور بادیہ پیمائی (جنگل میں پھرنا) ملک کنعان کی مستقل سکونت پر منتج (نتیجہ) ہوئی۔اگرچہ اُن کی مسافرت کا نشانہ ملک کنعان تھا۔"مگر حقیقت میں وہ ایک بہتر، یعنی آسمانی ملک کے مشتاق تھے"(عبرانیوں ۱۱: ۱۶) اور تمام ایماندار وں بندوں کا بھی وہی نصب العین ہے۔مقدس پولُس رسول فرماتا ہے۔"جب تک ہم بدن کے وطن میں ہیں خُداوند کے ہاں سے جلاوطن ہیں"(۱۔کرنتھیوں ۵: ۶)۔

"کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ جب ہمارا خیمے کا گھر جو زمین پر ہے گرایا جائے گا۔تو ہم کو خُدا کی طرف سے آسمان پر ایک ایسی عمارت ملے گی جو ہاتھ کا بنایا ہوا گھر نہیں۔بلکہ ابدی ہے"(۲۔کرنتھیوں ۵: ۱) اور اُسی آسمانی وطن کی بابت خُداوند مسیح نے فرمایا۔"میرے باپ کے گھر میں بہت سے مکان ہیں۔۔۔۔کیونکہ میں جاتا ہوں تاکہ تمہارے لئے جگہ تیار کروں"(یوحنا ۱۴: ۲)۔مقدس پطرس رسول فرماتا ہے "اپنے آپ کو پردیسی اور مسافر جان کر اُن جسمانی خواہشوں سے پرہیز کرو جو رُوح سے لڑائی رکھتی ہیں"(۱۔پطرس ۲: ۱۱)۔ان تین بڑی عیدوں کے علاوہ دو اور چھوٹی عیدیں بھی تھیں۔ یعنی **عید پوریم** اور **عید تجدید**۔لیکن یہ خُدا کی مقرر کردہ نہ تھیں۔بلکہ ایک ملکہ آستر کے زمانے میں اور دوسری یہوداہ مکابی کے وقت میں یہودیوں نے خود مقرر کرلی تھیں۔ان دونوں موخرالذکر عیدوں کا یروشلیم کی ہیکل سے کوئی تعلق نہ تھا۔یہ سب عیدیں جن واقعات کی یادگاریں تھیں وہ صرف بنی اسرائیل کی تاریخ سے متعلق تھے۔اور تمام دُنیا کے ساتھ اُن کا کوئی تعلق نہ تھا۔اس لئے وہ تمام دُنیا کا دستور العمل ہونے کے قابل نہ تھیں۔اس لئے وقت پورا ہونے اور اپنے حد رواج کے اختتام پر وہ بند ہو گئیں۔اور ہیکل کے بغیر اُن پر عمل کرنا ہی ناممکن تھا۔اس لئے جب ہیکل نہ رہی تو عیدیں کیسے وہ سکتی تھیں۔خُداوند مسیح کی قربانی اور محبت کا تعلق تمام دُنیا کے ساتھ ہے(انجیل یوحنا ۱۶: ۳؛ ۱۔یوحنا ۲: ۲) لہٰذا اُس کے متعلق تمام واقعات کا تعلق عام طور پر تمام افراد عالم کے ساتھ ہے۔

طریقِ عبادت

ہم پیچھے کئی بار ذکر کر چکے ہیں کہ یہودی مذہب کا مرکز ہیکل تھی۔جس میں اُن کی تمام مذہبی رسوم اور عبادت قومی صورت میں انجام پاتی تھیں۔اور خُدا کا یہ حکم تھا کہ "اگر تم غیر معبودوں اور بتوں کی پرستش کرو گے اور نیک نیتی سے میری عبادت بجانہ لاؤ گے۔تو میں اِس ہیکل کو گرادوں گا

اور تمہیں اس زمین سے نکال دوں گا"(۱۔سلاطین ۶:۹-۹)۔اور اس انتظام سے اُن کے اندر عبادت الٰہی کی خالص رُوح پیدا کرنا مقصود تھا۔اور جب وہ خُدا کی خالص عبادت کے کھنڈرات پر بت پرستی کی عمارت اُٹھانے لگے۔اور غیر معبودوں کی طرف مائل ہوئے۔تو خُدا نے بھی اُنہیں ترک کردیا۔ اور ایک بُت پرست کسدی بادشاہ نبوکدنضر کے ذریعے اسیر ہوکر بابل لے جائے گئے۔اور مقدس ہیکل بھی برباد کی گئی(یرمیاہ ۱۳:۵۲)ایماندار یہودی اُس غریب الوطنی اور اسیری کے زمانہ میں بھی خُدا کو نہ بھولے اور اکثر تین مرتبہ دن میں یروشلیم کی طرف رخ کرکے نماز کیا کرتے تھے۔"اور جب دانی ایل نے معلوم کیا کہ اُس نوشتہ پر دستخط ہوگئے۔تو اپنے گھر میں آیا۔اور اپنی کوٹھڑی کا دریچہ جو یروشلیم کی طرف تھا کھول کر دن میں تین مرتبہ حسب معمول گھٹنے ٹیک کر خُدا کے حضور دُعا اور اُس کی شکر گذاری کرتا رہا"(دانی ایل ۶:۱۰؛۱۔سلاطین ۸:۴۸)اس بیان سے بخوبی معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ ہیکل کے رُخ پر تین دفعہ دن میں نماز پڑھتے تھے۔**اور بانی اسلام نے رُخ کعبہ پر نماز گزارنا یہودیوں سے سیکھا۔اور کئی ماہ تک بیت المقدس(ہیکل)کے رُخ پر نماز ادا کرتے اور کرواتے رہے۔اور یہود کی نماز عبرانی زبان میں ہوتی تھی۔اہلِ اسلام بھی عربی زبان کے سوا اور کسی زبان میں نماز پڑھنا جائز نہیں سمجھتے۔اس سے اِسلام کا ایک قومی مذہب ہونا ظاہر ہے۔** بھلا اہلِ عرب تو اپنی ملکی زبان عربی میں نماز پڑھیں۔دیگر ممالک کے مسلمان تو عربی نہیں ہیں۔ اُن پر عربی زبان کی قید لگانا کیوں ضروری سمجھا جاتا ہے؟ کیا خُدا سوائے عربی زبان کے اور کوئی زبان نہیں جانتا؟ مسیحیت کی عمومیت اور عالمگیری کی یہ کیسی بین دلیل ہے کہ مسیحی ہر زبان میں نماز پڑھ سکتے ہیں۔اور تمام دُنیا کی زبانوں میں انجیل کا رواج پایا جاتا ہے۔یہ صرف مقلدان(پیرو)خُداوند کی کوئی اپنی ایجاد کردہ تجویز نہ تھی جس پر اُنہوں نے عمل کرلیا۔بلکہ رُوح القدس کی ہدایت کے ماتحت انجیلِ مقدس کے دُنیا بھر کی زبانوں میں ترجمے کئے گئے (اعمال ۲:۳-۸)اور زبان کی تخصیص(خصوصیت)کسی مذہب کے عالمگیر ہونے کی محدود مانع(روکنے والا،ممانت)ہے۔اسی واسطے مقدس پولُس رسول بیگانی زبان میں دُعا مانگنے اور کلام کرنے کو معیوب ٹھہراتا ہے(۱۔کرنتھیوں ۱۴:۱-۲۳)۔یہودی ہیکل کے رُخ پر نماز پڑھتے تھے اور اہل اسلام کعبہ کے رُخ پر۔لیکن خُداوند مسیح نے تخصیص جہت وسمت کا جھگڑا ہی ختم کردیا۔جس میں ظاہر داری کا بھی امکان نہیں رہتا(ملاحظہ ہو متی ۶:۵-۶)یعنی کوٹھڑی کا دروازہ بند کرکے پوشیدگی میں دُعا مانگنے کا حکم دیا۔شریعت موسوی پر عمل درآمد کے لئے ہیکل کا وجود لازمی تھا۔اور بغیر ہیکل کے یہودی مذہب ایک قالب بے جان کی مثال تھا۔خُداوند مسیح چونکہ عالمگیر مذہب کا بانی ہوکر آیا تھا۔اس لئے جب ایک دفعہ اُس کے شاگردوں نے ہیکل کی زیارت کے لئے اُس سے سوال کیا تو اُس نے فرمایا۔"میں تُم سے سچ کہتا ہوں کہ یہاں کسی پتھر پر پتھر باقی نہ رہے گا جو گرایا نہ جائے گا"(متی ۲:۲۴)۔اور پھر سامری عورت نے آپ سے کہا کہ۔"ہمارے باپ دادوں نے اس پہاڑ پر پرستش کی۔اور تُم کہتے ہو کہ وہ جگہ جہاں پرستش کرنی چاہیئے یروشلیم میں ہے۔یسوع نے اُس سے کہا اَے عورت میری بات کا یقین کر کہ وہ وقت آتا ہے کہ تُم نہ تو اس پہاڑ پر باپ کی پرستش کروگے اور نہ یروشلیم میں۔۔۔ مگر وہ وقت آتا ہے بلکہ اب ہی ہے کہ سچے پرستار باپ کی پرستش رُوح اور سچائی سے کریں گے"(یوحنا ۲۰:۴-۲۳)۔اور ایمانداروں کے دلوں کو خُدا کا مقدس(ہیکل) کہا گیا(۱۔کرنتھیوں ۱۶:۳-۱۷)۔اور آپ کے قول کے مطابق ہیکل سلیمانی(۷۰)عیسوی میں برباد ہوگئی اور مذہب الٰہی خصوصیت کی قیود(قید) سے آزاد ہوگیا تاکہ کل دُنیا کا دستور العمل بن سکے۔

ہم بالتفصیل دِکھا چکے کہ کس طرح اور کن معنوں میں خُداوند مسیح نے شریعت موسوی کی تکمیل فرمائی۔اور احکام خاص کس طرح اور کیوں متروک العمل ہوگئے۔رد نہیں کئے گئے بلکہ اُن کی ضرورت نہ رہی۔شباب کی آمد سے طفلی رد نہیں ہوجاتی بلک شباب کی کمالیت میں گم ہوجاتی ہے۔جب بنیاد پر ردے لگا کر عمارت کو انجام تک پہنچایا جاتا ہے تو بنیاد رد نہیں ہوجاتی بلکہ چھپ جاتی ہے۔توریت کی ناکامل شریعت مسیح کی کامل شریعت(یعقوب ۱:۲۵)کی آمد پر رد و باطل نہیں ہوئی بلکہ اُس کی کمالیت میں چھپ گئی۔اس واسطے کامل اور عالمگیر شریعت کے رواج پانے سے موسوی ناکامل شریعت

ایسے ہی غائب ہوگئی جیسے آفتاب کے طلوع ہونے پر چراغ گل کردیا جاتا ہے۔ خُداوند مسیح نے شرعِ الٰہی کے حقیقی اور باطنی معنوں کو روشن کردیا۔ اور اُس کے قالب میں ایک نئی رُوح پھونک کر اور اُس کے حجاب خصوصیت کو اُتار کر عمومیت کے وسیع میدان میں بے نقاب کرکے اور تمام دُنیا کے لئے نور ہدایت بنا کر رکھ دیا ہے۔ اب اس متروک شُدہ شرع موسوی احکام خاص پر عمل کرنے کے خلاف انجیل مقدس کی تعلیم ملاحظہ ہو۔

"مگر اب جو تم نے خُدا کو پہچانا۔ بلکہ خُدا نے تُم کو پہچانا تو اُن ضعیف اور نکمی ابتدائی باتوں کی طرف کس طرح پھر رجوع ہوتے ہو جن کی دوبارہ غلامی کرنا چاہتے ہو۔ تُم دِنوں اور مہینوں اور مقررہ وقتوں اور برسوں کو مانتے ہو" (گلتیوں ۹:۴-۱۰)۔ "پس کھانے پینے یا عید یا نئے چاند یا سبت کی بابت کوئی تُم پر الزام نہ لگائے۔ کیونکہ یہ آنے والی چیزوں کا سایہ ہیں۔ مگر اصل چیزیں مسیح کی ہیں" (کلسیوں ۱۶:۲-۱۷)۔ "جب تُم مسیح کے ساتھ دُنیوی ابتدائی باتوں کی طرف سے مر گئے تو پھر اُن کی مانند جو دُنیا میں زندگی گزارتے ہیں۔ آدمیوں کے حکموں اور تعلیموں کے موافق ایسے قاعدوں کے کیوں پابند ہوتے ہو کہ اسے نہ چھونا اُسے نہ چکھنا اور اُسے ہاتھ نہ لگانا" (کلسیوں ۲:۲-۲۱) اور اُس عالمگیر نئے عہد کی آمد اور اُس کی شرع کامل کے رواج پانے پر "نہ یونانی رہا نہ یہودی۔ نہ ختنہ نہ نامختونی نہ وحشی نہ سکوتی۔ نہ غلام نہ آزاد صرف مسیح سب کچھ اور سب میں ہے" (کلیسوں ۳:۱۱)۔ جیسے ایک معمار جب امکان کی محراب بناتا ہے اور اُس کے نیچے اینٹوں کا ایک عارضی سہارا لگاتا ہے اور جونہی وہ محراب پختہ ہو جاتی ہے وہ ماتحت قالب کو گرا دیتا ہے۔ اسی طرح توریت کے احکام خاص کامل مذہب اور کامل شریعت کے قیام پر متروک العمل ہوگئے۔

اَحکام عام

اخلاقی شریعت کے احکامِ عشرہ جو خُدا نے موسیٰ کو لکھے لکھائے سونپے (خروج ۱۸:۳۱) اُنہیں کو احکامِ عام کہا جاتا ہے۔ اور یہ احکام ہیں جو ہر زمانے میں متبوع (سردار، پیروی کیا گیا) اور مطاع (اطاعت کیا گیا، سردار) رہے اور رہیں گے۔ یہ احکام خاص کا مرکز اور رُوح رواں تھے۔ اور اِن میں تمام دُنیا کا دستور العمل ہونے کی کامل صلاحیت موجود ہے۔ جس طرح اِنسان کی جسمانی زندگی کے لئے خُدا تعالیٰ کے عطا کردہ طبعی و فطری سامان کافی ووافی ہیں۔ اسی طرح ہماری روحانی اور مجلسی زندگی کے لئے یہ احکام نہایت ضروری اور مفید ہیں۔ اِن اَحکام کا بیان (خروج ۱:۲۰-۱۷) اور مفصل تشریح (احبار باب ۱۹) میں موجود ہے۔ اور خُداوند مسیح نے ان کا خلاصہ بدیں الفاظ پیش کیا ہے۔ "خُداوند اپنے خُدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل سے محبت رکھ۔ بڑا اور پہلا حکم یہی ہے۔ اور دوسرا اس کی مانند یہ ہے کہ اپنے پڑوسی سے اپنے برابر محبت رکھ۔ انہی دو حکموں پر تمام توریت اور انبیاء کے صحیفوں کا مدار ہے" (متی ۳:۲۷-۲۲-۴۰)۔ جیسے توریت کے احکام خاص ظاہر بات سے تعلق رکھتے تھے۔ اُسی طرح احکام عام اِنسان کی باطنی زندگی کے ساتھ وابستہ ہیں۔ مسیح کی تمام تعلیم باطنیت سے متعلق ہے۔ تمام امور ان ربانی اور داعیان حقانی ایک ہی قومی مرکز کے گرد چکر لگاتے رہے۔ اور اپنی قومی حدود سے نہ تو وہ خود آگے بڑھے اور نہ ہی اُنہیں خُدا کی طرف سے ایسا اختیار ہی دیا گیا تھا۔ لیکن عہدِ جدید کے بانی ومبدا نے تمام دُنیا کو اپنا دائرہ عمل بنایا۔ اور توریت کے قومی مذہب کی معیاد کو یوحنا تک محدود ٹھہرایا۔ کیونکہ سب نبیوں اور توریت نے یوحنا تک نبوت کی (متی ۱۳:۱۱)۔ "شریعت اور انبیاء یوحنا تک رہے اُس وقت سے خُدا کی بادشاہت کی خوشخبری دی جاتی ہے" (لوقا ۱۶:۱۹) اور شریعت اخلاقی (احکام عام) کے متعلق فرمایا۔ "آسمان اور زمین کا ٹل جانا شریعت کے ایک نقطے کے مٹ جانے سے آسان ہے" (لوقا ۱۷:۱۶، متی ۱۸:۵-۱۹) اور جس طرح ایک گورنر کے اختیارات کا زور صرف ایک ہی صوبے تک محدود ہوتا ہے۔ اسی طرح انبیائے توریت کا اختیار اور منصب قوم یہود سے باہر اثر انداز نہ ہو سکتا تھا اور نہ ہوا اُن کا یہ سلسلہ یوحنا

اصطباغی تک اُسی خصوصیت سے چلا آیا۔ ایک شہنشاہ کے اختیارات ایک گورنر کی بہ نسبت بدر جہا زیادہ ہیں۔ چنانچہ اسی طرح عالمگیر عہد کے بانی کے اختیارات اور ذاتی قابلیت انبیاء عہدِ عتیق سے بہت زیادہ ہونی چاہئے۔ اور در حقیقت ایسا ہی ہے۔ آپ نے اپنے آپ کو تمام انبیاء سابقہ سے بہر صورت افضل ظاہر کیا۔ مثلاً ''یہاں وہ ہے جو یونس سے بھی بڑا ہے'' (متی ۱۲: ۴۱)۔ ''یہاں وہ ہے جو سلیمان سے بھی بڑا ہے'' (آیت ۴۲)۔ داؤد سے بڑا ہونا (متی ۲۲: ۴۲-۴۵)۔ ''یہاں وہ ہے جو ہیکل سے بھی بڑا ہے'' (متی ۱۲: ۶)۔ ''پیشتر اس سے کہ ابراہام پیدا ہوا میں ہوں'' (یوحنا ۸: ۵۸) موسیٰ پر فضیلت (عبرانیوں ۳: ۳-۶)۔ فی الحال ہم مسیح کے فضائل کے متعلق ان چند امثلہ پر اکتفا کرتے ہیں۔ کسی مُناسب مقام پر مفصل بیان کریں گے۔

واضح ہو کہ خُداوند مسیح نے اپنی مختصر سی زمینی زندگی میں عالمگیر مذہب کی صرف بنیاد ہی رکھی۔ اور جس طرح توریت کا زمانہ مذہب کی ابتدائی حالت کا زمانہ تھا۔ اُسی طرح مسیح کا زمانہ مذہب الٰہی کی وسطی حالت کا زمانہ تھا۔ اور جس طرح توریت کے تمام انبیاء مسیح کی آمد اور نئے عہد کی عالمگیر وسعت کی خبر دے گئے تھے۔ اُسی طرح خُداوند مسیح بھی اپنے بعد ایک دوسرے مددگار کے نزول وظہور کی خبر دے گئے۔ ''مجھے تُم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنی ہیں۔ مگر اب تُم اُن کی برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ یعنی سچائی کا رُوح آئے گا تو تُم کو تمام سچائی کی راہ دِکھائے گا۔۔۔۔ وہ میرا جلال ظاہر کرے گا۔ اس لئے کہ مجھ ہی سے حاصل کر کے تمہیں خبریں دے گا'' (یوحنا ۱۲: ۱۲-۱۴؛ ۱۵: ۲۶) اور مذہب الٰہی کو انتہائی کمالیت تک پہنچانا رُوح القدس کا کام تھا۔ جس کا خُداوند مسیح نے وعدہ فرمایا تھا۔ مذہب کی اِرتقائی حیثیت سے توریت کا زمانہ ابتدائی مسیح کی زمینی زندگی کا زمانہ وسطی، اور رُوح القدس کا زمانہ انتہائی کمالیت کا زمانہ ہے۔ خُداوند نے اپنی زمینی زندگی میں عالگیر مذہب کی صرف بنیادیں رکھیں۔ اور کسی قدر خصوصیت سے نکال کر عمومیت میں بدل دیا۔ مثلاً یہودی قوم تمام دیگر غیر اقوام کا نامختون بے دین۔ لامذہب اور گمراہ سمجھ کر اُن سے قطعاً کوئی تعلق نہ رکھتی تھی۔ اور بالخصوص یہودی لوگ سامریوں سے بہت زیادہ متنفر (نفرت کرنے والا) تھے اور اُنہیں حقیر اور ناچیز جانتے تھے۔ مگر مسیح نے سامریوں کے ساتھ ہمیشہ نیک سلوک کیا۔ اور اُن کی قدر کی۔ یہود کو اُن کی ظاہری داری، خود پرستی اور تعصّب پر بارہا ملامت کی۔ ایک رَحم دِل سامری کی تعریف کی اور مغرور کاہن اور خود سر لاوی کو ملامت کی (لوقا ۱۰: ۲۵-۳۷) پھر ایک دفعہ دَس کوڑھی آپ سے شفا پا کر گئے۔ اُن میں سے ایک نے جو سامری تھا لوٹ کر خُداوند کی شکر گزاری کی۔ آپ نے اُس کے ایمان کی تعریف کی (لوقا ۱۷: ۱۵-۱۹)۔ ایک دفعہ جب سامریوں نے آپ کو اپنے گاؤں میں ٹکنے نہ دیا اور شاگردوں کا پارہ طیش بہت چڑھ گیا اور اُس گاؤں پر آسمان سے آگ برسانا چاہتے تھے تو آپ نے شاگردوں کو جھڑکا اور فرمایا ''ابن آدم لوگوں کی جان برباد کرنے نہیں بلکہ بچانے آیا ہے'' (لوقا ۹: ۵۱-۵۶) اور پھر (یوحنا ۴: ۷-۲۶) میں سامری عورت کا مشہور قصہ سب جانتے ہیں کہ مسیح نے کیسے محبت سے اُس کے ساتھ برتاؤ کیا تھا۔ اور سُور فنیکی عورت جو غیر قوم تھی مسیح کے پاس آئی۔ آپ نے اُس کی مراد کو پورا کرنے کے علاوہ اُس کے ایمان کی تعریف کی (متی ۲۱: ۱۵-۲۸)۔ اور ایک دفعہ جب ایک غیر قوم صوبہ دار کے نوکر کو آپ نے شفا دی تو اُس صوبہ دار کے ایمان کی بدیں الفاظ تعریف کی۔ میں نے ایسا ایمان اسرائیل میں بھی نہیں پایا (لوقا ۷: ۹)۔ اور آپ نے ایک جگہ جو انگوری باغ کے ٹھیکیداروں کی تمثیل کہی ہے۔ اُس میں باغ سے مراد یہودی قوم اور ٹھیکیداروں سے مراد اُس کے رہبر اور کرتادھر تا یعنی فقیہہ اور فریسی۔ اور باغ کو اُن ٹھیکیداروں سے چھین کر اَوروں کو دے دینے سے مراد غیر اقوام کو دینے سے ہے۔ یہ مذہب کی عالمگیر ہی کی ایک تمثیلی پیش گوئی تھی (لوقا ۲۰: ۹-۱۸؛ متی ۲۱: ۳۳-۴۵)۔ پھر آسمان کی بادشاہت کو رائی کے دانہ اور خمیر سے تشبیہ دے کر مسیحیت کی عمومیت وہمہ گیری کی خبر دی (متی ۱۳: ۳۱-۳۳) غرض یہ کہ مسیح نے ہر پہلو اور ہر صورت سے شریعت کو کامل کیا۔ اور عالمگیر مذہب کی بنیادیں پختہ کر کے اُن پر عملی طور سے کام بھی کیا۔ اگرچہ اس عظیم مہم کی راہ میں حاسد اور مخالف طاقتیں دیوار بن کر حائل ہوئیں۔ مگر آپ کے عزم آہنی (لوہے کی طرح مضبوط) نے اپنی مقدس خدمت کے لے اس خارزار میں راستہ تلاش کر ہی لیا۔ اور بے پناہ نفرت کے جنوبی دھارے جو

یہود کے اعصاب میں تیر رہے تھے۔ اور مخالف ومنافرت کا مہیب سمندر جواُن کے اعماق قلب میں طوفان خیز تھا آپ کے لئے پائے استقلال کو شل (بے حس) نہ کر سکا۔ اگرچہ وہ ہمیشہ آپ کی شدید مصیبت مظلومیت اور موت میں اپنے سارااقبال کی فال نکالتے (شگون ہونا، غیب کی بات معلوم کرنا) تھے۔ اوراُس نور کے سامنے اپنی پوشیدہ ذلتوں کو محجوب (پوشیدہ) مصائب ونقائص کو بے نقاب دیکھ کراُس کو بجھا دینے کے ہر وقت درپے رہتے تھے۔ اوراپنی اِن مکروہ مساعی (کوششیں) میں کامیاب بھی ہوئے لیکن پھر بھی ''جس پتھر کو معماروں نے رَد کیاوہی کونے کے سرے کا پتھر ہوا''۔ اُس نئے عہد کے بانی کونئے عہد کی بنیاد رکھنے کے لئے اپنی جان دینی پڑی۔ ''اس لئے پہلا عہد بھی بغیر خون کے نہیں باندھا گیا'' (عبرانیوں ۱۸:۹ بمطابق خروج ۱۸: ۲۴) اور شریعتِ موسوی کی تکمیل کا تمام تردار ومدار آپ کی پاک اور بے عیب عالمگیر قُربانی پر تھا۔ اسی واسطے آپ مذہب الٰہی کو عالمگیری کی انتہائی حدود تک اپنی زمینی زندگی میں پہنچانہ سکے۔ بلکہ انتہائی کمالیت کی ابتداء آپ کی موت قیامت اور صعود کے بعد ہوئی۔ کیونکہ آپ کی قربانی کے بغیر شریعتِ عتیقہ (قدیم شریعت) کامل نہ ہوسکتی تھی۔ اور وہ آپ کی صلیب پر کامل ہوئی۔ اور آپ نے کہا'' پورا ہوااور سر جھکا کر جان دے دی'' (یوحنا ۹:۳۰) اور قبر دعوت پر کامل فتح پاکر اپنے حواریوں کو یہ وصیت کی کہ ''آسمان اور زمین کا کل اختیار مجھے دیا گیا ہے۔ پس تُم جاکر سب قوموں کو شاگرد بناؤ۔ اوراُنہیں باپ اور بیٹے اوررُوح القدس کے نام پر بپتسمہ دو۔ اوراُنہیں یہ تعلیم دو کہ ان سب باتوں پر عمل کریں جن کا میں نے تُم کو حکم دیا۔ دیکھو میں زمانے کے آخر تک ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں'' (متی ۱۸:۲۸-۲۰)۔ ''اوراُس نے اُن سے کہا کہ تُم تمام دُنیا میں جاکر ساری خلق کے سامنے انجیل کی منادی کرو۔ جوایمان لائے اور بپتسمہ لے وہ نجات پائے گا۔ اور جو ایمان نہ لائے وہ مجرم ٹھہرایا جائے گا'' (مرقس ۱۵:۱۶-۱۶) اوراُن سے کہایوں لکھا ہے کہ مسیح دُکھ اُٹھائے گا۔ اور تیسرے دن مردوں میں سے جی اُٹھے گا۔ اور یروشلیم سے شروع کرکے ساری قوموں میں توبہ اور گناہوں کی معافی کی منادی اُس کے نام سے کی جائے گی (لوقا ۴۶: ۲۴-۴۸)۔

رُوح القُدس کا نزول اور مذہب الٰہی کی انتہائی کمالیت

ہم پیچھے دکھا چکے کہ عہدِ عتیق نے مسیح کی آمد اور نئے عہد کی عمومیت کی خبریں دیں۔ چنانچہ وقت پورا ہونے پر خُداوند مسیح آیا۔ اور اُس نے اُسی مذہب کی ابتدائی حالت سے اُٹھا کر وسطی حالت تک پہنچایا۔ اور اپنی جان تمام جہان کے گناہوں کے لئے دے کر شریعت کی تکمیل فرمائی۔ لیکن دُنیا کی حدود تک اُس مذہب کو وسعت نہ دے سکے۔ بلکہ آپ نے بھی اپنے ایک اور قائم مقام یعنی رُوح القدس کے نزول کی خبر اپنے شاگردوں کو دی۔ اور مذہب کو وسطی حالت سے نکال کر انتہائی کمالیت تک پہنچانا اپنے ہونے والے قائم مقام کے لئے چھوڑ گئے۔ اور زندہ ہو کر اپنے شاگردوں کو یہ وصیت کی۔ "اور دیکھو جس کا میرے باپ نے وعدہ کیا ہے میں اُس کو تُم پر نازل کروں گا۔ لیکن جب تک عالمِ بالا سے تُم کو قوت کا لباس نہ ملے اس شہر میں ٹھہرے رہو" (لوقا ۴۹:۲۴)۔ اور قبر سے زندہ ہو کر چالیس دن تک اُن پر طرح بہ طرح ظاہر ہوتے رہے۔ لیکن صعود فرمانے سے پہلے پھر اُسی خبر کو دہرایا۔ "لیکن جب رُوح القدس تُم پر نازل ہوگا تو تُم قوت پاؤ گے اور یروشلیم اور تمام یہودیہ اور سامریہ میں بلکہ زمین کی انتہا تک میرے گواہ ہوگے" (اعمال ۸:۱)۔ آپ کے ان الفاظ سے خوب روشن ہے کہ آپ نے مذہب الٰہی کی ہمہ گیر وسعت کو رُوح القدس کے نزول کے ساتھ مشروط ٹھہرایا۔ اور حسب وعدہ اپنے صعود کے دس روز بعد ہی رُوح القدس کو اُن پر عید پنتی کوست کا دن آیا تو وہ سب ایک جگہ جمع تھے۔ "کہ یکایک آسمان سے ایسی آیا جیسے زور کی آندھی کا سناٹا ہوتا ہے۔ اُس سے سارا گھر جہاں وہ بیٹھے تھے گونج گیا۔ اور اُنہیں آگ کے شعلے کی سی پھٹتی ہوئی زبانیں دکھائی دیں اور اُن میں سے ہر ایک پر آٹھہریں۔ اور وہ سب رُوح القدس سے بھر گئے اور غیر زبانیں بولنے لگے۔ جس طرح رُوح نے انہیں بولنے کی طاقت بخشی" (اعمال ۱:۲-۴) اور دیگر غیر مسیحی لوگوں نے جو لاکھوں کی تعداد میں اُس وقت وہاں عید کے لئے جمع تھے یہ تمام ماجرا دیکھا۔ "اور سب حیران اور متعجب ہو کر کہنے لگے۔ دیکھو یہ بولنے والے کیا سب گلیلی نہیں؟ پھر کیونکر ہم سے ہر ایک اپنے اپنے وطن کی بولی سنتا ہے؟" (اعمال ۷:۲-۸)۔ اور رُوح القدس نے نازل ہو کر اُسی وقت لوگوں کی ایک کثیر تعداد مسیح پر ایمان لے آئی۔ "پس جن لوگوں نے اُس کا کلام قبول کیا اُنہوں نے بپتسمہ لیا اور اُسی روز تین ہزار آدمیوں کے قریب اُن میں مل گئے" (اعمال ۴۱:۲)۔ اور مقلدان (پیرو) مسیح کی تعداد میں اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔ "مگر کلام کے سننے والوں میں سے بہتیرے ایمان لائے۔ یہاں تک کہ مردوں (عورتوں کا شمار شامل نہیں) کی تعداد پانچ ہزار کے قریب ہو گئی" (اعمال ۴:۴)۔ اور رُوح القدس نے جو اُن کو ملک ملک کی غیر زبانیں بولنے کی قوت بخشی۔ تو یہ گویا خُدا کا ایک صاف و صریح اشارہ اس امر کا تھا کہ کلامِ مقدس کے ترجمے دُنیا کی تمام زبانوں میں کردئے جائیں تاکہ کوئی بشر خُدا کی رُوحانی برکتوں سے محروم نہ رہ جائے۔ چنانچہ خُدا کی اسی ہدایت کے ماتحت مسیح کی شمع عشق کے پروانوں کے انجیل جلیل کے ترجملے دُنیا کی ہر زبان میں کردئے۔ اور یسعیاہ نبی کی وہ پیش گوئی پوری ہوئی کہ۔ "وہ وقت آتا ہے کہ میں تمام قوموں اور اہل لغت کو جمع کروں گا۔ اور وہ آئیں گے اور میرا اجلال دیکھیں گے" (یسعیاہ ۱۸:۶۶)۔ اور جس طرح یہودیوں نے خُداوند مسیح کو دُکھ دیا اور ستایا تھا اُسی طرح اب اُس کے شاگردوں کو ستانے لگے۔ اُن کو قیدوں میں ڈالنے اور طرح طرح سے ایذائیں دینے لگے۔ تاکہ وہ مسیح کے نام کی منادی بند کردیں۔ لیکن مسیح کی محبت کا شعلہ اُن کے دل کے مذبح پر اور بھی تیزی سے جلنے لگا۔ اور سب سے پہلے مسیح کے خادم ستفنس نے جام شہادت نوش کیا۔ تاہم خُدا کا کلام پھیلتا رہا۔ اور یروشلیم میں شاگردوں کا شمار بہت ہی بڑھتا گیا۔ اور کاہنوں کا بڑا گروہ اس دین کے تحت میں ہو گیا (اعمال ۷:۶)۔ "اور وہ ہیکل میں اور گھروں میں ہر روز سکھانے اور اس بات کی خوشخبری دینے سے کہ یسوع ہی مسیح ہے باز نہ آئے (اعمال ۴۲:۵)۔

مسیحیت غیر اقوام میں

آخر وہ وقت آگیا کہ یروشلیم سے شروع کرکے ساری قوموں میں توبہ اور گناہوں کی معافی کی منادی اُس کے نام سے کی جائے (لوقا ۲۴: ۴۷) چنانچہ شاگردوں نے یروشلیم میں اپنی خدمت کو شروع کیا۔ اور رُوح القدس کی طاقت سے معمور ہو کر بہت کامیابی حاصل کی۔ اب وہ یروشلیم سے باہر نکلتے ہیں۔ سامریہ میں جاتا ہے اور سامری لوگ اُس کے کلام سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں (اعمال ۸:۴-۸) پطرس بھی غیر قوموں میں منادی کرنے لگا اور اُن پر رُوح القدس نازل ہوا (اعمال ۴۵:۱۰) اور اُنہوں نے بپتسمہ لیا (آیت ۴۸)۔ مگر جب رسولوں نے غیر اقوام کی طرف رُخ کیا اور اُنہیں خُدا کی بادشاہت کشادہ دلی سے شامل کرنے لگے تو یہودی مسیحی اُن پر اعتراض کرنے لگے اور اُن میں بڑی بحث ہوئی (اعمال ۱:۱۱-۲) اور پطرس نے اُن کو یوں جواب دیا۔ پس جب خُدا نے اُن کو بھی وہی نعمت دی جو ہم کو خُداوند یسوع مسیح پر ایمان لا کر ملی تھی تو میں کون تھا کہ خُدا کو روک سکتا۔ وہ یہ سُن کر چپ رہے اور خدا کی بڑائی کرکے کہا۔ تو بے شک خُدا نے غیر قوموں کو بھی زندگی کے لئے توبہ کی توفیق دی ہے" (اعمال ۱۷:۱۱-۱۸) اور جب یہودیوں کی مخالفت و مخاصمت اور بُغض و حسد کا پیمانہ لبریز ہو کر چھلکنے لگا تو "پولُس اور برنباس دلیر ہو کر بولے۔ کہ ضرور تھا خُدا کا کلام پہلے تمہیں سُنایا جائے۔ لیکن چونکہ تم اُسے رد کرتے ہو اور اپنے آپ کو ہمیشہ کی زندگی کے ناقابل ٹھہراتے ہو۔ تو دیکھ ہم غیر قوموں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں" (اعمال ۴۶:۱۳) ۔ چنانچہ اُس وقت سے رسول دلیرانہ طور پر غیر اقوام میں مسیح کی گواہی دینے گئے اور پولُس رسول اپنے آپ کو غیر قوموں کا رسول کہتا ہے (اعمال ۶:۱۸ ؛رومیوں ۱۱: ۱۳؛ گنتی ۸: ۲-۹؛افسیوں ۱: ۴،۸)۔ اور خُداوند مسیح کا وہ قول پورا ہو کہ "جب رُوح القدس تم پر نازل ہوگا تو تم قوت پاؤ گے۔ اور یروشلیم اور تمام یہودیہ اور سامریہ میں بلکہ زمین کی انتہا تک میرے گواہ ہو گئے" (اعمال ۸:۱)۔ اور مذہب الہٰی کی ہمہ گیر وسعت اور انتہائی کمالیت کا زمانہ رُوح القدس کے نزول سے لے کر قیامت کے دن تک وسیع ہے۔ چنانچہ پہلی صدی عیسوی سے لے کر آج تک جو عالمگیر ترقی مسیحیت نے کی ہے وہ کسی منطق دلیل سے ثابت کئے جانے کی محتاج نہیں۔ عیاں راچہ بیاں۔ قالبِ دُنیا کے اعضائے رئیسہ (دماغ، جگر وغیرہ) اسی کے حلقہ بگوش ہیں۔ علمی، عقلی، مذہبی اور مالی ہر قسم کی ترقی بھی اُنہی کے ہاتھوں کو چوم رہی ہے۔ اور ہر ملک و قوم میں مسیح کے گواہ تمام زبانوں میں انجیل مقدس کا اشتہار دے رہے ہیں۔ خُداوند تعالیٰ نے اپنے مذہب کی حقانیت اور صداقت کو تمام رُوئے زمین پر پھیلانے کے لئے اپنی قدرت کاملہ وحکمت بالغہ سے ذرائع و وسائل بھی ایسے زبردست مہیا کر دے ہیں کہ اُس کی نشرواشاعت باآسانی تمام ہو سکے۔ مثلاً اُس نے اپنے خادموں کو پریس اور مطابع ایجاد کرنے کی حکمت بخشی۔ تاکہ وہ انجیل کو ہر زبان میں بہ تعداد کثیر تھوڑے عرصہ میں چھاپ کر تیار کریں۔ اور موٹر ، ریل گاڑی اور ہوائی جہاز اور بحری جہاز وتار برقی کے ذریعے انجیلِ مقدس دُنیا کے ہر حصے میں پہنچا سکیں۔ ذرائع آمد و رفت کی آسانیاں، اور پریس کی اختراع کچھ ایسے خُداداد عجیب وغریب سامان ہیں کہ جن سے بڑھ کر انجیل کی ترویج وتوسیع اشاعت کے معاون ملنے محال ہیں۔ ریڈیو کی دریافت نے مبشرانِ کلام کے حوصلوں کی اور بھی بلند کر دیا ہے۔ یہ ہیں وہ ذرائع جو مسیحیت کی ترویج اور تشہیر عامہ کے لئے خُدا تعالیٰ کی حکمت ودانش پر دلالت کرتے ہیں۔ آج اقوامِ عالم اور ادیان دہر (دین کے راوج) تمام امور میں مسیحیت کی تقلید (پیروی) پر جھکے ہوئے ہیں۔ اگرچہ زبان سے مسیح اور مسیحیت کو طعن و دشنام (گالیاں دینا) کرتے ہیں مگر باطن میں اُس کی تاثیر سحرِ تخمیر (خمیر اُٹھانا) کو خوب محسوس کرتے ہیں۔ اور مسیحیت کے آفتابِ صداقت کے سامنے تمام دیگر مذاہب کے چراغ گل ہوئے جاتے ہیں اور وہ وقت آنے والا ہے کہ سب اپنے اپنے مدھم عارضی چراغوں کو پھونک مار کے کر بجھادیں گے۔ اور مسیحیت کے نیو درخشاں کی ضیا باریوں (روشنی پھیلانا) سے بہرور

ہوں گے۔اور خُداوند مسیح کو جو تمام دُنیا کے پیر طریقت میں اپنے دلوں میں رکھیں گے۔"تاکہ یسوع کے نام پر ہر ایک گھٹنا ٹکے۔خواہ آسمانیوں کو خواہ زمینوں کا۔خواہ اُن کا جو زمین کے نیچے ہیں۔اور خُدا باپ کے جلال کے لئے ہر ایک زبان اقرار کرے کہ یسوع مسیح خُداوند ہے"(فلپیوں ۱۰:۲-۱۱)۔

مسیحیت ہند میں

اس وقت متعدد مذاہب پاکستان وہندوستان میں نظر آتے ہیں۔اور روز بروز بہت سے مذہبی فرقے برپا ہوتے جاتے ہیں۔ڈر ہے کہ کہیں مذاہب کی تعداد عابدوں کی تعداد سے بڑھ نہ جائے اور لطف یہ ہے کہ ہر مذہب اور ہر فرقہ یہی دعویٰ کرتا ہے کہ وہ واحد عالمگیر الہٰی مذہب ہے اور دوسرے مذاہب باطل اور انسانی اختراع ہیں۔یہ کوئی نہیں سوچتا کہ جب خُدا واحد مسلم ہے تو وہ ایک ہی خُدا اتنے متناقض ومتضاد مکاشفے کیسے دے سکتا ہے؟اگر تمام مذہبی کتابیں الہامی مان لی جائیں تو ماننا پڑے گا۔کہ اُن سب کا الہام خُدا کی طرف سے نہیں ہوا۔اور تعجب انگیز امر یہ بھی ہے کہ عام طور پر مسیحیت کے باہر تمام مذاہب امور معاشرت کو بھی مذہب کا جز بنائے بیٹھے ہیں۔حالانکہ کھانا پینا، پہننا اور چند امتیازی علامتیں رکھنا سب جسمانی باتیں ہیں۔اور مذہبیات اور روحانیات سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتیں۔آج جو لوگ اپنے اپنے مذاہب کی عالمگیری کے دعوے دار ہیں۔وہ محض مسیحیت کی تقلید پر خالی ڈھول پیٹ رہے ہیں۔اور عالمگیر مذہب جیسا ہم ثابت کر چکے مسیحیت سے باہر اور کوئی نہیں۔انجیل ہی کے آفتاب فیضان (بڑی بخشش) صداقت کی ضیا باریوں سے دُختر کشی (بیٹیوں کا قتل)، رسم ستّی (خاوند کے مرنے کے بعد اس کی بیوی کا خُود کو جلا لینا) اور غلامی نسواں (عورتوں کو غلام سمجھنا) وبردہ فروشی (بچوں کو فروخت کرنا) کی ستم رانیوں کو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنا پڑا۔اور وہی رسوم بد جو کوتاہی نظر وفکر وار خساست وانقباض (قبض، رُکنا) طبائع مجوبہ عندالخواص نا باعث صدا افتخار ومباہات اور موجب حسنات سمجھی جاتی تھیں۔آج مسیحیت خواص عجیبہ اور تاثیرات غریبہ کے طفیل معیوب ومذموم سمجھی جاتی ہیں۔اگر رحم تھا تو اس قدر کہ "آہنسا پر مودھرما" کے خیالات مروج تھے۔اور اگر ظلم تھا تو اس انتہا کا کہ ستّی اور دختر کشی کی قبیح (خراب) رسُوم کو ثوابِ عظیم سمجھا جاتا تھا۔اور رحم وقہر کی ضدین پر بطور افراط وتفریط (کمی بیشی) عمل درآمد ہوتا تھا۔مسیحیت نے ہر شعبہ انسانیت میں مِن کل الوجوہ اعتدال ومیانہ روی کی عملی صورت میں رواج دیا۔**"راجہ رام موہن رائے جب یونانی وعبرانی کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے سیرامپور گئے تو وہاں ولیم کیئری صاحب نے ستّی کی رسم کے خلاف اُن کو اُبھارا اور آخر کار اُن دونوں کی کوشش سے سرکار اس رسم کے خلاف قانون نافذ کرنے پر مجبور ہوئی۔اور ولیم کیئری صاحب کے تبلیغی اثر سے سرکار ہند نے ہندوستان کی قبیح رسُوم کو مثلاً دُختر کشی وغیرہ کو قانوناً بند کیا"۔**

جس طرح مکان کے اندر چراغ کے داخل ہونے سے چھت کے جالے۔دیواروں کی گرد آلودگی وگندگی شہتیروں کی بوسیدگی اور فرش کی ناہمواری وغلاظت صاف نظر آتی اور صاحبِ خانہ کو اپنے مکان کی ایسی ردّی حالت سے نفرت وکراہیت پیدا ہو کر اُس کی قطع وبُرید اور صفائی کا فوری خیال پیدا ہوتا ہے۔اسی طرح مسیحیت جو ایک چراغ معرفت الہٰی اور مفارق (جدائی) سفیدی وسیاہی ہے۔جب ظلمت کوہ ہند میں داخل ہوا تو ہر مذہب کو اپنے اپنے معائب (معیب کی جمع، خرابیاں) ونقائص صاف صاف نظر آنے لگے۔اور اُس چراغِ معرفت وحقیقت اور شمع فیضان صداقت کی آمد سے ہر کسی کو اپنے اپنے گھر کی پڑ گئی۔اور مسیحیت کے اخلاق فاضلہ اور شمائلِ حسنہ (اچھی عادات) کی روشنی میں ہر مذہب وملت نے اپنے اپنے مذہبی عقائد ورسوم اور اخلاق وآداب کی کتر بیونت (کاٹ، تقسیم) اور نئی نئی تاویلیں وتشریحیں کر کے مسیحیت کے سانچے میں ڈھالنا شروع کر دیا۔اور تمام ہندوستان میں سوشل ریفرمیشن (اصلاح) کے آثار نظر آنے لگے۔اور مسیحیت نے نہ صرف پاکستان وہندوستان کے خارستان (کانٹوں کی جگہ) کو گل وگُلزار بنایا بلکہ ہمہ

اقوام عالم میں باوجود انتہائی مشکلات کے اپنی ترویج واشاعت کے لئے میدان تلاش کرلیے۔اس وقت انجیلِ مقدس کے تراجم قریب نوصد (۹۰۰) زبانوں میں ہوچکے ہیں۔اور یہ ترجمے وتفسیریں دوسری صدی عیسوی سے ہی ہوتے آئے ہیں کوئی آج کی بات نہیں ہے۔آج مسیحیت کی تقلید پر قرآن شریف بھی چند زبانوں میں چھپنے لگاہے تاکہ مسیحیت کی طرح اپنی عالمگیری کا دعویٰ کرسکے۔اور وید وغیرہ اول تو جرمنی علماء کی جاں کاہیوں اور دیدہ ریزیوں سے انگریزی اور چند دیگر زبانوں میں نظر آئے۔اوراب چند مشرقی زبانوں میں بھی ملبس نظر آنے لگے ہیں۔یہ سب مسیحیت کی خوش چینوں کے نتائج ہیں۔آج سے پیشتر کبھی ویدوں نے سوائے سنسکرت کے کسی اور زبان کا منہ بھی دیکھا؟ کبھی ادنیٰ اقوام میں اُن کی منادی کی گئی؟اوراچھوتوں کی وید کے واعظ ہونے کا حق دیا گیا؟ہر گز نہیں۔بلکہ اُن کو وید سُنانا گناہ کبیرہ سمجھا گیا۔آج کیوں اچھوتوں کو وید پڑھنے سے منع نہیں کیاجاتا؟آج کیوں گھر گھر میں وید پڑے ہیں؟آج کیوں شدھی سنگٹھن قائم ہیں؟صرف مسیحیت کی نظر فیض اثر کی نتائج ہیں۔مسیحیت بغیر کسی سیاسی غرض کے صرف خُداوند مسیح کے ارشادِ فیض بنیاد کی تعمیل کی خاطر اچھوت وپسماندہ اقوام کو وقت قابلیت اور سم وزر خرچ کرکے اپنے میں ملا کر اونچ نیچ کے مذموم (خراب)امتیازات کو مطمارہی ہے۔ہندو مسلم اقوام دوبڑے درخت ہیں۔اور پسماندہ گروہ چھوٹی کمزور پَود(نسل)جواُن کے سایہ میں صدیوں رہ کر نشوونما پانے کے قابل رہی۔مسیحیت اس کمزور اور نیم جان پَود کو اُن کے نیچے سے اُکھاڑ اُکھاڑ کر علیٰحدہ لگاتی اور تعلیم وتہذیب کے پانی سے سینچتی ہے۔تاکہ وہ بھی اُن تناور درختوں کی طرح پرورش پاکے سربلند سرفراز ہوجائے۔انجیل تمام اقوامِ عالم کوایک دوسرے کے بھائی اورایک ہی نسل وخاندان کے آدمی بیان کرتی ہے۔"اوراُس (خُدا) نے ایک ہی اصل سے آدمیوں کی ہر ایک قوم تمام رُوئے زمین پر رہنے کے لئے پیدا کی"(اعمال ۲۶:۱۷؛کُلسیوں ۱۱:۳؛گلتیوں ۲۷:۳-۲۸)اور مسیحیت ہی واحد عالمگیر مذہب ہے۔اور تمام دُنیا کادستور العمل ہونے کی کامل اور اکمل۔قابلیت وصلاحیت اپنے اندر رکھتاہے۔کھانے پینے پہننے کے متعلق کوئی قید نہیں لگاتا۔ذات پات کے مخمصوں وا لجھیڑوں (لڑائی جھگڑا) کو جائز نہیں سمجھتا۔تلوار وخنجر اور تیغ وتفنگ(ہوائی بندوق)اور باہمی مُنافرت ومخاصمت کے برخلاف سختِ امتناعی اَحکام(روکنے والے حکم)لگاتاہے۔مسیحیت ایک خورشید درخشاں(سورج کی طرح چمکتا ہوا) ہے اور تمام دیگر مذاہب ستارے۔مسیحیت ایک بحرِ بیکراں ہےاور تمام دیگر مذاہب ندی نالے۔آخران سب ندی نالوں اور دریاوں اور نہروں کواُسی ایک سمندر (مسیحیت) میں آکر گرناہے۔"پھر ایک ہی گلہ اورایک ہی چرواہا ہوگا"(یوحنا۱۶:۱۰؛فلپیوں ۱۰:۲-۱۱؛افسیوں ۱۰:۱؛متی ۱۸:۲۸-۱۹؛اعمال ۱۲:۴)۔

لوگ مذہب سے کیوں بیزار ہیں؟

آج کل لاکھوں مذہب سے بیزار نظر آتے ہیں اورایسے حضرات تمام خرابیوں کی جڑ مذہب کو قرار دیتے ہیں۔اور مذہب کی جان کا فاتحہ پڑھنا چاہتے ہیں۔اوراس بیجائیت (بیچنے کی اُجرت) کی اوّلیت کاسہرا بالخصوص اُن سیاسی پارٹیوں اور تحریکوں کے سرہے جنہوں نے اس بیسویں صدی کے آغاز سے آج تک جنم لیاہے۔اور بالعموم ہندو مذہب کی ناستک (بے دین) تعلیمات کے سرہے۔جس نے لوگوں کو خُدااور مذہب کی طرف سے لاپرواہ کردیا ہے۔اور تیسری وجہ مذہب سے بیزاری کی مغربی خیالات ونظریات کی ہند میں ترویج ہے۔مذہب توانسانی فطرت کاایک جزوغیر منفک(جدائی کے بغیر) ہے۔اوراُ ُس سے پیچھا چھڑانا فطرۃ کے خلاف جہاد ہے۔البتہ یہ بات سوفیصدی درست ہے کہ نقلی مذاہب جولوگوں کے خود ساختہ ہیں ضرور موجود انحطاط وتخریب(تنزل وبربادی) کے ذمہ دار ہیں۔اوراُن کااستیصال(جڑسے اکھیڑنا)ہی تعصب،مخاصمت ومنافرت،حسد وکینہ اور خود غرضی کے وجود

کے لئے جو اس وقت اِنسانیت کے شرائین میں خون حیات بن کر تیر رہے ہیں موت کا پیغام ہو سکتا ہے۔ لیکن اس اقدام سے پہلے نقلی و اصلی مذاہب کی تحقیق ضروری ہے۔ ہم آگے چل کر مناسب مقام پر اس موضوع کو چھیڑیں گے۔ فی الحال اِنسان کی مذہبی بیزاری کے موجبات کا سُراغ لگانا انسب (زیادہ مناسب) اور ضروری ہے۔

وجہ اوّل

لوگ چاہتے ہیں کہ خُدا ہماری حسب منشاء ہو۔ جو ہم چاہیں وہ فوراً کرے۔ اور جدھر چاہیں اُسے پھیر لیں۔ وہ ہماری جائز و ناجائز خواہشات کے پورا کرنے میں ذرا پس و پیش نہ کرے۔ اگر آدھے لوگ چاہیں کہ بارش نہ ہو اور آدھے چاہیں کہ بارش ہو تو خُدا اُن واحد میں ان دونوں کی خواہش کو پورا کرے۔ لوگوں نے خُدا کو لیجسلیٹو اسمبلی کا ممبر سمجھ رکھا ہے۔ جس کا انتخاب رائے عامہ پر منحصر ہے۔ اور جس کی عبادت مشروط اس بات سے ہے کہ پہلے وہ اُن کی ہر طرح کی نیک و بد خواہشات کو بلا حیل وحجت (بغیر کسی حیلہ بہانہ کے) پورا کرے۔ چونکہ حرص وہوا کے بندوں کی نفسانی خواہشات کا جواب خُدا کی طرف سے دیا نہیں جاتا۔ اس لئے وہ جھٹ ایسے یک طرفہ خُدا سے منکر ہو کے کسی ایسے نئے خُدا کو ایجاد کرنا چاہتے ہیں جو ہر وقت اُن کی ہاں میں ہاں ملایا کرے۔

وجہ دوم

مذہب کی پابندی نفسانیت اور دُنیاداری سے روکتی ہے۔ (متی ۳۷:۱۰-۳۸) اور ایک ہی وقت میں اِنسان خُدا اور دولت دُنیا کو پیار نہیں کر سکتا۔ (متی ۲۴:۶) اور ''بنی آدم کا دل اُن میں بدی پر بشدت مائل ہے'' (واعظ ۱۱:۸)۔ چونکہ مذہب کی پیروی میں زخارفِ دُنیا (پانی سے بھری ہوئی دُنیا) اور جیفۂ جہان (سڑی ہوئی دُنیا) کو ٹھکرانا پڑتا ہے۔ اور لوگ اس وقت اس دلفریب ودلآویز دُنیا کے تیر نگاہ کے زخم خوردہ ہیں۔ اور مذہب کی بُنیاد پر دولت پرستی، اقبال و کامرانی، نفسانیت وعشرت پرستی اور حکومت وسیاست کی نظر فریب عمارتیں اُٹھا چکے ہیں۔ اور ان دلکش مگر فانی عمارتوں کو ڈھانا اور مذہب کی محبت کو دل میں بٹھانا اُن کے لئے جوئے شیر کے لانے (مشکل یا ناممکن کام سرانجام دینا) سے زیادہ محال معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے وہ مذہب کو اپنی نفسانی خواہشات کی راہ میں سدّ سکندری سمجھ کر اُسے اُٹھا پھینکنا چاہتے ہیں۔ مذہب اور نفسانیت دو متضاد اشیاء ہیں۔ اور ایک ہی وقت میں ایک شخص ان دونوں کی پیروی نہیں کر سکتا۔ ''کیونکہ جسم رُوح کے خلاف خواہش کرتا ہے۔ اور رُوح جسم کے خلاف اور یہ ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ تاکہ جو تم چاہتے ہو وہ نہ کرو'' (گلتیوں ۱۷:۵؛ ا۔ کرنتھیوں ۱۴:۲)۔

وجہ سوم

مذہبی احکام اور تعلیمات کا رُوحانی نکتہ نگاہ بہت بلند و بالا ہے۔ اس لئے عامتہ الناس (عام لوگوں کو) اُن تعلیمات کو صرف سُن اور پڑھ کر ہی محظوظ (خوش) ہونا چاہتے ہیں۔ اُن پر عمل پیرا ہونے کی کوشش نہیں کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اِنسان کا عملی پہلو بہت پست اور کمزور ہو چکا ہے۔ اب ان مذہبی درس وتدریس اور قوانین پر عمل کرنا محال و ناممکن سمجھ کر مذہب سے بیزاری کا اظہار کیا جاتا ہے۔ یہ نہیں کہتے کہ مذہب کا نکتہ نظر نہایت اعلیٰ وارفع ہے اور کاش ہم اُس تک پہنچ سکتے۔ اس صورت میں مذہب کا نکتہ نظر نہایت اعلیٰ وارفع ہے اور کاش ہم اُس تک پہنچ سکتے۔ اس صورت میں مذہب کی فضیلت کا اقرار اور اپنی قابلیت کا انکار ہوتا۔ لیکن یہاں مذہب کا انکار اور اپنی قابلیت کا اقرار کیا جاتا ہے۔ یہ تو اُس شخص کا سا حال ہوا۔ جو کسی اُستاد کامل کے

آگے زانوئے (ران، گُھٹنا) شاگردطے کرنے سے توعار کرے (شرم کرنا)اور جب علم حاصل نہ ہوسکے توکہے کہ علم فضول شے ہے اوراس کاوجود وعدم (ہونااورنہ ہونا) برابر ہے۔

وجہ چہارم

لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں خُدادِکھاوبغیر دیکھے ہم اُس کوکیسے مان لیں؟اگر خُدااپنی شانِ کبریائی والوہیت کے ساتھ نادیدہ وپوشیدہ اور فوق الفہم وادراک رہے تولوگ اُس کوکسی دیدنی وظاہری صورت میں دیکھناچاہتے ہیں۔اوراگروہ دیدنی صورت میں ظاہر نہ ہوتواُس کی ہستی کے متعلق شکوک میں پڑاکرآخراُس سے منکرہوجاتے ہیں۔اوراگروہ کسی دیدنی مظہر میں تجسم اختیار کرکے مرئی ومجسم ہوجائےاورانسان کی فہم وسمجھ کے مطابق اُس کی خُدابنی کی خواہش کاجواب دے تولوگ اُس کو محض ایک خُدارسیدہ اور راستباز آدمی سمجھ کراُس کی الوہیت وخُدائی کا یکسرانکار کرتے ہیں۔اب بتایئے ان دوصورتوں کے علاوہ اور کونسی تیسری صورت ممکن ہے جس سے خُداانسان کی آرزوؤں کوپورا کرسکے۔

وجہ پنجم

درحقیقت لوگ مذہب سے بیزار نہیں بلکہ مذہب ومعاشرت کے معجون مرکب (کوئی مرکب دواجوکئی دواؤں کوملاکرآٹے کی طرح گوندھ کربنائی گئی ہو) سے بیزارہیں۔آپ یہ خوب ذہن نشین کرلیجئے کہ امور معاشرت ہر گزمذہب کا جُز نہیں ہیں۔جس طرح لوہازر نہیں اورنہ زرلوہاہے۔اسی طرح معاشرت مذہب نہیں اور مذہب معاشرت نہیں ہے۔روٹی سے بھوک مٹتی اور پانی سے پیاس توبجھتی ہے مگر جس طرح روٹی سے پیاس نہیں بجھ سکتی اور پانی سے بھوک دور نہیں ہوسکتی۔اُسی طرح معاشرت کو مذہب کا درجہ نہیں دیاجاسکتاہے۔اورنہ ہی مذہب معاشرت کی جگہ لے سکتا ہے۔ دونوں کے اغراض ومقاصد میں بعد المشرقین ہے۔کھاناپینا اور پہننا (امور معاشرت) حوائج جسمانیہ ونفسانیہ کی آسودگی کے لئے ضروری ہے۔ اورمذہب حوائج رُوحانیہ وخواہشات اخلاقیہ کی تسکین وآسودگی کا ذمہ دار ہے۔دونوں کے مقاصد میں مغائرت وتفادت اظہر من الشمس (عیاں) ہے۔ خُداکا کوئی کام حکمت ومصلحت سے خالی نہیں ہے۔اس لئے "خُداوندنے ہرایک چیز خاص مقصد کے لئے بنائی"(امثال ۱۶:۴)۔دراصل امور معاشرت کو غلطی سے مذہب کا جُز سمجھ کرلوگوں نے تمدنی معاشرتی اور سیاسی اغراض کے حصول کی خاطر مذہب کی آڑ میں جھگڑے کھڑے کرکے مذہب کوبدنام کرر کھاہے۔اوراسی قسم کے جھگڑے ہمارے ملک میں لاانتہاقتل،خون اور غارت گری اور منافرت کاصریح سبب ٹھہرے ہیں۔خون کرواتے ہیں۔ان میں سے ایک سُوراور گائے کامسئلہ ہے حیوانی جانوں کی حفاظت کی خاطرانسانی جانوں کوہلاک کرنا کہاں کی عقلمندی ہے؟اگر حیوان کومارناگناہ صغیرہ ہے تو اِنسان کومارناگناہ کبیرہ ہے۔اس صورت میں صغائر (صغیر کی جمع، چھوٹا) کی مدافعت کے لیے کبائر (کبیر کی جمع، بڑا) کے مرتکب ہوناکیسی نامعقول فلاسفی ہے۔جب تک کھانے پینے اور مختلف ظاہری امتیازی نشانات رکھنے کومذہب کا جُز سمجھاجائے گاتب تک ہماری سرزمین پرخون کی ندیاں بہتی رہیں گی۔ اوراتحاد تعاون واشتراک (حصہ داری) کے الفاظ ایک قالب مردہ کی طرح رُوحِ معانی سے تاابدخالی رہیں گے۔ان الفاظ کواگرشرمندہ معانی بنانامقصود ہے تومعاشرت کومذہب سے جُداکرکے دونوں میں امتیازی حدلگادو۔افسوس کامقام ہے کہ غیر مسیحی اکثریت کاظالمانہ دُنیوی اقتدارانجیل کے ہمہ گیر وہمہ رَس رُوحانی مذہب کوگوشہ لحد (قبر) میں لٹادینے کے لئے محض اس واسطے تلاہواہے کہ وہ معاشرت کومذہب کو جُزنہ سمجھتے ہوئے دونوں کوالگ الگ رکھتاہے۔انجیل کافرمان ملاحظہ ہو۔"کھاناہمیں خُداسے نہیں ملائے گا۔اگرنہ کھائیں توہماراکچھ نقصان نہیں۔اوراگر کھائیں توکچھ نفع نہیں"(ا۔

کرنتھیوں ۸:۸؛۱۳:۶)۔ ''کوئی چیز بذاتِہ حرام نہیں۔ لیکن جو اُس کو حرام سمجھتا ہے اُس کے لئے حرام ہے۔ اگر تیرے بھائی کو تیرے کھانے سے رنج پہنچتا ہے تو پھر تو محبت کے قاعدے پر نہیں چلتا''(رومیوں ۱۴:۱۴-۱۵)۔ ''کیونکہ خُدا کی بادشاہت کھانے پینے پر نہیں بلکہ راستبازی اور میل ملاپ اور اُس خوشی پر موقوف ہے جو رُوح القدس کی طرف سے ہوتی ہے''(رومیوں ۱۷:۱۴)۔ ''کیونکہ خُدا کی پیدا کی ہوئی ہر چیز اچھی ہے۔ اور کوئی چیز انکار کے لائق نہیں۔ بشرطیکہ شکر گزاری کے ساتھ کھائی جائے''(۱۔ تیمتھیس ۴:۴)۔

''جب تُم مسیح کے ساتھ دُنیوی ابتدائی باتوں کی طرف سے مر گئے تو پھر اُن کی مانند جو دُنیا میں زندگی گزارتے ہیں۔ آدمیوں کے حکموں اور تعلیموں کے موافق ایسے قاعدوں کے کیوں پابند ہوتے ہو۔ کہ اسے نہ چھونا اُسے نہ چکھنا۔ اُسے ہاتھ نہ لگانا''(کُلسیوں ۲۰:۲-۲۱)۔ پھر ختنے کے امتیازی نشان کے متعلق یہ فرمایا ہے۔ ''نہ ختنہ کوئی چیز ہے۔ نامختونی بلکہ خُدا کے حکموں پر چلنا ہی سب کچھ ہے''(۱۔ کرنتھیوں ۱۹:۷؛ کُلسیوں ۱۱:۳)۔ طبّی نُکتہ نگاہ سے گائے وسُور کے گوشت اور حُقّہ نوشی کے فوائد یا نقائص کچھ ہی ہوں۔ پر طبّی و معاشرتی معاملات پر رائے زنی کرنا مذہب کا کام نہیں۔ شراب کو اگر مذہب ناجائز قرار دیتا ہے تو محض اس لئے کہ اُس کے معائب و نقائص کا پلڑا اُس کے فوائد کی بہ نسبت بہت بھاری ہے۔ اِنسان شرابی ہو کر بد کلامی کرتا۔ گالیاں دیتا لڑائی دنگا کرتا اور مدہوش ہو کر خُدا کی عبادت سے اِضطراری طور پر غافل ہو جاتا ہے۔ لیکن گوشت خوری وحقہ نوشی سے نہ تو مدہوش ہو کر عبادت میں غفلت کر سکتا اور نہ ہی اُن سے کسی قسم کی بے ہوشی طاری ہو کر کسی ناجائز حرکت یا فعل کے صدور کا امکان ہوتا ہے۔ اگر شراب نیک نیتی سے حالات پیش آمدہ کے مطابق جائز فائدہ کے حصول کے لئے (مثلاً نمونیہ) استعمال کی جائے۔ تو کم از کم مسیحیت میں اُس کی مخالف نہیں ہے۔ دیکھئے سنکھیا شراب کی بہ نسبت زیادہ خطرناک اور مہلک شئے ہے۔ لیکن ہر مذہب کا مریض اطباء(طبیب کی جمع، حکیم) سے دوا کے طور پر لے کر استعمال کرتا ہے۔ صرف نیت کی نیکی یا بدی کی بات ہے۔ اگر کوئی نیک نیتی سے سنکھیا استعمال کرے تو مرض سے شفا پاتا ہے۔ اور اگر بدنیتی (خود کشی کے لئے) سے استعمال کرے تو نتیجہ ہلاکت ہوتی ہے۔ اور یہی گناہ ہوتا ہے۔ یہی حال شراب کا ہے ہر شئے میں حد سے تجاوز کرنا مضرت رساں (نقصان پہنچانے والا) ہے۔ اور امور معاشرت میں یہ اصول بالکل درست ہے۔ پھر ذات پات اور اُونچ نیچ کے امتیازات مسیحیت کے باہر تمام مذاہب میں خاص اُبھری ہوئی جگہ رکھتے ہیں۔ اس امتیاز پسندی کے اختلال و خبط (خلل ڈالنا اور دیوانگی) نے مذہبی دیوانوں کے دماغ کے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا ہے۔ اور ہر منصف مزاج شخص اپنی ضمیر سے جنگ کئے بغیر ان کو اِنسان نما درندے کہہ سکتا ہے۔ دُنیا کے اس حرماں نصیب برصغیر کی تباہ حالی۔ عدم تعاون عدم اشتراک اور عدم مساوات کی حمایت کرنے والی یہی ذات پات کی واہیات ریت ورسوم ہیں۔ یہاں ہر پیشہ ایک مستقل مذہب کا قائم مقام ہے۔ یہ سب معاشرتی امور ہیں۔ مذہب کے اندر ان کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اور مسیحیت واحد حقیقی مذہب ہے جو ذات پات کے امتیازات کی جان پر فاتحہ پڑھنے میں نہایت سنگدل واقع ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ ''اُس (خُدا) نے ایک ہی اصل سے آدمیوں کی ہر ایک قوم تمام رُوئے زمین پر رہنے کے لئے پیدا کی''(اعمال ۲۶:۱۷)۔ ''نہ یہودی رہا نہ یونانی نہ ختنہ نامختونی نہ وحشی، نہ سکوتی نہ غلام نہ آزاد۔ صرف مسیح سب کچھ اور سب میں ہے''(کُلسیوں ۱۱:۳)''اور تُم سب جتنوں نے مسیح میں شامل ہونے کا بپتسمہ لیا مسیح کو پہن لیا۔ نہ کوئی یہودی رہا نہ یونانی۔ نہ کوئی غلام نہ آزاد نہ کوئی مرد نہ عورت کیونکہ تم سب مسیح یسوع میں ایک ہو''(گلتیوں ۲۷:۳-۲۸)۔ مسیحیت کے علاوہ کوئی دوسرا مذہب آقا وغلام اور محمود و ایاز کو سلکِ اتحاد واشتراک میں منسلک کر کے ایک ہی صف میں کھڑا کرنے کی مجال نہیں رکھتا۔ البتہ آج ہر مذہب مسیحیت کی اُدھوری اور ناتمام سی نقل ضرور اُتار رہا ہے۔ تاہم نقل نقل ہی ہے اور اصل اصل۔

کچھ سال ہوئے ایک شخص میرے ساتھ مذہب کے متعلق بات چیت کرنے آیا۔ اور اُس نے حسب معمول گوشت خوری کے جواز وعدم جواز کے متعلق گفتگو چھیڑ دی۔ میں اُس بحث کا خلاصہ !اس جگہ پیش کرتا ہوں تاکہ معاشرت ومذہب کے موضوع پر زیادہ روشنی پڑے۔

ہندو صاحب۔ صاحب تُم لوگ گوشت کھاتے اور جیو ہتیا جیسے مہاں باپ کے مرتکب کیوں ہوتے ہو۔

راقم۔ پہلے میرے سوالات کا جواب دیں۔ پھر میں آپ کے سوال کا معقول اور تسلی بخش جواب دوں گا۔

ہندو صاحب۔ بہتر! فرمایئے۔

راقم۔ آپ اِنسانی اجسام۔ حیوانی اجسام اور نباتی اجسام میں کیا فرق مانتے ہیں؟

ہندو صاحب۔ آپ اِنسانی اجسام کو ہم ارواح کے اصلی گھر مانتے ہیں۔ اور حیوانی و نباتی اجسام کو قیدیں۔ یا یُوں سمجھیں کہ جسم اِنسانی کرم جونی اور جسم حیوانی و نباتی بھوگ جونی ہیں۔ جب رُوح اِنسانی جسم میں رہ کر بُرے اعمال کرتی ہے۔ تو وہ اُن کا پھل بھوگنے کے لئے حیوانی و نباتی اجسام (قیدوں) میں ڈالی جاتی ہے۔

راقم۔ بہت خوب! میں نے آپ کا مطلب سمجھ لیا ہے۔ اب مجھے یہ بتایئے کہ کسی قیدی کو قید سے رہا کرنا یا کروانا رحم میں داخل ہے یا نہیں؟

ہندو صاحب۔ جی ہاں! قیدیوں اور مظلوموں پر رَحم کرنا نہایت مستحسن فعل ہے۔ اسی واسطے ہم لوگ اندھوں، لنگڑوں اور اپاہجوں اور حیوانات پر رحَم کرتے ہیں۔ ہمارے گئوشالہ اور یتیم خانے اس بات کا بین ثبوت ہیں۔

راقم۔ بہت بہتر! تو اب اپنے سوال کا جواب سنئے۔ ہم نباتات کو کھاتے ہیں تا کہ قیدی ارواح کو نباتی اجسام سے آزاد کریں۔ لیکن وہ ارواح نباتی قیود سے چھوٹ کر فوراً حیوانی اجسام میں داخل ہو جاتی ہیں۔

ہماری ہمدردی یہ گوارا نہیں کر سکتی کہ اُنہیں حیوانی قیود میں رہنے دیں۔ چنانچہ ہم حیوانات کو کھا لیتے ہیں۔ حیوانی قیود سے نکل کر ارواح اِنسانی قالبوں میں یعنی اپنے اصلی گھروں میں آجاتی ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ ہم اِنسانوں کو نہیں کھاتے ہم اُن قیدیوں کو آزاد کر کے اُن کے اصلی گھروں میں پہنچا کر دم لیتے ہیں۔ آپ بھ یاس پَر اُپکار میں ہمارا ساتھ دیتے ہیں۔ یعنی نباتات کو کھاتے ہیں۔ لیکن پہلی ہی منزل پر ہمت ہار بیٹھتے ہیں۔ اور ہم اُن کی آزادی کی خاطر ایک اور کٹھن منزل کو طے کرتے ہیں۔ کہو صاحب پھر گوشت کھانا کیسے پاپ ٹھہرا؟

ہندو صاحب۔ واہ صاحب! آپ نے نئی فلاسفی سے اس مسئلہ کو حل کیا۔ لیکن میرا دل قائل نہیں ہوا۔ ہم تو "آہنسا پرمو دھرما" کے قائل ہیں۔

راقم۔ خیر آپ قائل رہیں۔ لیکن اس مسئلہ کی حمایت سے آپ کی مشکلات بہت بڑھ جائیں گی۔

ہندو صاحب۔ وہ کیسے؟

راقم۔اوّل تو یہ بُدھ مت کی تعلیم ہے۔اور ویدوں کے صریح مخالف ہے۔ ویدوں میں اسومیدھ یگ، گئومیدھ یگ اور نرمیدھ یگ (انسانی قربانی) کے احکام صاحب موجود ہیں۔اوراُن پر صدیوں عمل درآمد ہوتارہا ہے۔ مغربی مسیحی علماء کے علاوہ ڈاکٹر راجندرلال متر جیسے وحید العصر اور یگانہ روزگار سنسکرت عالم نے بھی ویدوں کی کامل تحقیق وموشگافی (باریک بینی، چھان بین) کے بعد صاف اقرار کیا۔ کہ

"ویدوں میں جانورں کی قُربانی کاویساہی حال ہے جیساتوریت کی کتاب احبار ہیں"۔

دیکھوڈاکٹر مذکور کی تصنیف "انڈوآرنیس"

بُدھ مذہب کے عروج اور ہمہ گیروہمہ ہیں رسوخ واثر نے ان ویدوں کی تعلیم کو زوال پہنچایا۔اُسی وقت سے یہ قُربانیاں تو بند ہوچکیں۔ لیکن ویدوں میں اُن کے احکام اب بھی اُسی طرح موجود ہیں۔

دوم۔ لیکن اب بُدھ کی تقلید سے بھی آپ کادامن چھوٹ نہیں سکتا۔یعنی "آہنساپر مودھرما" کے اصول پر عملدرآمد قطعاً محال ہے۔ دیکھئے پانی اور ہوا اور نباتات میں بیشمار جیو (جاندار) موجود ہیں لیکن آپ ان کواستعمال کرتے ہیں۔پلیگ کے دنوں میں کروڑوں چوہے عدم آباد پہنچائے جاتے ہیں۔ جراثیم کی برکت سے ملیریااور ہیضہ وتپ دق وغیر امراض لاحق ہوتے ہیں۔ایسے امراض میں مریض کودوادینے یاٹیکہ کرنے سے یہی مقصد ہوتا ہے کہ بیماری کے جراثیم دواکے زہر سے ہلاک ہوجائیں۔ کپڑوں یابالوں میں جوئیں پڑجائیں یاگندے پانی پر مچھر پیداہوجائیں۔ یامکھیاں ہیضے کے ایام میں بڑھ جائیں تو اُن کو فناکردیاجاتاہے۔ زہریلے جانوروں کو ہلاک کیاجاتاہے۔ٹڈی دَل کے انڈوں بچوں کو زندہ دبادیاجاتاہے۔ کیاکوئی آریہ یاہندوڈاکٹر اس خلاف فطرة اُصول پر عمل کرسکتاہے؟ ہاں! اگر حکمت وطبابت کو بند کردیاجائے۔اورانسانی زندگی کی قیمت ایک صفر کے برابر سمجھی جانے لگے تو یہ ہوسکتاہے۔

سوم۔آپ رُوح کو قدیم اور ناقابل فنا سمجھتے ہیں۔اس صورت میں گوشت خوری سے جیوہتیاتو نہیں البتہ پرکرتی (مادہ) ہتیاہوسکتی ہے۔ پھر آپ پرکرتی کو بھی قدیم اور غیر فانی مانتے ہیں۔ تواس صورت میں جیوہتیاپرکرتی ہتیادونوں ناممکن ہیں۔ کیونکہ ارادہ وراواح ناقابل فناہیں۔

چہارم۔ جیوہنسا خلاف فطرة نہیں بلکہ موافق فطرة ہے۔ایک زندگی کا قیام دوسری زندگی کی فناپر منحصر ہے۔ مثلاً بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو کھاکر جیتی ہیں۔اس طرح تمام موجودات پر غور فرمایئے۔

پنجم۔اگر کہو کہ یہ قانون صرف حیوانات کے لئے ہےاِنسان کے لئے نہیں۔ تواوّل تواس میں یہ قباحت آئے گی کہ اِنسان بھی حیوانات میں شامل ہے۔ وہ حیوان ناطق (بولنے والاحیوان) مسلم ہے۔ لیکن اس سے بڑھ کر یہ امر قابل غور ہے کہ دُنیاکے بعض حصص ایسے سرد ہیں کہ وہاں نباتی (گھاس کا، جڑی بوٹیوں کانباتات سے متعلق) زندگی قطعی ناپید ہے۔ مثلاً سائبیریاکے میدان کے باشندے اوراسکیمولوگ صرف گوشت کھاتے اور کھالیں پہنتے ہیں۔اب آپ کا یہ استقراء ٹوٹ گیاکہ اِنسان کے لئے گوشت کھاناگناہ ہے۔ کل اِنسانوں کے لئے گوشت خوری گناہ ہے یہ غلط ہے۔ اگر "کل" کی جگہ "بعض" استعمال کریں توخیر ہم "بعض اِنسانوں" سے ہندوآریہ مرادلے لیں گے۔یعنی اِنسان کُلی کے بعض افراد (ہندو) کے لئے گناہ ہے۔اگر "آہنساپر مودھرما" خُداکاایک عالمگیر قانون ہے۔ تواس پر عمل درآمد ناممکن ہے۔اور نیچر کی یہ کیادِل لگی ہے کہ بعض اقوام (اسکیمووغیرہ) کاجینا صرف گوشت خوری

ہے۔ مسیحی کھانے پینے کو مذہب کا کوئی حصہ نہیں سمجھتے۔ مذہب رُوحانی زندگی سے متعلق ہے نہ کہ جسمانیات سے۔ اگر ہم گوشت کھائیں تو مذہب کی خلاف ورزی نہیں اور اگر نہ کھائیں تو مذہب کی اطاعت نہیں۔ حکم دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک امر۔ دوسرا نہی۔ جیسے گناہ نہ کرو یہ نہی ہے۔ نیکی کرو یہ امر ہے۔ لیکن گوشت کے متعلق یہ دونوں قسم کے حکم نہیں ہیں۔ اس لئے امور معاشرت اختیاری باتیں ہیں اور مذہب کا جُز نہیں ہیں۔ ''پس تُم کھاو یا پیو یا جو کچھ کرو۔ سب خُدا کے جلال کے لئے کرو'' (۱۔ کرنتھیوں ۱۰: ۳۱)۔

وہ صاحب ان دلائل سے قائل ہو کر چلے گئے۔ اور پھر کبھی درشن نہ دئے۔ میرا مقصد یہ نہ تھا کہ اُس کو دلائل سے ہرادوں۔ بلکہ صرف اظہارِ حق سے غرض تھی۔ اور میں چاہتا تھا کہ وہ معاشرت و مذہب کی تفاوت و مغائرت (فرق) کو سمجھ لے۔ اب میں پھر۔ پہلے جملے کو دوہراتا ہوں کہ لوگ مذہب سے بیزار نہیں بلکہ مذہب و معاشرت کے معجونِ مرکب سے بیزار ہیں۔

ششم۔ حضور خُداوند مسیح نے آخری وقت اپنے شاگردوں کو حکم دیا کہ ''تُم جا کر سب قوموں کو شاگرد بناؤ'' (متی ۲۸: ۱۹)۔ ''اور کہ تُم زمین کی انتہا تک میرے گواہ ہوگئے'' (اعمال ۱: ۸)۔ جب اُس قادر ہستی نے یہ حکم دیا تو اس کی تعمیل کے لئے اس قسم کی آسانیاں بھی بہم پہنچادیں کہ جن سے مذہب الٰہی کی ترویج و اشاعت ہر جگہ بلاوقت ہو سکے۔ اور مبشران انجیل کے ذہنوں کو اس قدر روشن کر دیا کہ وہ دنیا کے گمنام حصص اور دور دراز اقالیم (اقلیم کی جمع، ممالک) و ممالک کی دریافت میں کامیاب ہوگئے۔ اور تمام ملکوں کے راستے کھل گئے اور ذرائع آمد و رفت نہایت آسان ہو گئے۔ اور چھاپہ کی مشین کی ایجاد سے انجیل کی اشاعت کو بہت مدد ملی۔ اور چھاپہ کی ایجاد سے وہ تمام مشکلات جو مختلف فلسفوں کی ترویج و تشہیر عامہ کی سدّراہ (روک بنا) تھیں یکسر (تمام) دور ہو گئیں۔ اور ذرائع سفر کی آسانیاں ایک ملک کے فلسفوں و خیالوں کو دوسرے ملکوں میں لے گئیں۔ پہلے ایک دو فلسفوں سے ایک ذہن آشنا ہوتا تھا۔ کیونکہ ہاتھ کی لکھی ہوئی کتابیں ایک تو گراں قیمت پر بکتی تھیں۔ اور پھر دوسرے ممالک کے راستے نامعلوم ہونے کے باعث ہر جگہ مروج نہ ہو سکتی تھیں۔ اس لئے بہت کم لوگ اُن سے واقف ہو سکتے تھے۔ اور لوگ غیر ممالک کے مذہبی فلسفوں سے نابلد و بےنصیب رہتے تھے۔ اب سینکڑوں فلسفوں اور نظریوں نے دماغ کو متعدد مختلف خیالات کی گھڑدور کا میدان بنا رکھا ہے۔ اور مختلف فلسفوں اور علوم نے باہم انجذاب و تجذیب (جذب کرنا یا ہونا) اور تاثر و تاثیر کر کے ایک نیا خمیر اُٹھایا ہے جس کو ''مذہب سے بیزاری'' کہنا درست ہے۔ اب لوگ اس شش و پنج میں ہیں کہ کس خیال یا نظریہ کو اپنائیں اور کس کو ترک کر دیں۔ اتنے کثیر خیالات کا موازنہ و مقابلہ کر کے کسی صحیح عقیدہ کی بنیاد رکھنا لوگوں کے لئے مشکل ہو رہا ہے۔ آخر اِنسان کا محدود دماغ کیا کرے۔ اس ذہنی کشمکش و بےچینی سے لاچار ہو کر لوگ مذہب سے بیزار ہو رہے ہیں۔ عقائد کی روز افزوں کثرت بھی مذہب کی بےقدری کو موجب ہے کیونکہ جب قدر کسی چیز کی زیادتی ہوا ُسی قدر لوگ اُس کی بےقدری کرتے ہیں۔

مذہبی بیزاری کا علاج

ہم اس بیان کے آغاز میں ذکر کر چکے کہ مذہب اِنسان کی فطرت کا جزو اعظم ہے۔ اور اُس سے دامن چھڑانا مشکل ہے۔ جب لوگ خُدا کو چھوڑ دیتے ہیں تو اُن کو ایک عوضی معبود ایجاد کرنا پڑتا ہے۔ دیو سماجیوں نے خُدا کو چھوڑا تو اُنہیں ستیہ نند اگنی ہوتری موجد دیو سماج کے سنگین مجسمہ پر جبین نیاز (پیشانی جھکانا) رگڑنی پڑی۔ اسی طرح بُت پرستوں نے خُدا کی جگہ عوضی بُت بنا کر اُن کی پرستش کرنی شروع کر دی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مذہب اِنسان کی فطرت ہے۔ اور اُس کی قیود سے آزاد ہونا محال۔ جب مذہب کی ضرورت ثابت ہو گئی تو اب موازنہ مذاہب سے اس امر کا کھوج لگانا

ضروری ہے کہ کونسا مذہب خُدا کا عطا کردہ ہے۔ ہم "عقل اور مذہب" کے بیان میں بخوبی ثابت کر چکے کہ خُدا ایک ہے اور اُس کا مذہب بھی ایک ہے۔ اب ہم ایک سادہ سا معیار پیش کریں گے جس سے ناظرین کو مذہب الٰہی اور اِنسان کے اختراعی مذاہب میں نمایاں امتیاز نظر آئے گا۔ یہ ایک بدیہی (ظاہر) امر ہے کہ عقلمند والدین اپنے بچوں کو ہمیشہ وہ چیز دیتے ہیں۔ جس کی اُن کے پاس کمی ہو۔ اور ضرورت بھی اُسی شئے کی ہوتی ہے جس کی کمی ہو۔ "تُم میں ایسا کونسا آدمی ہے کہ اگر اُس کا بیٹا اُس سے روٹی مانگے تو وہ اُسے پتھر دے۔ یا اگر مچھلی مانگے تو اُسے سانپ دے۔ پس جبکہ تُم بُرے ہو کر اپنے بچوں کو اچھی چیزیں دینا جانتا ہو۔ تو تُمہارا آسمانی باپ جو آسمان پر ہے اپنے مانگنے والوں کو اچھی چیزیں کیوں نہ دے گا؟" (متی ۹:۷-۱۱)۔ اگر ایک بچے کے پاس دس جوڑی کپڑے ہوں۔ اور وہ پاؤں سے بالکل ننگا ہو۔ اور اُس کے والدین اُس کو کپڑے دو جوڑی اور بنا دیں مگر جوتی بنوا کر نہ دیں۔ تو کیا اُس بچے کی ضرورت پوری ہو جائے گی؟ ہرگز نہیں جس چیز (جوتی) کی ضرورت اور کمی تھی وہ اُسے دی نہیں گئی اور جس شے کی کمی نہ تھی بلکہ افراط تھی وہ دے دی گئی۔ لہٰذا وہ اُس کی ضرورت پوری نہ ہوئی۔ ایک اور مثال لیجئے۔ فرض کیجئے ایک شخص فاقہ زدہ گرسنگی سے لاچار ہو کر لب دریا بیٹھا ہوا ہے۔ اس حالت میں اگر کوئی ازراہِ رحم پانی کا گلاس اُسے لا کر دیوے تو کیا اُس کی ضرورت پوری ہو جائے گی؟ ہرگز نہیں۔ کیونکہ پانی کی تو اُس کے پاس پہلے ہی قلت نہیں بلکہ افراط ہے۔ اور روٹی جس کی سخت حاجت تھی وہ اُسے ملی نہیں۔ اور ضرورت اُس شئے کی ہوتی ہے جس کی کمی ہو۔ خُداوُنیا کا باپ ہے وہ بھی دُنیا کو ایسا ہی مذہب دیتا ہے جس کی دُنیا کو ضرورت ہو۔ اس وقت دُنیا میں نااتفاقی، عداوت، خصومت، فساد، تکبر، خود غرضی تیغ و تیر کی محبت اور سیاسی و تمدنی مخمصوں کی کثرت ہے۔ اب اگر کوئی مذہب دُنیا کو یہی چیزیں دیوئے تو ظاہر ہے کہ ان کی تو آگے ہی کیا کمی ہے۔ بلکہ اُن کی کثرت نے اہلِ دُنیا پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا ہے۔ اب دیکھئے کہ دُنیا میں کمی کس شئے کی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ محبت اور میل ملاپ کا اس وقت قحط پڑا ہوا ہے۔ لہٰذا خُدا کا عطا کردہ مذہب وہ ہو سکتا ہے جس میں میل ملاپ اور محبت کی تلقین ہو۔ اور دشمنی، عداوت اور شمشیر زنی کے خلاف سخت امتناعی احکام ہوں۔ کیونکہ معاشرت و سیاست ہرگز مذہب کے جُز نہیں ہیں۔ اب مختلف مذاہب کی تعلیمات کو اس معیار پر رکھ کر دیکھ لیجئے۔ کرشن بھگوان گیتا میں ارجن سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں۔

"اَے ارجن جو تُو یدھ (لڑائی) بکھے لڑ کر مرے گا تو سُرگ (جنت) کو جائے پراپت (حاصل) ہوگا۔ اور جو جیتے گا تو راج کے بھوگ بھوگے گا (آنند لینا، مزہ لینا)۔ اِس کارن (وجہ) سے اُٹھ کر یدھ کر۔ لابھ اور ہان اور سکھ اور دُکھ اور جیت ہار کو سمان (عزت) جان کر یدھ کر"۔

(بھگوت گیتا دوتیہ ادھیائے آیت ۳۷،۳۸)

یہاں سُرگ اور راج کے بھوگوں کی تحریص (لالچ) دلا کر ارجن کو جنگ و جدل کے لئے اُبھارا جاتا ہے۔ حالانکہ شمشیر زنی اور قتل و غارت کا انعام سُرگ نہیں ہو سکتا۔ محض سیاسی و دُنیوی اغراض کے حصول کی خاطر سُرگ کا لالچ دے کر شمشیر زنی و خون ریزی پر آمادہ و دلیر کیا گیا ہے۔ لہٰذا گیتا نے دُنیا کو وہ چیز دی جس کی دُنیا میں پہلے ہی کثرت تھی۔ اور سیاست کو مذہب کے ساتھ ملا دیا۔ اب قران شریف کی تعلیم پر غور فرمایئے جو گیتا کے مندرجہ بالا خیال کے ساتھ ہو بہو ملتی ہے۔ "جب تُم کافروں سے بھڑو تو اُن کی گردنیں مارو۔ یہاں تک کہ جب تُم اُن میں خوب خون ریزی کو چکو تو اُن کی مشکیں باندھ لو۔ اس کے بعد یا تو احسان کر کے چھوڑ دو۔ یا فدیہ لے کر۔ یہاں تک کہ لڑائی اپنے اہتھیار رکھ دے۔ جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے اُن کے اعمال وہ ہرگز نہ کھوئے گا۔ اُنہیں ہدایت کرے گا اور اُن کا حال درست کرے گا۔ اور اُنہیں بہشت میں داخل کرے گا۔ جس کا بیان اُس نے اُن کے لئے کر دیا ہے" (سورۃ محمد ۴-۷ آیت؛ سورہ بقر ۱۸۶-۱۸۹، ۲۱۲)۔ "جو لوگ ایمان لائے اور گھر چھوڑ آئے اور لڑے اللہ کی راہ میں۔ اور جن لوگوں نے جگہ دی (نبی کو پناہ دی) اور اُس کی مدد کی وہی ہیں مسلمان ٹھیک۔ اُن کو بخشش ہے اور روزی عزت کی" (سورۃ انفال آیت ۷۵)۔ قرآن شریف نے بھی

شمشیر زنی اور دشمنی وخون ریزی کو مذہب کا جُز بنادیا۔ اور جنگ وجدل کے ساتھ بہشتی خوشیوں کو مشروط ٹھہرایا۔ لہٰذا قرآن نے دُنیا کی ضرورت کو پورا نہیں کیا۔ سکھ ازم اگرچہ ویدک دھرم کی ایک شاخ ہے۔ تاہم اُس کی تعلیم بھی اس بارے میں ہم پیش کرتے ہیں۔ ملاحظہ ربیہ راس گھ واک پاد شاہی دس۔

''ہمرے دُشٹ سبھی تُم گھادو۔۔۔آپ ہاتھ دے سوہے بچادو
سُکھی بسے مورے پرِوارا۔۔۔سیوک سکھ سبھے کرتارا
مورا چھانج کردے کرئے۔۔۔سب بیرن کو آج سنگھریئے
پُورن ہوئے ہماری آسا۔۔۔تور بھجن کی رہے پیاسا
تُمھیں چھاڈ کواور نہ دھیاوں۔۔۔جو بَر چاہوں سو تم نے پاؤں
سیوک سکھ ہمارے تاریئے۔۔۔چُن چُن سترہ(دشمن، حریف)ہمارے ماریئے
وسٹ جیتے اُٹھوت اُتپاتا۔۔۔سگل ملیچھ کرورَن گھاتا
اپنا جان مجھے پرت پریئے۔۔۔چُن چُن ستر وہمارے مریئے
ویگ تیغ جگ میں دو وچلے۔۔۔راک آپ موہے اور نہ دَلے۔

ناظرین خود غور کر کے دیکھ لیں کہ سِکھ ازم کس حد تک دُنیا کی ضرورت کو پورا کرتا ہے تیغ و تیر کی ہدایات اور دُشمنوں کے حق میں بد دعائیں مانگنے سے میل ملاپ اور باہمی محبت ہر گز ترقی نہیں کر سکتی۔ اب ہم انجیلِ مقدس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اور ابتداہی میں نہایت عجز وانکسار سے گذراش کرتے ہیں کہ انجیلِ جلیل کے کل ۲۷ صحیفوں میں باوجود گہری تحقیق وتدقیق کے ہمیں ایک بھی آیت ایسی نہیں ملی جو مندرجہ بالا تین کتابوں کی مذکورہ آیات وتعلیمات کے ساتھ کسی قسم کی مماثلت ومشابہت رکھتی ہو۔ اگر ایک بھی آیت ایسی مل جاتی تو ہم اُس کو ایماندار سے پیش کر دیتے۔ اگر اور کوئی مسیحی یا غیر مسیحی صاحب انجیلِ مقدس سے کوئی ایک بھی آیت جس میں عداوت شمشیر زنی، خون ریزی اور خود غرضی سکھائی گئی ہو پائیں تو راقم کو مطلع فرما کر مشکوری کا موقع دیں۔ اب ہم انجیل کی وہ امتیازی تعلیم جو مسیحیت کو تمام دیگر مروجہ مذاہبِ عالم سے ممتاز کر دیتی ہے پیش کرنے پر مجبور ہیں۔ ذرا صدق دلی اور انصاف پروری سے ملاحظہ فرمائیں۔ سب سے پہلے ہم انجیل سے وہ تعلیم پیش کریں گے جو شمشیر زنی وخون ریزی کے خلاف ہے۔ جب خُداوند مسیح کو گرفتار کیا گیا تو آپ کے ایک حواری پطرس نے تلوار سے سردار کاہن کے نوکر ملخس کا کان اُڑادیا۔ ''یسوع نے اُس سے کہ اپنی تلوار میان میں کرلے۔ کیونکہ جو تلوار کھینچتے ہیں وہ سب تلوار سے ہلاک کئے جائیں گے''(متی ۲۶: ۵۲؛ مکاشفہ ۱۰: ۱۳)۔ خُداوند مسیح نے مذہب کی مختصر سی تعریف اس طرح پیش کی ہے۔ ''خُداوند اپنے خُدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل سے محبت رکھ۔ بڑا اور پہلا حکم یہی ہے۔ اور دوسرا اُس کی مانند یہ ہے کہ اپنے پڑوسی سے اپنے برابر محبت رکھ۔ ان ہی دو حکموں پر تمام توریت اور انبیاء کے صحیفوں کا مدار ہے''(متی ۲۲: ۳۷-۴۰) ''خُدا محبت ہے۔ اور جو محبت میں قائم رہتا ہے وہ خُدا میں قائم رہتا ہے۔ اور خُدا اُس میں قائم رہتا ہے''(۱۔یوحنا ۴: ۱۶)۔ ''اگر کوئی کہے کہ میں خُدا سے محبت رکھتا ہوں اور وہ اپنے بھائی سے عداوت رکھے تو جھوٹا ہے۔ کیونکہ جو اپنے بھائی سے جسے اُس نے دیکھا ہے محبت نہیں رکھتا وہ خُدا سے بھی جسے اُس نے نہیں دیکھا محبت نہیں رکھ سکتا''(۱۔یوحنا ۴: ۲۰)۔ اور خُدا اور اپنے ہم جنس مخلوقوں کی محبت کو لازم ملزوم ٹھہرایا گیا ہے۔ ''جو کوئی والد سے محبت رکھتا ہے وہ اُس کی اولاد سے بھی محبت رکھتا ہے''(۱۔یوحنا ۵: ۱) قول المسیح ''میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں سے محبت رکھو۔ اور اپنے ستانے

والوں کے لئے دُعا مانگو۔ اگر تُم اپنے محبت رکھنے والوں ہی سے محبت رکھو تو تمہارے لئے کیا اجر ہے ؟ کیا محصول لینے والے بھی ایسا نہیں کرتے (متی ۵:۴۴،۴۶)۔ "اگر تیرا دُشمن بھوکا ہو تو اُس کو کھانا کھلا۔ اگر پیاسا ہو تو اُسے پانی پلا" (رومیوں ۱۲:۲۰)۔ محبت کی جامع تعریف ملاحظہ ہو (ا۔کرنتھیوں ۱۳ باب) محبت کا مفصل بیان دیکھئے (اول خط یوحنا تمام)۔

ایک دفعہ ایک اچھے تعلیم یافتہ غیر مسیحی شخص سے میری گفتگو ہو رہی تھی۔ اور ہماری گفتگو کا موضوع "مذہب اور محبت تھا۔ جب میں نے محبت کے متعلق انجیلی تعلیم کو پیش کیا۔ تو وہ فرمانے لگے کہ بھئی وہ کونسا مذہب ہے جو محبت کی تعلیم نہیں دیتا؟ اور کس مذہب میں شمشیر زنی و خونریزی جائز ہے ؟ میں نے کہا کہ انجیل کے باہر تمام مذاہب میں" (یہاں سے یہ گفتگو مکالمہ کی صورت میں چلیگی)

سائل۔ اگر میں اپنی مذہبی کتاب میں سے وہ آیات پیش کردوں جن میں محبت کرنے کی تعلیم ہے تو پھر کیا کہو گے ؟

راقم۔ آخر ایسی کتنی آیات پیش کرو گے ؟

سائل۔ خواہ دو تین ہی ہوں۔ آخر خُدا ہی کی دی ہوئی ہوں گی۔

راقم۔ ہاں سچ ہے کہ آپ کی کتاب میں دو تین سے زائد آیات محبت کی تعلیم نہیں دیتیں۔ پر اس سے آپ کا مذہب محبت پر مبنی ثابت نہ ہو جائے گا۔

سائل۔ کیوں نہیں؟ آخر وہ تین آیات بھی تو خُدا کے الہام سے ہیں۔

(اُن کی منطق دیکھئے) آپ کے قائم کردہ معیار کے مطابق جس کتاب میں محبت کی تعلیم ہو وہ الہامی ہو سکتی ہے۔ میری کتاب کے اندر (نہ کہ باہر) محبت کی تعلیم ہے۔ لہٰذا وہ خُدا کی دی ہوئی کتاب اور دُنیا کا مذہب ہے۔

راقم۔ واہ صاحب ! آپ کا فلسفیانہ استدلال خوب ہے۔ دیکھئے اگر کنکروں کے بڑے سے ڈھیر میں تین چار گندم کے دانے پڑے ہوں تو کیا وہ گندم کا ڈھیر کہلائے گا۔؟ ہر گز نہیں ! اسی طرح جس کتاب میں معرکہ آرائیوں نبرد آزمائیوں اور جدال و قتال کی تعلیم کا حصہ غالب ہو۔ اور محبت کی تعلیم محض تین چار آیات تک محدود ہو وہ ہر گز محبت کی تعلیم نہیں ہو سکتی اور نہ ہی وہ خُدا کی عطا کردہ کتاب اور دُنیا کا روحانی دستور العمل ہونے کے قابل ہے۔ اب انجیل شریف میں متی سے لے کر مکاشفہ تک ۲۷ صحائف میں ایک بھی آیت تلوار، خون ریزی اور عداوت کی موید (پیرو) نہیں ہے۔ اور اُس کی تمام تعلیم میل ملاپ، محبت، برداشت و صبر، حلِم و فروتنی۔ خود انکاری و ایثار، ہمدردی اور نیکی و پاکیزگی سے بھری پڑی ہے۔ اس لئے مسیحیت ہی واحد عالمگیر الٰہی مذہب ہے۔

سائل۔ گیارھویں صدی سے تیرھویں صدی عیسوی تک مسیحیوں نے مسلمانوں کے سات جنگیں کیں جن کو "صلیبی جنگ" کہا جاتا ہے۔ تو آپ کس صورت میں اس داغ کو مسیحیت کے پاکیزہ دامن سے دھو سکتے ہیں۔ کیونکہ تاریخی واقعات کا انکار اہلِ دانش سے بعید ہے۔

راقم۔ چونکہ مسلمانوں نے عمداً وقصداً (جانتے بوجھتے) مسیحیوں کے معابد مقدسہ اور مقامات متبرکہ پر قبضہ جما کر اور اُن کی زیارت وعبادت پر ناحق پابندیاں لگا کر مسیحیوں کے مذہبی جذبات کو مجروح (گھائل) کیا۔اور اُن کی امن پسندی، صبر پروری اور شرافت سے ناجائز فائدہ اُٹھایا اس لئے اگر مسیحی اپنے جائز مطالبات کے حصول کی خاطر لڑے تو محض اس لئے کہ مسلمانوں نے اپنی تحریصاتِ نفسانیہ (جسمانی لالچ) اور اغراض جسمانیہ کے زیر اثر خود اُن کو اس قسم کا قدم اُٹھانے پر مجبور کیا۔

دوم۔ حروبِ صلیبیہ کی علت غائی (حاصل، نتیجہ) ملک گیری نہ تھی۔اور نہ دولت وثروت اور بیگانی عورتیں چھیننے یا بلاوجہ جہاد کرنے کی ہوس نے اُن کے جذبات کو جنگ کے لئے متحرک (حرکت کرنے والا) کیا۔جیسا کہ مسیحیت کے باہر تمام دیگر اقوام میں ہمیشہ یہ ہوتا آیا ہے۔

سوم۔ ہندو مسلمان اقوا (قوت) نے حق تلفی وظلم اور محاربہ ومکابرہ (لڑائی جھگڑا) کر کے ہمیشہ اپنی مذہبی کُتب کے فرامین کی تعمیل کی ہے ۔ لیکن مسیحیوں نے صلیبی جنگوں کے ذریعے انجیل مقدس کی خلاف ورزی اور مخالفت کی۔ کیونکہ انجیل میں ایک بھی ایسا حکم نہیں جو حروب صلیبیہ کا محرک وموید ہو۔ بلکہ صاف لکھا ہے "تُم جانتے ہو کہ غیر قوموں کے سردار اُن پر حکومت چلاتے اور امیر اُن پر اختیار جتاتے ہیں۔ تُم میں بڑا ہونا چاہئے وہ تمہارا خادم بنے۔اور جو تم میں اوّل ہونا چاہئے وہ تمہارا غُلام بنے (متی ۲۰:۲۵-۲۷)۔" کیونکہ ہم اگرچہ جسم میں زندگی گزارتے ہیں۔ مگر جسم کے طور پر لڑتے نہیں۔اس لئے کہ ہماری لڑائی کے ہتھیار جسمانی نہیں" (۲۔کرنتھیوں ۱۰:۳-۴؛ افسیوں ۶:۱۰-۱۸)۔

چہارم۔ اگر کوئی شخص نسخہ استعمال نہ کرے اور مرض سے صحت یاب نہ ہو تو اس سے کُتب حکمت کا نقص ثابت نہ ہوگا۔اسی طرح اگر کوئی مسیحی لڑائی جھگڑے کرے تو اُس کی اس کجروی کی علت انجیل کی تعلیم کو قرار دینا محض خوش فہمی اور ضد ہے۔

جنگی ہتھیاروں کی موجودگی محبت پر دلالت نہیں کرتی۔ بلکہ زور اور زبردستی پر۔اور خُداوند مسیح نے فرمایا۔ "جو تلوار کھینچتے ہیں وہ تلوار ہی سے مارے جائیں گے" (متی ۲۶:۵۲)۔ "میں تُم سے کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو کوئی تیرے دہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اُس کی طرف پھیرے دے" (متی ۵:۳۹)۔اگر اہلِ دُنیا مسیح کے ان اقوال کی تعمیل کرنے لگ جائیں تو آج یہی خارستان (دُنیا) جنت کا نمونہ بن جائے۔

سائل۔ پُرانے عہد نامے میں یہودیوں نے مختلف قوموں کے ساتھ متعدد لڑائیاں لڑیں۔اور توریت میں جنگ کے خلاف امتناعی احکام کا وجود نابود ہے۔

راقم۔ توریت کا مذہب مذہب الٰہی کی ناقص حیثیت تھا۔ خُداوند مسیح عہدِ جدید کے بانی ہو کر اُسی کو کامل کرنے آئے تھے۔ ہر شے کا کمال یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ کسی وقت ناقص اور ادھوری تھی۔ مسیحی مذہب توریت کے ناقص مذہب ہی کی کامل حالت ہے۔اس لئے انجیلی کامل مذہب کے مقابلے میں توریت کے ناکامل مذہب کو رکھ کر اُس کے نقائص بیان کرنا تحصیل لاحاصل ہے۔ جس طرح ایک گنبد کو تعمیر کرنے کے لئے اُس کے نیچے اینٹوں کا عارضی سا سہارا لگایا جاتا ہے۔اور جونہی وہ گنبد مکمل ہو جاتا ہے تو اُس ماتحت قالب کو گرا دیا جاتا ہے۔اسی طرح عہدِ عتیق میں معاشرت ومذہب مخلوط صورت میں تھے۔ عہدِ جدید میں آکر مذہب الٰہی کمالیت کو پہنچا اور معاشرت کو اُس سے جُدا کیا گیا۔ جس طرح پھول اور پھل ایک خاص معیاد تک اکٹھے

رہتے ہیں۔اور جونہی پھل ترقی کرنے لگتاہے پھول خود بخود جھڑ جاتاہے۔اسی طرح عہدِ عتیق میں معاشرت ومذہب مخلوط صورت میں تھے۔اور خُداوند مسیح نے دونوں کو یکسر جُدا کردیا۔اس لئے اس قسم کااعتراض کرنے سے پہلے انجیلِ مقدس کی پوری واقفیت حاصل کرلیناضروری ہے۔یہ بھی غلط ہے کہ توریت میں خُون ریزی کے خلاف حکم نہیں۔لکھاہے۔"توخون نہ کر"۔

دوم۔ہم لوگ یہودی یاموسائی(حضرت موسیٰ کاپیرو) نہیں بلکہ مسیحی ہیں۔

سوم۔یہ ماناکہ پُرانے عہد میں یہود کے قومی جنگوں کاذکر موجود ہے مگراُن جنگوں کی نوعیت قرآن اورویدک محاربات (لڑائی) سے غیر ہے۔یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ یہود نے کبھی بھی اپنے مذہب کی جبری اشاعت کی غرض سے دیگراقوام سے جنگ نہیں کی۔اگر مذہبی اشاعت اُن کی جنگوں کی علت غائی(حاصل،نتیجہ) تھی توآپ بائبل مقدس میں سے کوئی ایسامقام پیش کرکے ثابت کریں۔اوردوسری بات قابل غور یہ ہے کہ کبھی ان جنگوں کے صادر(نافذ) میں خُدانے اُنہیں بہشت کی خوشیاں عطا کرنے کاوعدہ نہیں کیا۔جیسے کہ قرآن،وید اورگیتا میں نہایت کُھلے الفاظ میں ایسے انعامی اشتہار خُدا کی طرف سے موجودہیں۔یہودیوں نے صرف تمدنی وسیاسی اغراض کے حصول کی خاطر غیر اقوام سے محاربے(جنگ،لڑائی،جھگڑے) کئے۔پس جس شے کی کمی ہواُسی کی ضرورت ہواکرتی ہے۔دُنیا میں محبت کاسخت افلاس(بھوک،غربت) بلکہ قحط ہے۔اورمسیحیت صرف یہی شے دُنیا کو بخشی ہے۔اس واسطے وہ دُنیا کی سب سے بڑی روحانی واخلاقی ضرورت کوپورا کرتی اورجنت کے دروازے اُس کے لئے کھولتی ہے۔اَے منکران مذہب! مسیحیت کے حلقہ بگوش ہوکراطمینان قلبی اورسکون باطنی کوجلد حاصل کریں۔مذہب سے بیزاری کی وجوہات بیان کردی گئیں۔اوراُن کاشافی اوربے خطاعلاج بھی ہم نے لکھ دیا۔اب یہ آپ کااختیار ہے کہ اُس سے فائدہ اُٹھائیں یانہ اُٹھائیں۔

لکل شیی اذافارقتہ عوض ولیس للہ ان فارقت مزعوض

"مطلب۔ہراعلیٰ سے اعلیٰ چیز ہر عزیز سے عزیز ہستی جس سے تمہیں جُداہوناپڑے،اس دنیامیں کسی نہ کسی شکل میں اُس کوعوض مل سکتاہے۔لیکن یادرکھواگراللہ سے جُداہوجاؤگے تواُس کابدل کہیں نہیں پاؤگے"۔

مسیحیت کی مخالفت

لوگ مسیحیت پرواہیات(بیہودہ)اعتراضات کی بوچھاڑ کرکرے اُس کی شان کو گھٹانے کی ہمیشہ اس لئے کوشش کرتے ہیں کہ:۔

اوّل۔وہ جانتے ہیں کہ مسیحیت کامعیار روحانی بہت بلند ہے۔جب وہ اپنے مذہبی اصولوں کو مسیحیت کی لاثانی تعلیمات کے مقابلہ میں کمزور اورحقیر دیکھتے ہیں تواُن کو جھٹ یہی تجویز سوجھتی ہے کہ چونکہ ہمارے اصول تومسیحیت کی بلندی تک پہنچنے سے قطعی قاصر ہیں۔اس لئے کس طرح انجیلی اصولوں کی جاوبیجاتاویلیں کرکے اوراُن کو گھٹاکراپنے برابر کرلیں۔وہ مسیحیت کے حج قطعیہ(وہ ارادے جن میں شک وشبہ ہو)اور براہین شافیہ(ایسی دلیل جن سے شبہ رفع ہو) کے بالمقابل مشککانہ(جن سے خوشبوآئے)دلائل سے صف آراء ہیں۔لیکن مسیحیت کے نور کو پھونکوں سے بجھانامحال ہے۔

دوم۔وہ مسیحیت کو ایک بدیسی (دوسرے دیس کا) مذہب سمجھتے ہوئے بدیسی حکومت کی طرح اُس سے بھی دامن چھڑانا چاہتے ہیں۔حالانکہ مذہب صرف حوائج روحانیہ (روحانی حاجت) واخلاقیہ کی تسکین وآسودگی کا ذمہ دار ہے۔اور حکومت محض جسمانی ونفسانی خواہشات کو پورا کرنے کا ذریعہ ہے۔جس قدر رُوح جسم سے اعلیٰ ہے اُسی قدر مذہب کا نکتہ نظر حکومت سے بدرجہا اعلیٰ وارفع ہے۔ایسے لوگوں کو خوب جان لینا چاہئے کہ مسیحیت مغربی مذہب نہیں بلکہ ایشیائی ہے ۔یعنی اُس نے جنم ایشیا میں لیا تھا تاکہ کل دُنیا کا دستور العمل ہوکر اپنی روحانی واخلاقی برکات وحسنات کو من حیث الاجتماع (ایک بڑی گروہ) تمام صفحہ گیتی (دُنیا، عالم) پر پھیلادے۔اور تمام اقوام عالم کو واحد برداری بناکر ذات پات اور رنگ ونسل کے امتیازات کی جان کا فاتحہ پڑھ دے۔

سوم۔لوگ مسیحیت کے اس لئے بھی مخالف ہیں کہ مسیحی مذہب ادنیٰ واعلیٰ کے امتیازات کی نفی کو ایک آنکھ دیکھ نہیں سکتا۔اور مسیحیت کا سب سے بڑا مدعا یہی ہے کہ آقا وغلام اور محمود وایاز کو ایک ہی سلک (دھاگا) اتحاد واشتراک (شراکت) میں منسلک کرکے دُنیا کو ایک واحد برداری بنادے۔"تُم سب جتنوں نے مسیح میں شامل ہونے کا بپتسمہ لیا مسیح کو پہن لیا۔نہ کوئی یہودی رہانہ یونانی۔نہ کوئی غلام نہ آزاد۔نہ کوئی مرد نہ عورت کیونکہ تُم سب مسیح یسوع میں ایک ہو"(گلتیوں ۲۷:۳-۲۸؛کُلسیوں ۱۱:۳)۔چونکہ اس قسم کے مساوات کے قیام کا دوسرا نام اعلیٰ اقوام کی امتیازی عظمت اور بزرگی کی نفی ہے ۔اس لئے لازمی امر ہے کہ وہ مسیحیت کو پنپتی (ترقی کرنا) ہوئی دیکھ کر گلِ حکمت کی ہنڈیاں کی طرح اندر ہی اندر چرغ کھایا (گردش کرنا، چکر کھانا) کریں۔اس کا مقاطعہ (کاٹنا، تعلق نہ رکھنا) کریں اور اس کی جلاوطنی کی دعائیں مانگا کریں لیکن "اگر دعائے طِفلاں مستجاب بودے یک معلم در عالم زندہ نہ ماندے"۔

چہارم۔جب ایک ڈاکٹر مریض پر جراحی عمل (چیر پھاڑ کا عمل) کرتا ہے۔تو شدت درد کے باعث مریض اکثر بے اختیار ہوکر ڈاکٹر کو کوستا ہے۔اور ڈاکٹر کو اپنا دشمن سمجھتا ہے۔تاہم ڈاکٹر مریض کی بھلائی کی خاطر اس طعن وتشنیع (گالیاں سننا) کی مطلق پرواہ نہیں کرتا۔اسی طرح روحانی مریضوں کو مرض عصیاں (گناہوں) اور عارضہ جہالت (لاعلمی کی بیماری) سے آزاد کرنے کے لئے جو عمل مسیحیت کررہی ہے وہ ہے توان کے لئے کثیر المنفعت (بڑا فائدہ) لیکن عارضی طورپر وہ بلاوجہ مسیحیت کے خلاف شور مچارہے ہیں۔لیکن مسیحیت کروڑوں جانوں کی سلامتی اور بہتری کی اُمید پر اس تمام مخالفت ومخاصمت (دشمنی) اور مُنافرت (نفرت) کی طرف سے آنکھیں بند کرچکی ہے۔

ہم تو سمجھتے ہیں کہ مخالفین مسیحیت معاونین مسیحیت ہیں۔اگروہ منفی ہیں تو مسیحیت مثبت، برق (بجلی) ہمیشہ منفی ومثبت کے اتصال ہی سے پیدا ہوتی ہے۔جس قدر مخالفت شدید اور اُس کے خطرات عظیم ہوتے ہیں۔اُسی قدر خود حفاظتی اور مقابلہ کے سامان عظیم ہوتے ہیں۔اگر مخالفت اور خطرہ نہ ہو تو مضبوطی اور استقلال (قیام، مضبوطی ،قرار) کی نفی ہوگی ۔ ہم مشکور ہیں اُن مخالفین کے جو مسیحیت کے لئے وجہ استحکام (استواری پُختگی) ہیں۔

(۷)

معیارِ الہام

گذشتہ ابواب میں ہم مسئلہ الہام پر روشنی ڈالتے ہوئے الہام کی اشد ضرورت کو ثابت کر چکے۔اور دِکھا چکے کہ حقائق ودقائق (دقیقہ کی جمع ،باریکیاں) الٰہیہ اور رموز اسرار لطیفہ رُوحانیہ کے ادراک وتفہیم کے لئے عقلِ مجرد کی رہنمائی کافی نہیں ہے۔اور نہ ہی عقل کے حاصلات ونتائج میں مطابقت تام (تمام) ہے۔اس لئے کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنا قطعی ناممکن اور معلوماتِ عقلیہ پر اپنے ایمان وایقان (یقین ہونا) کی بنیاد رکھنا سراسر غیر معقول ہے ۔جس طرح دُنیامیں سچ کی بہ نسبت جھوٹ کا دائرہ اثر وسیع ہے اُسی طرح دُنیامیں سچے انبیاء کی بہ نسبت جھوٹے نبیوں کے دعویٰ نبوت کرنے کا زیادہ احتمال ہے۔چنانچہ ایساہی ہوتارہا۔(۱۔سلاطین ۶: ۲۲-۲۸) میں جھوٹے نبیوں کا نقشہ موجود ہے۔"رب الافواج یوں فرماتا ہے کہ اُن نبیوں کی باتیں نہ سُنو۔جو تُم سے نبوت کرتے ہیں۔وہ تُم کو بطالت (جھوٹ) کی تعلیم دیتے ہیں۔وہ اپنے دِلوں کے الہام بیان کرتے ہیں۔نہ کہ خُداوند کے مُنہ کی باتیں"(یرمیاہ ۱۶: ۲۳، ۲۱، ۳۲؛ ۱۴: ۱۴) اور خُداوند مسیح نے فرمایا۔"جھوٹے نبیوں سے خبر دار رہو جو تمہارے پاس بھیڑوں کے بھیس میں آتے ہیں۔مگر باطن میں پھاڑنے والے بھیڑیئے ہیں"(متی ۷: ۱۵)۔اسی طرح صحائف مطہرہ میں بار بار جھوٹے نبیوں سے محتاط رہنے اور اُن کے گمراہ کن خیالات و باطل تعلیمات سے خبر دار رہنے کے متعلق تاکید پائی جاتی ہے۔پس ہم کس طرح جانیں کہ جو بھی نبی دعویٰ نبوت کرے وہ سچاہے یا جھوٹا جس طرح کھرے اور کھوٹے سونے میں تمیز کرنے کے لئے ایک معیار یا کسوٹی (سونا جانچنے کا آلہ) ہوتی ہے۔اُسی طرح کلام مقدس میں ہر دو قسم کے انبیاء کی جانچ کا معیار رکھا گیا ہے۔اگر اُس معیار پر پرکھے بغیر کسی نبی کی اندھادُھند تقلید (پیروی) کی جائے تو راہِ حق سے گمراہ ہونے کا سخت اندیشہ ہے۔چنانچہ میری ذاتی تحقیقات کے مطابق الہام اور نبوت کی جانچ کا معیار ان پانچ اصولوں پر مشتمل ہے۔یعنی ۱۔معجزہ۔ ۲۔پیشینگوئی۔۳۔نیک سیرتی۔۴۔مطابقت بہ الہام ماقبل ۵۔مسیح کا اقرار۔

معجزہ

الہامِ الٰہی فوق العادت امر ہے۔جب کوئی فوق العادت ظہور منصہ شہود پر جلوہ گر ہوتا ہے توانسانی عقل فطری طور پر اُس کی صحت کا ثبوت طلب کرتی اور جب تک ثبوت نہ ملے مشکوک ومشتبہ نگاہوں سے دیکھتی ہے۔دُنیاہی میں دیکھئے کہ جب کسی سلطنت کا سفیر کسی دوسرے بادشاہ کے پاس کوئی شاہی پیغام لے کر جاتاہے۔تواُس وقت تک اُس کو شاہی نمائندہ تسلیم نہیں کیاجاناجب تک وہ اپنے ثبوتِ سفارت میں کوئی شاہی تصدیق نہ دکھائے۔جب وہ بادشاہی مہر دِکھاتا ہے تواُس کے دعویٰ سفارت کو حق سمجھا جاتااور اُس کے الفاظ کو عین بادشاہ کے الفاظ سمجھا جاتا ہے۔جبکہ عقلِ انسانی دُنیوی معمولی باتوں کی صحت وعدم صحت کے متعلق تصدیق اور یقینی ثبوت کا مطالبہ کرتی ہے۔توکس قدر فوق العادت امور کے متعلق اُس سے زیادہ قوی ثبوتوں کی ضرورت نہ ہوگی۔جب کوئی نبی مِن جانب اللہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تواُس کواپنے دعویٰ کا ثبوت معجزات کے ذریعے دیناہوتا ہے۔اور لازم ہے کہ وہ فوق العادت پیغام کو فوق العادت نشانوں کے ساتھ اہل دُنیا کے سامنے پیش کرے۔اور اگر وہ ایسانہ کرے تو دُنیا کو حق حاصل ہے کہ اُس کے پیغام کو الٰہی

پیغام نہ مانے۔ موسیٰ پر جب توریت نازل ہوئی تو اُس نے اپنے الہام اور دعویٰ نبوت کو بڑے بڑے معجزات سے ثابت کیا(استثنا ۱۰:۳۴-۱۲)اور جو نبی معجزات سے اپنی نبوت نہ دے پر سابقہ الہامی صحائف سے اُس کا پیغام مطابقت رکھے تو وہ پہلی کتابوں کا واعظ ہی ہو سکتا ہے۔ نہ کہ اس سے زیادہ جب پُرانے عہد کا حد رواج اختتام پذیر ہوا۔ تو نئے عہد کی بنیاد خُداوند مسیح نے رکھی۔ اور وہ ہزار معجزوں کا ایک معجزہ تھا۔ اُس کی تمام زندگی فوق العادت حقائق واظہارات کا ایک حسین و جمیل مجسمہ تھی۔ اُس نے اپنے پیغام کے من جانب اللہ ہونے کے ثبوت میں بے شمار معجزے دکھائے۔ اور فرمایا کہ "جو کام باپ نے مجھے بھیجا ہے"(ا۔یوحنا ۳۶:۵)اور آپ کے صعود فرمانے کے بعد رسول یہ گواہی دیتے ہیں۔"اے اسرائیلی مردو! یہ باتیں سُنو کہ یسوع ناصری ایک مرد تھا۔ جس کا خُدا کی طرف سے ہونا تُم پر ثابت ہوا۔ اُن معجزات اور اچنبھوں اور نشانیوں سے جو خُدا نے اُس کی معرفت تمہارے بیچ میں دکھائیں۔ جیسا تُم آپ بھی جانتے ہو"(اعمال ۲۲:۲)۔ پھر مسیح کے رسولوں نے اپنی رسالت کو معجزات سے ثابت کیا۔ ملاحظہ ہو(اعمال ۱:۳-۱۰؛۳۶:۱۰-۴۲؛۴۲:۱۱-۱۴؛۲۰:۱۶؛۱۶-۱۸؛۹:۲۰-۱۴)پس معجزات کسی نبی کے مِن جانب خُدا ہونے کا ڈائرکٹ ثبوت ہیں۔ اور جو نبی پیغمبر یا رسول معجزات نہ دکھائے۔ وہ انبیاء وہ مرسلین کی فہرست میں شامل کئے جانے کئے ہرگز ہرگز لائق نہیں۔ ہاں البتہ جلد باز اور سریع الاعتقاد(جلد یقین کرنا)لوگ ایسے دعویداران نبوت کی کورانہ تقلید پر ایک دم کمر بستہ ہو جاتے اور ضلالت و گمراہی کے لق ودق صحرا کی خاک چھانتے ہیں۔ اور بعض مذہبی کتب کے ذاتی وعادی سے بڑھ کر دعوے کرتے۔ اور خواہ مخواہ بعض لوگوں سے معجزات منسوب کرکے اُنہیں انبیاء صادق کی صف میں کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔ حقیقت متصدقہ کو چھوڑ کر توہمات کو حقیقت کا لباس پہنانا عبث ہے۔ عہدِ عتیق اور عہدِ جدید ہر دو کی بنیادیں معجزات پر رکھی گئی ہیں۔ اور انجیل میں آکر الہام کامل ہو گیا۔ اور اُس کے وسعت رواج کا زمانہ تا قیامت ہے۔ اور انجیل نے کسی مزید الہامی کتاب کے نزول کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔ بلکہ کل واقعات جو ابتدائے عیسویت سے تا قیامت اِنسان اور خُدا کے درمیان ظہور میں آنے چاہئیں اُس میں بالتفصیل و تشریح قلمبند ہیں۔ اور معجزات بالخصوص اُس نبی کے لئے ضروری ہیں جو ایک نئی کتاب کا مُلہم اور کسی نئے دین کا بانی ہونے کا داعی ہو۔ موسیٰ عہدِ عتیق کا بانی تھا۔ اس لئے اُس نے اپنی نبوت کو معجزات سے ثبت کیا۔ اُس کے بعد کے انبیاء کے لئے معجزات دکھانا لازمی شرط نہیں بلکہ معجزہ یا پیش گوئی میں سے ایک کا ہونا ضروری ہے اگرچہ وہ یہ دونوں کام کریں۔ اسی طرح عہد جدید کے بانی نے اس نئی کتاب(انجیلِ مقدس)اور نئے عہد کی بنیاد معجزات پر رکھی۔ اب اگر کوئی تیسری کتاب انجیل کے بعد آئے تو اُس کے مُلہم و منزل علیہ کے لئے معجزات دکھانا ضروری ولابدی(ضروری)ہے۔ لیکن انجیل نے کسی تیسری کتابِ کے لئے بالکل گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔ اس لئے مقدس پولُس رسول فرماتا ہے۔"اگر ہم یا آسمان کا کوئی فرشتہ بھی اُس خوش خبری کے سوا جو ہم نے تمہیں سُنائی کوئی اور خوش خبری تمہیں سنائے تو ملعون ہو"(گلتیوں ۸:۱)۔

پیشینگوئی

"لیکن جو نبی گستاخ بن کر کوئی ایسی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے اُس کو حکم نہیں دیا۔ یا اور معبودوں کے نام سے کچھ کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے۔ اور اگر تم اپنے دل میں کہو کہ جو بات خُداوند نے نہیں کہی ہے اُسے ہم کیونکر پہچانیں۔ تو پہچان یہ ہے کہ جب وہ نبی خُداوند کے نام سے کچھ کہے اور اُس کے کہے کے مطابق کچھ واقع یا پورا نہ ہو تو وہ بات خُداوند کی کہی ہوئی نہیں۔ بلکہ اُس نبی نے وہ بات خود گستاخ بن کر کہی ہے۔ تُم اُس سے خوف نہ کرنا"(استثنا ۲۰:۱۸-۲۳)۔

"وہ نبی جو سلامتی کی خبر دیتا ہے جب اُس نبی کا کلام پورا ہو جائے تو معلوم ہو گا کہ فی الحقیقت خُداوند نے اُسے بھیجا ہے" (یرمیاہ ۲۸:۹)۔ان حوالہ جات سے خوب روشن ہے کہ نبوت کی صحت اور عدم صحت کی جانچ کی معیار پیشنگوئی بھی ہے۔اتنی طاقت نہ تو قلم میں اور نہ ذہن میں ہے کہ بائبل کے تمام انبیاء کی تمام پیشنگوئیوں کو حیطہ تحریر میں لایا جائے۔ناظرین خود تحقیق کر سکتے ہیں۔ہم صرف خُداوند مسیح کی چند پیشینگوئیوں کے پورا ہونے کا ثبوت پیش کریں گے۔آپ نے فرمایا کہ "جھوٹے مسیح اور جھوٹے نبی اُٹھ کھڑے ہوں گے" (متی ۲۳:۲۴-۲۴) چُنانچہ۔

۱۔بعہد ثراجان (۱۱۴ء) میں ایک شخص انڈریو نے مسیحائی کا دعویٰ کیا۔

۲۔ایڈریان کے عہد (۱۳۲ء) میں بار کو کبھ کو مسیح سمجھا گیا۔اور یہود پر اُس کے باعث بہت تباہی آئی۔آخر تنگ آکر یہود نے اُسے جھوٹا مسیح سمجھا۔

۳۔(۴۳۴ء) میں جزیرہ کریٹ میں ایک جھوٹا نبی اُٹھا۔اُس نے موسیٰ ہونے اور لوگوں کو سمندر سے پار کرنے کا دعویٰ کیا۔آخر جھوٹا ثابت ہوا۔

۴۔(۵۲۰ء) میں عرب میں ایک ڈونان نامی جھوٹا مسیح اُٹھا۔اور اپنے یہودی پیروکاروں کے ہمراہ نگرا شہر میں مسیحیوں پر حملہ کر دیا۔آخر مارا گیا۔

۵۔(۵۲۹ء) میں جولیان نامی ایک جھوٹے مسیح نے یہودیوں اور سامریوں سے بغاوت کرائی۔اور بہتیرے ہلاک ہوئے۔حضرت محمد صاحب کی بعثت (رسالت) کا بھی یہی زمانہ تھا۔اور آپ نے فرمایا تھا کہ "مجھے پاتے ہیں لکھا ہوا اپنے پاس توریت اور انجیل میں" (سورۃ اعراف آیت ۱۵۸)۔

۶۔(۷۲۱ء) میں ایک سُریانی مدعی مسیحائی برپا ہوا اور جھوٹا ثابت ہوا۔

۷۔(۱۱۳۷ء) میں یہود نے فرانس میں کسی کو مسیح مان لیا اور ملک بدر ہوئے۔

۸۔(۱۱۵۷ء) میں یہود نے ملک ہسپانیہ میں کسی بناوٹی مسیح کے زیر ہو کر بغاوت کی اور قریباً کل تباہ ہوئے۔

۹۔(۱۱۶۷ء) میں سلطنت فیز کے اندر یہود نے ایک جھوٹے مسیح سے دھوکا کھا کر بہت دُکھ اُٹھایا۔اسی صدی میں عرب میں بھی ایک مسیح اُٹھا۔اور پھر اسی سن میں دریائے فرات کے پار ایک مسیح اُٹھا۔اور دعویٰ کیا کہ میں کوڑھی ہو کر سو رہوں گا اور تندرست ہو کر اُٹھوں گا۔

۱۰۔(۱۲۲۲ء) میں جرمنی میں یہود نے ایک شخص کو مسیح سمجھا اور اُسے ابن داؤد کہنے لگے۔اسی برس وہ ایک عورت سے جو ورمس کی تھی مسیح کے پیدا ہونے کی اُمیدیں رکھتے تھے۔لیکن اُس کے لڑکی پیدا ہوئی۔چودھویں صدی میں ابھی اسی طرح ایک نقلی مسیح اُٹھا۔

۱۱۔(۱۵۰۰ء) میں ربی اسخر لیملا جرمنی میں مسیح پیشتر وہونے کا داعی (دعویٰ دار) ہوا۔اور یہودیوں میں اُس کی باتوں سے بہت سرگرمی اور اُمید پیدا ہوئی۔یہاں تک کہ اُنہوں نے روزوں اور نمازوں کے باضابطہ اوقات مقرر کرے اُس کی انتظاری کی۔مگر لاحاصل ثابت ہوئی۔

۱۲۔(۱۶۲۲ء) میں وہ مشہور جھوٹا سیبتائی زیوی اُٹھا۔اور اپنی جان بچانے کی خاطر آخر محمدی ہو گیا۔

(منقول از کتاب عدم ضرورت قرآن مصنفہ جی۔ایل ٹھاکر داس۔)

اور اُنیسویں صدی میں مرزا غلام احمد[1] قادیانی کو بھی دعویٰ مسیحائی کا شوق چڑایا۔اور ہزاروں بندگان خُدا کو گمراہی میں ڈالا۔آپ نے تحصیل لاحاصل میں اپنی سعی گرانمایہ صرف فرمائی۔تاہم آپ کا خیالی قصر ویسے کا ویسا گنبد بے در بنا رہا۔اسی طرح قیامت تک جھوٹے مسیح و نبی اُٹھتے اور خُداوند مسیح کی پیش گوئی پر مہر صداقت لگاتے رہیں گے۔

---

[1] مرزائت کی مزید تفصیل ضروری ہے۔

پھر خُداوند مسیح کی (یوحنا ۲: ۱۶) کی پیش گوئی (اعمال ۱: ۸؛ ۱: ۹-۲) کے علاوہ ہر زمانے میں پوری ہوتی رہی۔ ہیکل کی بربادی کی خبر دی جو (متی ۲۴: ۱-۲) میں ہے۔ (۷۰ء) میں پوری ہوئی۔ یہوداا سکریوطی کی بے وفائی اور غداری کی خبر جلدی پوری ہوگئی۔ پطرس اور دیگر شاگردوں کی بے وفائی کی خبر جلد پوری ہوئی (اعمال ۱: ۸) میں روح القدس کے نزول اور مسیحیت کی ہمہ رسی وہمہ گیری کی خبر آج تک پوری ہورہی ہے۔ رسولوں کے معجزات کی خبر دی (مرقس ۱۶: ۱۷-۱۸)۔ جو ہمیشہ پوری ہوتی رہی۔ اپنی صلیبی موت کی خبر دی وہ پوری ہوئی۔ زندہ ہونے کی خبر دی وہ بھی پوری ہوئی۔ دوبارہ آنے کی خبر دی وہ بھی پوری ہونے والی ہے۔ برخلاف اس کے مرز قادیانی کی مردم آزاد پیش گوئیوں کا جو حشر ہوا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ڈپٹی عبداللہ آتھم مسیحی مناظر کی موت۔ محمدی بیگم کا نکاح۔ سلطان احمدی کی موت اور پھر شیخ محمد حسین۔ جعفرز ٹلی اور مولوی ابوالحسن تبتی کی موت کی پیش گوئیاں سراسر باطل اور بے بنیاد ثابت ہوئیں۔ پس آپ کے دعویٰ مسیحائی ونبوت کے بطلان کی اور کیا دلیل ہوسکتی ہے۔ نبی صادق کی ہر پیش گوئی کا سچا ہونا اُس کے دعویٰ کی صداقت کی دلیل ہے۔

نیک سیرتی

فرستادہ خُدا اور مدعی نبوت کا نیک سیرت ہونا ضروری ہے۔ اور یہاں نیک سیرتی سے وہ نیکی و پاکیزگی مراد نہیں جو خُدا ہی کی ذات سے خاص ہے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ نبی ورسول کی زندگی بہ نسبت عامتہ لناس کے بہترین ہو۔ خُداوند مسیح نے فرمایا۔ " جھوٹے نبیوں سے خبر دار رہو۔۔۔۔۔ اُن کے پھلوں (اعمالوں) سے تُم اُنہیں پہچان لوگے ۔ کیا جھاڑیوں سے انگور اور اونٹ کٹاروں سے انجیر توڑتے ہیں؟ اسی طرح ہر ایک اچھا درخت اچھا پھل لاتا ہے اور بُرا درخت بُرا پھل لاتا ہے" (متی ۷: ۱۵-۱۷)۔ پولُس رسول فرماتا ہے۔ " کیونکہ ایسے لوگ جھوٹے رسول اور دغا بازی سے کام کرنے والے ہیں۔ اور اپنے آپ کو مسیح کے رسولوں کے ہم شکل بنالیتے ہیں" (۲۔ کرنتھیوں ۱۳: ۱۱)۔ پھر پطرس رسول فرماتا ہے۔ " اور جس طرح اُس اُمت میں جھوٹے نبی بھی تھی۔ اُسی طرح تُم میں بھی جھوٹے استاد ہوں گے۔۔۔۔ اور بہتیرے اُن کی شہوت پرستی کی پیروی کریں گے۔ جن کے سبب سے راہِ حق کی بدنامی ہوگی۔ اور وہ لالچ سے باتیں بناکر تم کو اپنے نفع کا سبب ٹھہرائیں گے" (۲۔ پطرس ۱: ۲-۳)۔ مندرجہ بالا مقامات سے نبی کو اُس کی اخلاقی اور عملی زندگی کے نکتہِ نگاہ سے سچا یا جھوٹا کہنا ظاہر ہے۔ اور کوئی یہ نہ سمجھے کہ سب نیک سیرت نبی ہوتے ہیں۔ سب نیک سیرت نبی نہیں پر سب نبی نیک سیرت ہوتے ہیں اور نیک سیرتی کے ساتھ معجزہ یا پیشینگوئی دونوں میں سے ایک قابلیت ضرور اُن میں ہونی چاہئے۔ محض نیک سیرتی نبی ہونے کے لئے کافی نہیں۔ کیونکہ وہ تو غیر نبی میں بھی ہوسکتی ہے۔ اب ناظرین خود فیصلہ کرلیں کہ اس معیار کے مطابق کون کون نبی صادق کہلانے کا حقدار ہے؟

مطابقت بہ الہام ماقبل

جو نبی خُدا کی طرف سے الہام لے کر مبعوث ہو (بھیجا ہوا) اور نبی ہونے کا دعویٰ کرے تو نہایت لازمی ہے کہ اُس کی تعلیم وتلقین اور مضامین وخیالات اپنے سے ماسبق نوشتوں کے ساتھ مطابقت تام رکھیں۔ اور اگر برعکس اس کے اختلاف وتناقض دِکھائیں تو وہ نبی ہر گز خُدا کی طرف سے نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ خُدا متناقض مکاشفے نہیں دے سکتا۔ اُس کے مکشوفات (واضح) میں تعلیم کے لحاظ سے تدریجی ترقی وکمالیت تو لازمی ہے۔ مگر تردید وتنسیخ (منسوخی، باطل کرنا) محال ہے۔ چنانچہ یہ معیار کسی مدعی نبوت کی صداقت کی جانچ کو اُس کی تعلیمات وخیالات کی مطابقت بہ صحائف مُلہمہ (الہام کیا گیا) سابقہ پر مبنی ٹھہراتا ہے۔ واضح ہو کہ عہدِ جدید کی دیوار عہدِ عتیق کی بُنیاد پر اُٹھائی گئی ہے۔ اور اس نئے عہد کے قیام کی وجہ خود عہدِ عتیق میں یوں

مرقوم ''دیکھ وہ دن آتے ہیں خُداوند فرماتا ہے کہ میں اسرائیل کے گھرانے اوریہوداہ کے گھرانے کے ساتھ نیا عہد باندھوں گا''(یرمیاہ ۳۱:۳۱)۔اورعہدِ عتیق کی آخری کتاب کے آخری باب میں یوں مرقوم ہے۔''تُم میرے بندے موسیٰ کی شریعت یعنی اُن فرائض واحکام کو جو میں نے حورب پر تمام بنی اسرائیل کے لئے فرمائے یادرکھو''(ملاکی ۴:۴)۔اس سے بخوبی معلوم ہوسکتا ہے کہ عہدِ عتیق کے ابتدائی، وسطی اورانتہائی صحائف مابعد میں پائے جاتے ہیں۔یہ نہیں کہ آخری صحائف میں توریت کی تنسیخ نہ تردید کی گئی ہو۔بلکہ آخری کتاب بھی توریت ہی کی طرف رجوع کرواتی ہے۔اب عہدِ جدید کی مطابقت عہدِ عتیق کے ساتھ ملاحظہ ہو۔خُداوند مسیح کا قول۔''یہ نہ سمجھو کہ میں توریت یانبیوں کی کتابوں کی منسوخ کرنے آیاہوں منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیاہوں''(متی ۵:۱۷؛لوقا۱۶:۱۶)۔اورایک عالم شرع فریسی کو تمام توریت کا خلاصہ بتاکر فرمایاکہ۔''اِن ہی دوحکموں پر تمام توریت اورانبیاء کے صحیفوں کا مدار ہے''(متی ۲۲:۴۰)۔عہدِ عتیق کی تقسیم ثلاثہ کی تائید فرمائی۔اوراپنے حق میں اُن کی خبروں کا پوراہوناثابت کیا۔''ضرور ہے کہ جتنی باتیں موسیٰ کی توریت اور نبیوں کے صحیفوں اورزبور میں میری بابت لکھی ہیں پوری ہوں''(لوقا۲۴:۴۴)۔مقدس پطرس رسول خُداوند مسیح کو عہدِ عتیق کے تمام انبیاء کی نبوتوں کا نشانہ ٹھہراتا ہے۔''اِسی نجات کی بابت اُن نبیوں نے بڑی تلاش اور تحقیق کی، جنہوں نے اُس فضل کے بارے میں جو تُم پر ہونے کو تھانبوت کی''(۱۔پطرس ۱:۱۰)۔''مگر جن باتوں کی خُدانے سب نبیوں کی زبانی پیشتر خبر دی تھی کہ اُس کا مسیح دُکھ اُٹھائے گا وہ اُس نے اس اس طرح پوری کہیں''(اعمال ۳:۱۸،۲۴؛۷:۵۲)۔پس خُداوند مسیح کے اپنے اقوال اوراُس کے رسولوں کی گواہیوں سے یہ حقیقت خوب روشن ہوتی ہے کہ عہدِ جدید کی بنیاد عہدِ عتیق پررکھی گئی ہے۔اس لئے ان دونوں میں مطابقت تام (تمام)ہے۔اگر مخالفت ومغائرت (ناموافقت)ہوتی توتوریت کے انبیاء کی نبوتوں کو عہدِ جدید کو واقعات کے ثبوت میں پیش کرنا عبث ہوتا۔ ہم بزیر عنوان ''عالمگیر مذہب''اس حقیقت کو بدلائل قاطع وبراہین ساطع (ایسی روشن دلیلیں جو دوسرے کی دلیل کو کاٹیں)ثابت کرچکے ہیں۔پس اگر دونوں کتابوں میں مطابقت دیکھنی ہو تواُس مضمون پر پھر سے غور فرمالیں۔انجیل کے بعد اگراور کوئی نبی کوئی مزید الہامی کتاب لے کر نازل ہو تواُس کتاب کی تعلیمات وخیالات کی مطابقت انجیل کے ساتھ لازمی امر ہے۔انجیل تعلیم دیتی ہے کہ خُدا مجسم ہوا۔ مسیح کا کفارہ حصول نجات کے لئے شرط ہے۔ مسیح خُدا کا بیٹا ہے خُدا کی واحد ذات میں تین اقانیم ہیں۔ مسیح مصلوب ہوامر گیا، تیسرے روز زندہ ہوکر آسمان پر صعود فرماگیا۔وہی دوبارہ آکر تمام دُنیا کی عدالت کرے گا۔اور عدالت انجیل کے مطابق ہوگی۔ختنہ کروانااور قربانیاں چڑھانا غیر ضروری باتیں ہیں۔ان کو چھوڑ کر صرف مسیح کی قربانی پرایمان لاناضروری ہے۔سوائے مسیح کے کوئی دوسرا نجات دہندہ نہیں۔یہ ہیں انجیل کی اصولی تعلیمیں۔اب اگرانجیل کے بعد کوئی اور نبی برپاہواوران تعلیمات واصولات کا قائل ہواوراُنہیں کی تلقین کرے۔توہم ہزار جان سے اُس پر نثار ہونے کی تیار ہیں۔اوراگراُس کی تعلیم اس کے خلاف ہو توہم اپنے مذہبی معتقدات کی بناپر مجبور ہیں کہ اُسے نبی برحق نہ مانیں بلکہ جھوٹانبی سمجھیں۔کیونکہ انجیل کی یہ تاکید ہمیں اجازت نہیں دیتی کہ ہر مدعی نبوت کے قائل ہوجائیں۔''اگر ہم یاآسمان کا کوئی فرشتہ بھی اُس خوشخبری (انجیل) کے سواجو ہم نے تمہیں سُنائی کوئی اور خوشخبری تمہیں سُنائے تو ملعون ہو''(گلتیوں ۱:۸)۔

مسیح کا اِقرار

انبیاء عہدِ عتیق اِس شرط کے ماتحت نہیں ہیں۔کیونکہ وہ مسیح کی پیدائش سے بہت عرصہ پہلے ہوئے ہیں۔لیکن مسیح کے بعد جو بھی کوئی رسالت یانبوت کا دعویدار ہوکر اُٹھے اُس کی پہچان کا یہ حقیقی اور صحیح معیار ہے کہ وہ خُداوند مسیح کااقرار زبان اور عمل دونوں سے کرے۔''اے عزیزو ہر ایک روح کا یقین نہ کرو۔بلکہ روحوں کو آزماؤ کہ وہ خُدا کی طرف سے ہیں یانہیں۔کیونکہ بہت سے جھوٹے نبی دُنیا میں نکل کھڑے ہوئے ہیں۔خُدا کی رُوح کو تم اس

طرح پہچان سکتے ہو کہ جو کوئی روح اقرار کرے کہ یسوع مسیح مجسم ہو کر آیا ہے۔ وہ خُدا کی طرف سے ہے۔ اور جو کوئی روح یسوع کا اقرار نہ کرے وہ خُدا کی طرف سے نہیں۔ اور یہی مخالفِ مسیح کی رُوح ہے"(۱۔ یوحنا ۴: ۲-۳)۔ "پس میں جتاتا ہوں کہ جو کوئی خُدا کی رُوح کی ہدایت سے بولتا ہے۔ وہ نہیں کہتا کہ یسوع ملعون ہے۔ اور نہ ہی کوئی روح القدس کے بغیر کہہ سکتا ہے کہ یسوع خُداوند ہے"(۱۔ کرنتھیوں ۱۲: ۳)۔ مرزا غلام احمد قادیانی آنجہانی نے اپنی عمر عزیز مسیح کو ملعون ثابت کرنے کی کوشش میں ضائع کی مگر ناکام ہی رہے۔ اور قنوطیت ویاسیت (زندگی کا ایک تاریک پہلو دیکھنا، نااُمیدی) کی حالت میں اس عالم آب وگل سے بصد حسرت چل دِیئے۔ انجیل اُس پر اور اُس کے ہم خیالوں پر لعنت کا حکم لگاتی ہے۔ "پس اگر کوئی تمہارے پاس آئے اور یہ تعلیم نہ دے تو نہ اُسے گھر میں آنے دو اور نہ سلام کرو"(۲۔ یوحنا ۱۰: ۱)۔ جس طرح عہدِ عتیق کے انبیاء اپنے الہامی پیغام کو ہمیشہ خُدا سے منسوب کرتے ہیں۔ اُسی طرح عہدِ جدید کے رسول اپنے الہام وکلام کو خُداوند مسیح سے منسوب کرتے ہیں۔ (گلتیوں ۱: ۱۱-۱۲؛ افسیوں ۱: ۱ وغیرہ) اور انجیل کے بعد جو بھی کوئی نبی اُٹھے ضروری ہے کہ وہ مسیح کا اقرار کرے اور اپنے کلام کو مسیح سے منسوب کرے۔ ورنہ اُس کی نبوت بے ثبوت، ناقابل قبول وفضول اور تمام ماقبل وماسبق صحائف کے استقرائی (تلاش کرنا) اصولوں کے خلاف ہو کر باطل ٹھہرے گی۔

یہ امر مخفی نہ رہے کہ مندرجہ بالا پانچ شرائط کا ہر نبی میں موجود ہونا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ بعض انبیاء میں دو۔ بعض میں چار۔ اور بعض میں پانچوں بھی ہوسکتی ہیں۔ مثلاً پولُس رسول نے معجزات دکھائے پیش گوئیاں کیں۔ نیک سیرت تھا۔ اُس کا کلام باقی تمام صحائف مطہرہ (پاک ہونے کا آلہ) سے مطابقت تام (تمام) رکھتا ہے۔ اور اُس نے زبان اور عمل سے مسیح کا اقرار کیا۔ یاد رہے کہ تمام نیک سیرت نبی نہیں بلکہ تمام نبی نیک سیرت ہوتے ہیں۔ اور اس نیک سیرتی سے مراد معصومیت تام (کل) نہیں۔ اور تمام جو مسیح کا اقرار کرتے ہیں رسول نہیں پر تمام رسول مسیح کا اقرار کرتے ہیں۔ اور پانچویں وآخری شرط صرف مسیح کے رسولوں کے لئے لازمی ہے۔ عہدِ عتیق کے انبیاء اس سے آزاد ہیں۔ اگر اب بھی کوئی بائبل کی صحت پر شک کرے اور ہمارے دعویٰ کی مزید تحقیق کرنا چاہئے تو مسیحیوں کے کُتب خانے اور لائبریریاں اُن کی تسلّی کے لئے ہر وقت کھلی رہتی ہیں۔ اور مسیحی علماء نے صحت صحائف مطہرہ کے باب میں متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ مندرجہ ذیل مشہور کتابیں اس موضوع پر زیادہ روشنی ڈالتی ہیں۔ "ہماری بائبل ومسلم علماء"، "میزان الحق"، "کلامِ حق" اور "تصحیف التحریف" وغیرہ۔

(۸)

تجسم الٰہی

''کلام مجسم ہوا''(یوحنا۱۴:۱)

''عقل اور مذہب'' کے زیر عنوان ہم نے یہ ثابت کیا کہ عقل طبعی خُدا کے صحیح اور یقینی علم کے حصول میں قطعی قاصر ہے۔اور موجودات کے محدود دائرہ میں ہزار ہا سال سے گردش کرنے کے بعد اُس کی تحقیق و تدقیق کے حاصلات و نتائج وہی ہیں۔اور اُس کے بعد ''الہام کی ضرورت'' کے زیر عنوان یہ ثابت کیا گیا کہ جب محدود متنزل عقل کے ذریعے خُدا کی ہستی کا صحیح علم حاصل نہ ہو سکا تو خُدا نے الہام کے ذریعے یہ مقصد حل کروایا۔اب یہاں پر ہم دلائل یقینیہ (ایسی دلیل جس پر یقین لازم آئے) و براہین قطعیہ (ایسی دلیل جس سے دوسرے کی دلیل کاٹی جائے) سے ثابت کریں گے کہ عقل محض اور الہام محض سے بھی خُدا کی ماہیت و حقیقت کا یقینی علم حاصل نہیں ہو سکتا۔اور پھر وہ آخری اور صحیح طریقہ پیش کریں گے جس سے یہ مطلب کُلی طور پر حاصل ہو سکتا ہے۔اور سلسلہ وار تینوں مسائل پر مختصر طور پر بحث بھی کریں گے۔

موجودات اور خُدا کا علم

جب ہم موجودات کی تمام اشیا پر ایک تحقیقی اور ہمہ گیر نظر ڈالتے ہیں۔تو اتنا معلوم ہوا ہے کہ اس قصرِ فطرت (فطرت کے محل) کا ضرور کوئی معمار ہے ۔ اور ہم بطور استدلال اِنی (نیزے کی نوک جیسی دلیل) معلول (وہ شے جس کا کوئی باعث یا سبب ہو،اصطلاح منطق میں نتیجہ) سے علت (سبب، جھگڑا) اور مصنوع (بنا ہوا) سے صانع (بنانے والا) کا تصور کر سکتے ہیں۔''کیونکہ جو کچھ خُدا کی نسبت معلوم ہو سکتا ہے وہ اُن کے باطن میں ظاہر ہے۔اس لئے کہ خُدا نے اُس کو اُن پر ظاہر کر دیا۔کیونکہ اُس کی اَن دیکھی صفتیں یعنی اُس کی ازلی قدرت اور الوہیت دُنیا کی پیدائش کے وقت سے بنائی ہوئی چیزوں کے ذریعے سے معلوم ہو کر صاف نظر آتی ہیں۔یہاں تک کہ اُن کو کچھ عذر باقی نہیں''(رومیوں ۱۹:۱-۲۰)۔لیکن مشاہدہ فطرۃ سے صرف اُس کی موجودگی ہی ثابت ہوتی ہے نہ کہ ماہیت اور حقیقت۔مثلاً کسی جنگل میں ہاتھی کے نقش پا (پاؤں کے نشان) دیکھ کر کوئی عقلمند یہی اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس جنگل میں ہاتھی ضرور موجود ہے۔لیکن اُس ہاتھی کے قد و قامت، قوت و ضعف اور رنگ اور تذکیر و تانیث اور دیگر کئی امور کے متعلق اُن آثار پا سے کچھ علم حاصل نہیں ہو سکتا۔بلکہ صرف ہاتھی کی موجودگی ہی ثابت ہو سکتی ہے۔کسی عالیشان عمارت کے دیکھنے سے اُس کے بنانے والے معمار کی محض ہستی ہی ثابت ہو گی، مگر اُس کی شکل و شباہت، خدو خال، عادات و خصائل اور طبیعت و مزاج کا علم عمارت کے مشاہدہ ہی سے حاصل ہونا ناممکن و محال ہے۔اسی طرح مشاہدہ دُنیا مافیہا سے من حیث الآثار صرف اتنا ہی ثابت ہوتا ہے کہ خُدا موجود ضرور ہے۔پر یہ نہیں جان سکتے کہ وہ کیسا ہے؟ مصنوعات کے مشاہدہ سے اگر خالق کا یقینی اور قطعی تصور حاصل ہو سکتا تو دُنیا میں خُدا کی ہستی و ماہیت کے متعلق مختلف و متضاد عقائد وجود میں نہ آتے۔ جہاں تک اِنسان نے اپنی عقل ناقصہ و فکر محدود پر بھروسہ کر کے خُدا کی ماہیت و حقیقت کی تحقیق کی وہاں تک وہ ضلالت و گمراہی میں پڑ گیا۔''یعنی اُن

کے بے سمجھ دلوں پر اندھیرا چھا گیا۔ وہ اپنے آپ کو دانا جتا کر بے وقوف بن گے"(رومیوں ۱:۲۱-۲۲)۔ مشہور یونانی حکیم سینکا کا عندیہ (رائے)اس عقلی گمراہی کے نتیجہ کے طور پر یوں ہے۔

"ایک طرح پر فلاسفر کا مرتبہ خُدا سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ بجز اس کے کہ وہ فانی ہے اور کسی حیثیت سے فلاسفر کا مرتبہ خُدا سے کم نہیں"۔

پھر آرین کا عندیہ اِنسانی عقل کی گمراہی کا یوں آئینہ دار ہے۔ "جہاں تک عقلی واخلاقی زندگی کا تعلق ہے دانشمند شخص خُدا سے کم نہیں ہوتا۔ پس ثابت ہوا کہ عقل دور بین مشاہدہ فطرت سے اُس ذاتِ الٰہی اور وجود لا متناہی کو جو فوق الفہم والعقل ہے جان نہیں سکتی۔

الہٰام اور خُدا کا علم

"لیکن جب دُنیائے اپنی حکمت سے خُدا کو نہ جانا"(ا۔کرنتھیوں ۱:۲۱)۔ تو خُدا نے بذریعہ الہام اپنی ذات صفات کو اِنسان پر ظاہر فرمایا۔اور جو عقدہ عقل مشاہدہ کائنات سے حل نہ کر سکی وہ الہام نے حل کروایا۔ یعنی جس منزل پر پہنچ کر عقل دوربین دنگ اور فہم تیز رو لنگ ہو گئی اُس سے آگے مشعل الہام نے اُس کی رہبری و رہنمائی فرمائی۔ یعنی جو چیزیں نہ آنکھوں نے دیکھیں، نہ کانوں نے سُنیں نہ آدمی کے دل میں آئیں وہ سب خُدا نے اپنے محبت رکھنے والوں کے لئے تیار کر دیں۔ لیکن ہم پر خُدا نے اُن کو رُوح کے وسیلے (بذریعہ الہام) ظاہر کیا(ا۔کرنتھیوں ۹:۱-۱۰) عقل کی روشنی میں تو اِنسان حقائق روحانیہ اور دقائق (دقیقہ کی جمع، باریکیاں) غیر مرئی (وہ چیزیں جو دکھائی نہ دیں) کی تفہیم وتعقیل میں قاصر رہا۔ کیونکہ عقل کا دائرہ تحقیق محسوسات ومرئیات (وہ چیزیں جو دکھائی دیں) تک ہی محدود ہے۔ لیکن خُدا تعالیٰ نے نادیدنی رُوحانی حقیقتیں بذریعہ الہام اِنسان پر ظاہر فرمائیں۔ اب الہام چونکہ حقائق الٰہی کا محض لفظی بیان ہے۔ اور الفاظ اِنسان کے وضع کئے ہوئے اور محدود ہیں۔ اس لئے الہام سے بھی اُس کی ماہیت وکنہ کا ثبوتی تصور اور یقینی علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ لفظ خُدا سے خُدا کے متعلق کچھ علم اس کے سوا حاصل نہیں ہو سکتا کہ لغت کے واضح نے یہ لفظ آفرینندہ کائنات کے لئے وضع کر دیا ہے۔ اگر کسی ایسے شخص کو جس نے کبھی شیر نہیں دیکھا ایک کاغذ پر لفظ شیر لکھ کر دکھائیں تو کیا اُس شہزور درندہ کا صحیح تصور اُس کو ہو جائے گا؟ اگر ایسا ہونا ممکن ہوتا تو کبھی کسی کو شیر دیکھنے کی ضرورت ہی نہ رہتی بلکہ ان تین حروف میں بشکل اصلی نظر آجایا کرتا۔ اور بچے جو جماعت اوّل میں پڑھتے ہیں وہ "خ دا" کے مرکب سے خُدا کو جان لیتے اور یوں بے علم لوگوں کے سوا کوئی بھی دُنیا میں خُدا کا منکر نہ ہوتا۔ جس طرح جغرافیہ کی کتاب میں امریکہ ، جرمن، آسٹریلیا، انگلینڈ اور دیگر صدہا ممالک کے نقشے اور حالات موجود ہیں۔ مگر باوجود اس کے جغرافیہ کے مطالعہ سے ہم اُن ممالک کی بابت کمال علم حاصل نہیں کر سکتے۔ اور نہ کتاب کے ذریعے اُن کی سیر ہی ہو سکتی ہے۔ اور جیسے جغرافیہ کے علم کے باوجود اِنسان میں یہ زبردست خواہش پائی جاتی ہے کہ کسی صورت اُن ممالک کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر لطف اُٹھائے۔ اُن کی سیر وسیاحت سے بہرہ اندوز ہو اور اپنے جغرافیائی علم میں اپنے تجرباتی علم کا اضافہ کرے۔ اسی طرح الہام محض سے عالم لاہوت (تصوف میں مقامات کا وہ درجہ جہاں سالک کو فنا فی اللہ کا مقام حاصل ہوتا ہے) اور خُدا کی ماہیت وکنہ کا تجربی علم اِنسان کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور اُس کے دل میں دیدار الٰہی کی زبردست خواہش بے قرار ہو کر کروٹیں لیا کرتی ہے۔ الہام سے صرف وہ فیوض (فیض کی جمع، فائدے) غیبی اور حقائق لاریبی (ایسے حقائق جن میں شک نہ ہو) لفظی طور پر معلوم ہو سکتے ہیں۔ جن کے جاننے میں عقل مجرد معطل ثابت ہوتی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ خُدا کا یقینی اور صحیح تصور دلانے میں الہام بھی قاصر رہتا ہے۔ اِنسانی فطرت ایک متشکل (صورت قبول کرنے والا) ومتشخص وجود (موجود شخصیت) میں خُدا بینی کا تقاضا کرتی ہے۔ اور نظریات سے آسودہ نہیں ہو سکتی۔

ایک سعیدہ خواہش

خُدائے حکیم وقدیر و قادر نے انسان کی ذات میں خواہش بھی پیدا کردی ہے۔اور جتنی خواہشات اِنسان رکھتا ہے اُن کے پورا کرنے کے لئے نیچر (فطرت) میں سامان بھی ویسے ہی پیدا کردئے ہیں۔اگر کسی کو علم کی خواہش ہے تو علم موجود ہے۔اگر کوئی سیم وزر چاہئے تو وہ بھی موجود ہے۔اگر کچھ سننا چاہے توکان بھی ہیں راگ اوراصوات (صوت کی جمع،آوازیں) بھی ہیں۔اگر اعلیٰ مراتب کی خواہش ہو تو وہ بھی موجود ہیں۔غرضیکہ جیسی جیسی اِنسان کی خواہش ہیں ویسے ویسے اُن کے جواب بھی فطرت کے عجائب خانہ میں موجود ہیں۔ایسی کوئی بھی خواہش نہیں کہ جس کا جواب نہ ہو۔خواہش کا وجود اشیاء خواہیدہ کے وجود پر دلالت کرتا ہے۔اب اِنسان فطری وجبلی طور پر یہ خواہش اپنے دل میں رکھتا ہے کہ وہ کسی صورت اپنے معبود حقیقی ابدی وازلی کے دیدار فیض آثار سے اپنی تشنئہ (پیاسی) دید آنکھوں کی ضیافت کرسکے۔الہامی صحائف خُدا کی چھٹیاں ہیں لیکن خطوط ومراسلات اِنسان کی خُدابینی ویزداں (خدا) پژدہی کی زبردست خواہش کی تسکین کو موجب نہیں ہو سکتے۔یہ جذبہ سعیدہ (نیک بھلا،مبارک) اِنسانی نیچر کا وہ جبلی خاصہ ہے جس کے معصوم وکیف آگیں (نشہ سے بھرا ہو) اثرات سے مسحور ہو کر انسان اپنے پردہ نشین محبوب کے اشتیاق دیدار میں تڑپ جاتا۔اوراُس کے تخیل وتصور کی معصوم وسحر آگیں (جادو سے بھرا ہوا) تجلّی (جلال، جلوہ، ظاہر ہونا) میں اپنے آپ کو کھو دیتا ہے۔اوراُس کے خیالی حسن وجمال کے کیف زا تاثرات اُس کے لطیف جذبات پر کھیلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔یہ وہ جذبہ ہے جو اِنسان کے روحانی وجسمانی قویٰ (قوت) کو سکیڑ کر ایک مرکز پر جمع کردیتا ہے۔اور جب اِنسان کسی صورت اپنی اس عزیز ترین آرزو کو پورا ہوتے ہوئے نہیں دیکھتا تو ناکام تمنا ہو کر یہ سمجھنے لگتا ہے کہ گویا وہ پھٹ جائے گا۔چنانچہ اسی پاکیزہ جذبہ کی ترجمانی موسیٰ چند الفاظ میں یوں کرتا ہے۔"میں تیری منت کرتا ہوں مجھے اپنا جلال دِکھادے" (خروج ۳۳: ۱۸)۔پھر داؤد نبی اپنی ہستی کو خُدا کی محبت کی قربان گاہ پر نثار کرکے یوں اُٹھتا ہے "جیسے ہرنی پانی کے نالوں کو ترستی ہے۔ویسے ہی اَے خُدا! میری روح تیرے لئے ترستی ہے۔میری روح خُدا کی۔زندہ خُدا کی پیاسی ہے" (زبور ۱: ۴۲-۲)۔"صبح کا انتظار کرنے والوں سے زیادہ ہاں صبح کا انتظار کرنے والوں سے کہیں زیادہ میری جان خُداوند کی منتظر ہے" (زبور ۶: ۱۳۰) پھر فلپس خُداوند مسیح سے یہی سوال کرتا ہے۔"اَے خُداوند باپ کو ہمیں دِکھا یہی ہمیں کافی ہے" (یوحنا ۸: ۱۴)۔جبکہ اِنسان کی تمام جسمانی اور روحانی خواہشات کا جواب اُس قادر وکریم نے اسی فطرت کے کارخانے میں دے دیا ہے تو نہایت مناسب اور ضروری ہے کہ وہ اِنسان کی اس نیک ترین اور واجبی خواہش کا بھی کوئی تسلی بخش جواب دے۔

مظہر اور خُدا کا علم

قبل ازیں ہم اچھی طرح سے ثابت کرآئے ہیں کہ موجودات کے مشاہدہ سے صرف خُدا کے وجود باجود ہی کا علم حاصل ہوتا ہے۔یعنی صرف ہی ثابت ہوتا ہے کہ "وہ ہے"۔لیکن یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیسا ہے۔اور الہام سے صرف لفظی اور تمثیلی علم اُس کی حقیقت کا حاصل ہوتا ہے۔لہٰذا ان دونوں صورتوں میں وہ ایک نامظہور اور نامعلوم خُدا رہتا ہے۔اس لئے جو لوگ موجودات کے مشاہدہ سے بطور استدلال انی (نیزے کے نوک جیسی دلیل) یا الہام محض سے لفظی وتمثیلی طور پر خُدا کا ناکامل اور دھندلا سا تصور لے کر اُس کی عبادت کرتے ہیں۔وہ یقیناً ایک نامعلوم خُدا کی پرستش کرتے ہیں۔اور نامعلوم کی پرستش کسی حقیقت کی نہیں بلکہ ایک وہم کی پرستش ہے۔جیسے مقدس پوُلس رسول اتھینے والوں کو فرماتا ہے۔"میں نے سیر کرتے اور تمہارے معبودوں پر غور کرتے وقت ایک ایسی قربان گاہ بھی پائی۔جس پر لکھا تھا کہ نامعلوم خُدا کے لئے۔پس جس کو تُم بغیر معلوم کئے پوجتے ہو۔

میں تمہیں اُسی کی خبر دیتا ہوں"(اعمال ۲۳:۱۷)۔اور خُداوند مسیح نے سامری عورت کو فرمایا۔"تم جسے نہیں جانتے اُس کی پرستش کرتے ہو۔ہم جسے جانتے ہیں اُس کی پرستش کرتے ہیں"(ا۔یوحنا۲۲:۴)۔پس لامحالہ (ناچار،یقیناً)اِنسان کی خُدا طلبی اور خُدا بینی کی فطری خواہش کا جواب دینے اور خُدا کی ماہیت وحقیقت کے یقینی علم کے حصول کے لئے مظہر (جائے ظہور، گواہ) کی ضرورت ہے۔تاکہ ایک تواِنسان اُس کے دیدار فیض آثار سے لطف اندوز ہو کر اپنی خواہش کا جواب پائے۔اور دوسرے اس لطف وادق اور نادیدہ وجود کی خصائص ذاتیہ (اپنی ذات کی خصوصیت) اور شمائل باطینہ (اندرونی عادتیں) سے بحدامکان واقفیت حاصل کرسکے۔اب یہ ظاہر ہے کہ اِنسان محدودالعلم اور ناقص العقل تواپنے محدود قویٰ سے اس بے حد ومحیط کل وجود کو جان نہیں سکتا۔ اس لئے ضرور ہے کہ خُدا تعالیٰ اپنے آپ کو کسی دیدنی اور محدود مظہر میں ظاہر فرمائے ۔ اور وہ مظہر اِنسان اور خُدا کے درمیان برزخ (مصیبت اور آرام کا درمیانی درجہ) کامل ہو کر رشتہ حادث بالقدیم (جو شروع سے نہ ہو اور فانی ہو) قائم کرے۔ چنانچہ وہ مظہر الٰہی خُداوند مسیح ہے۔ اُس نے فلپس کے جواب میں فرمایا۔"اَے فلپس میں اتنی مدت سے تمہارے ساتھ ہوں کیا تو مجھے نہیں جانتا؟ جس نے مجھے دیکھا اُس نے باپ کو دیکھا۔ تو کیونکر کہتا ہے کہ باپ کو ہمیں دِکھا؟ کیا تو یقین نہیں کرتا کہ میں باپ میں ہوں اور باپ مجھ میں ہے ؟"(یوحنا۱۴: ۹-۱۰) یوحنا رسول فرماتا ہے کہ "خُدا کو کسی نے بھی نہیں دیکھا۔اکلوتا بیٹا جو باپ کی گود میں ہے اُسی نے ظاہر کیا"(یوحنا۱: ۱۸)۔ بعض حضرات کہا کرتے ہیں کہ تجسم مستلزم (خدا کے مجسم ہونے کا نظریہ ایسے جیسے کسی کام کو اپنے اوپر لازم کرنے والا) قبائح (قبیحہ کی جمع، برائی، معیوب) عقلیہ (قیاس سے) ہے۔یعنی کہ خُدائے بے حد۔محیط کل،ازلی،ابدی اور قدیم کیونکر حد وحدوث (وجود میں آنے کی حد میں آئے) میں آسکتا ہے۔یعنی لامحدود خُدا محدود کیسے ہو سکتا ہے ؟اس کے متعلق اس قدر عرض ہے کہ اگر خُدائے بے حد کا کسی حد میں آجانا ممتنع (منع کرنے والا) ہے، تواِنسان محدود کا بے حد ہو جانا اُس سے زیادہ محال ہے۔اور اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اِنسان اور خُدا کا ملاپ محال ہے۔ محدود اِنسان اُس لامحدود ہستی کے دیدار سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔جب تک وہ کسی دیدنی مظہر میں ظاہر ہو کر حد وحیز (قید وبند) کی قیود میں نہ آئے۔ ملاپ کی ان دو صورتوں میں سے ایک صورت ہی ممکن ہے۔یعنی کہ یا تو محدود بے حد ہو جائے یا بے حد محدود ہو جائے۔ یہ تو عین قرین عقل (وہ بات جسے عقل قبول کرے) ہے کہ محدود ومتناہی وجود تو کبھی بے حد ہو نہیں سکتا۔اور ذات بے حد کی قدرت واختیار میں ہے کہ حد میں آجائے۔ دراصل حد اور بے حدی میں خصوص وعموم کی نسبت ہے۔اور خصوصیت عمومیت کی ایک فرد ہے۔ خصوصیت ایک خاص کُلی ہے اور عمومیت عام کُلی ہے۔حد میں خصوصیت ہے اور بے حدی میں عمومیت۔ازیں جہت تمام حدود بے حدی کے حیطہ لامتناہی (جس کی کوئی انتہا نہ ہو) میں شامل ہیں۔اُس سے باہر نہیں۔ پس بے حد کا کسی حد میں آجانا محال نہ ٹھہرا۔

دوم: جب خُدا کی ذات بے حد ہے تو ضرور اُس کی صفات بھی بے حد ہوں گی۔اور اُس کی جملہ صفات کاملہ میں سے ایک صفت قدرت ہے۔اور اُس کی اس بے حد ازلی صفت کا نتیجہ یہ محدود اور حادث کائنات ہے۔ جبکہ اُس کی بے حد صفات کے نتائج محدود وحادث ہو سکتے ہیں۔ تو اُس کی ذات کا حد وحدوث میں آجانا کیسے محال ہو سکتا ہے ؟اور اُس کی حد میں آنا اُن شرائط کے ماتحت ہو سکتا ہے جن سے اُس کی ذاتی خاصیت وطبیعت میں فرق نہ آئے۔ اور اگر بے حد کا حد میں آنا امر ممتنع (روکنے والا کام) ہے تو اس سے اُس کا نقص (کمی، برائی) قدرت لازم آئے گا۔ جبکہ محدثات وممکنات اُس کی بے حد قدرت کے آثار ہیں۔ تو مسیح خُداوند "اُس کے جلال کا پرتو اور اُس کی ذات کا نقش ہے"(عبرانیوں ۱:۳)۔جناب رفعت مآب خُداوند مسیح کی رفیع القدر ذات کے ماسوا اور کوئی خُدا تعالیٰ کا مظہر اکمل وافضل نہیں ہو سکتا۔اگر ہو سکتا ہے تو ماہ نخشب (ترکستان کے ایک شہر کا نام جہاں کہتے ہیں کہ حکیم ابن مقنع نے کنوئیں سے ایک چاند بنا کر نکالا تھا جس کی روشنی چار فرسنگ تک پہنچتی تھی) بھی ماہ حقیقی ہو سکتا ہے۔اگر ہو سکتا ہے شیر قالین (شیر کی وہ تصویر جو اکثر

قالینوں پر بنی ہوتی، نمائشی) بھی شیر نیستان (جنگل کا شیر) ہو سکتا ہے۔ آفتاب کی شعاعیں پتھر، لکڑی، مٹی اور دیگر تمام اجسام پر پڑتی ہیں۔ اور آئینہ پر بھی پڑتی ہیں۔ لیکن جس خوبی سے نور خورشید آئینہ میں ظاہر ہوتا ہے اور اُس سے منعکس ہو کر مقابل کی اشیاء پر پڑتا اور اُنہیں مخبط انوار اور بقعہ تجلی بنا دیتا ہے۔ اُس حُسن و خوبی سے اُس کا ظہور اور کسی بھی شئے میں نہیں ہوتا۔ لہٰذا آئینہ ہی اپنی انتہائی آبداری وصفائی کے لحاظ سے سورج کا مظہر کامل ہو سکتا ہے۔ اسی طرح خُداوند مسیح کی عدیم الھیم ہستی اور فقید المثال (جس کی کوئی مثال نہ ہو) ذات اپنی انتہائی پاکیزگی اور خصوصیات کاملہ الٰہیہ کے باعث تمام دیگر افراد عالم سابقہ و موجودہ سے ممتاز اور افضل واکمل ہے اور انوار الوہیت کو قبول کر کے اس منصہ شہود (وہ جگہ جہاں سے کسی چیز کا جلوہ دکھایا جائے) پر منعکس کرنے کی قابلیت وصلاحیت تام (تمام، پورا) رکھتی ہے۔ لہٰذا خُداوند مسیح ہی خُدا کا مظہر جامع ہو سکتا ہے۔ اور اسی واسطے عقلِ سلیم اُس کے اس دعویٰ کی حقانیت و صداقت کو بلا عُذر قبول کرتی ہے کہ "میرے باپ کی طرف سے سب کچھ مجھے سونپا گیا۔ اور کوئی بیٹے کو نہیں جانتا سوائے باپ کے اور کوئی باپ کو نہیں جانتا سوائے بیٹے کے اور اُس کے جس پر بیٹا اُسے ظاہر کیا چاہئے" (متی ۱۱:۲۷) "میں باپ میں سے نکلا اور دُنیا میں آیا ہوں پھر دُنیا سے رخصت ہو کر باپ کے پاس جاتا ہوں" (یوحنا ۱۶:۲۸، ۸:۴۲)۔

ایک بدیہی مثال

خُدائے تعالیٰ الطف وادق (نہایت مشکل نیکی) اور غیر مرئی (وہ جس کو دیکھا نہ جا سکے) وجود ہے اور انسان کی طبعی کثیف (ناپاک) آنکھیں اُس حقیقت لطیفہ مخفیہ (دلچسپ پوشیدہ حقیقت) اور وجود نامظہوری (جو ظاہر نہ ہو) کو تجربہ بصارت (نظر) میں نہیں لا سکتیں۔ لیکن انبیاء و مرسلین و مقربین نے اُس کی آواز جانفزا (دل کو خوش کرنے والا) کو ازمنہ سابقہ (پچھلے زمانے) میں طرح بطرح سُنا۔ اور اُس کے پاک پیغام کو صحائف مطہرہ میں قلمبند فرمایا۔ چنانچہ اُس نامظہور و نادیدہ مگر متکلم وجود کی مثال گراموفون ہے۔ اس میں متکلم کی صرف آواز سنائی دیتی ہے مگر صورت نظر نہیں آتی۔ اس حقیقت کے اظہار کے لئے ایزد تعالیٰ نے فونو گرافر (ایک آلہ جس کے ذریعہ آوازیں خود بخود قلم بند ہو جاتی ہیں) کی عقل کی روشن کیا کہ وہ ایک ایسی ایجاد کرے جو اُس کی نادیدہ مگر متکلم حیثیت کی آئینہ داری کرے۔ چنانچہ عہدِ عتیق کا زمانہ خُدا کے محض تکلم کا زمانہ تھا نہ کہ ظہور کا۔ اگرچہ وہ عارضی مظاہر میں کبھی کبھی ظاہر ہوتا رہا۔ پر وہ ظاہر جامع اور مستقل نہ ہونے کے باعث اِنسان کی خُدا بینی و یزداں پژوہی کی فطری خواہش کو آسودہ نہ کر سکتے تھے۔

ٹاکیز فلم میں اداکاروں کی آواز شکل اور حرکات وسکنات تینوں باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ چنانچہ خُدا کی حیثیت ظہوری (تجسم) کی مثال ٹاکیز فلم ہے۔ وہی حقیقت نامظہوری ملبوس مجاز میں کثیر معانی کے ساتھ بشریت میں بس گئی۔ وہی لطیف ہستی مادی ظاہری جسم میں سما گئی۔ اُسی غیر مرئی (وہ جس کو دیکھا نہ جا سکے) لطیف (دلچسپ) وجود نے "اِنسانی شکل اختیار کی" اور "اِنسانوں کے مشابہ ہو گیا" (فلپیوں ۲:۸) چنانچہ اس حقیقت کے اظہار کے لئے اُس خُدا نے فلم کے موجد (بنانے والے) کے ذہن و عقل کو منور کیا کہ ایک ایسی ایجاد کرے جو اُس کے تجسم اور ظہور کی ایک واضح مثال قائم کر دے۔ چنانچہ گراموفون (ایک آلہ جس کے ریکارڈ سے آواز نکلتی ہے) اور ٹاکیز فلم کے ذریعے ہم خُدا کے بطون و ظہور کی حیثیاتِ متناسبہ (تناسب رکھنے والا) کا صحیح تصور کر سکتے ہیں۔ بدبہیات (ظاہری دلیل) و مرئیات (وہ جسے دیکھا جا سکے) ہی کے ذریعے نادیدنی روحانی حقیقتوں کا ثبوتی تصور ہم حاصل کر سکتے ہیں۔ "کیونکہ یہ آنے والی چیزوں کا سایہ ہیں" (کلسیوں ۲:۱۷)۔ پس مظہر کے ذریعے خُدا کی ذات وصفات کا ثبوتی تصور اور ماہیت و حقیقت کا یقینی علم حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے بذریعہ مظہر وہ ایک معلوم خُدا ثابت ہوا۔ اور اُس کی عبادت "ایک معلوم خُدا کی عبادت" ہے۔ اور ذاتِ مظہر چونکہ مراۃ

الحق (سچائی کا آئینہ) ہے (یوحنا۹: ۱۴؛ کلسیوں ۱۵:۱)اس لئے خُدا کی صفاتِ کاملہ و بالغہ کا ظہور اُسی سے ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم خُداوند مسیح کی الوہی صفات کو بھی مجملاً حیطہ تحریر میں لاتے ہیں تاکہ ناظرین بخوبی سمجھ سکیں کہ کلمتہ اللہ (مسیح) کن معانی میں خُدا کا مظہر جامع و کامل ہے۔

قُدرت واِختیار

خُداوند مسیح نے اپنے اِختیار وقُدرت کو خُدائی قدرت واِختیار کے ساتھ ملایا اور یہ دعویٰ کیا۔ "کیونکہ جس طرح باپ مردوں کو اُٹھاتا اور زندہ کرتا ہے۔ اُسی طرح بیٹا بھی جنہیں چاہتا ہے زندہ کرتا ہے" (یُوحنا۵: ۲۱)۔ اور اُس نے اپنے اس دعویٰ کو عملی طور پر ثابت بھی کیا۔ یعنی اُس نے لعزر کو اپنی قدرت اور اختیار سے زندہ کیا۔ "اور یہ کہہ کر اُس نے بلند آواز سے پکارا کہ اَے لعزر نکل آ" (یوحنا۱۱: ۴۳) اور وہ چار دن کا مرِدہ ایکدم قبر سے باہر نکل آیا۔ اور عبادتخانے کے سردار یائر کی مرِدہ لڑکی کو یہ الفاظ کہہ کر زندہ کیا۔ "اَے لڑکی میں تجھ سے کہتا ہوں اُٹھ" (مرقس ۵: ۴۱)۔ پھر نائن شہر کی ایک بیوہ عورت کے مرِدہ بیٹے کو یہ کہہ کر زندہ کیا۔ "اَے جوان میں تجھ سے کہتا ہوں اُٹھ" (لوقا۷: ۱۴)۔ اور وہ لڑکا فوراً زندہ ہو گیا اور سبت کے روز کفر نحوم کے عبادت خانے میں ایک شخص میں بدروح کو یہ کہہ کر نکالا۔ "چپ رہ اور اس میں سے نکل جا" (مرقس ۱: ۲۵)۔ اور جب بدروح اُس میں سے نکل گئی تو لوگ حیران ہو کر بحث کرنے لگے۔ "کہ یہ کیا ہے؟ یہ تو نئی تعلیم ہے۔ وہ ناپاک روحوں کو بھی اختیار کے ساتھ حکم دیتا ہے۔ اور وہ اُس کا حکم مانتی ہیں" (لوقا۱: ۲۷)۔ اور بھی دیکھو۔ "یہ کیسا کلام ہے؟ کیونکہ وہ اختیار اور قدرت سے ناپاک روحوں کو حکم دیتا اور وہ نکل جاتی ہیں" (لوقا۴: ۳۶)۔ نہ صرف وہ آپ ہی ایسی اخیتار رکھتا تھا بلکہ دوسروں کو بھی وہ اختیار دے سکتا اور دیتا تھا۔ ملاحظہ ہو۔ "پھر اُس نے اپنے بارہ شاگردوں کو پاس بلا کر انہیں ناپاک روحوں پر اختیار بخشا کہ اُن کو نکالیں۔ اور ہر طرح کی بیماری اور ہر طرح کی کمزوری کو دور کریں" (متی ۱۰: ۱) اور انہوں نے مسیح کے دئے ہوئے اختیار کو ہمیشہ اُسی کی ذات قدرت سمجھ کر استعمال کیا۔ اور اُسی کے نام سے معجزات کئے۔ چنانچہ پطرس اور یوحنا ایک جنم کے لنگڑے کو تندرست کرتے وقت یہ کہتے ہیں۔ "یسوع مسیح ناصری کے نام سے چل پھر" (اعمال ۳: ۶)۔ اور جب اِس معجزہ کے باعث اُن کی مخالفت ہوئی۔ اور یہودی سردار فقیہہ اور کاہن اُن سے پوچھنے لگے کہ "تُم نے یہ کام کس قدرت اور کس نام سے کیا؟" اُس وقت پطرس نے رُوح القدس سے معمور ہو کر اُن سے کہا۔۔۔۔ "تُم سب اور اسرائیل کی ساری اُمت کو معلوم ہو کہ یسوع مسیح ناصری جس کو تُم نے صلیب دی اور خُدا نے مرِدوں میں سے جلایا۔ اُسی کے نام سے یہ شخص تمہارے سامنے تندرست کھڑا ہے" (اعمال ۴: ۷-۱۰) اور اس معجزہ کی تاریخی حیثیت یہ ہے کہ مخالفینِ مسیح بھی اُس کا انکار نہیں کر سکے۔ اور اُن کی گواہی یہ ہے۔ "کہ ہم ان آدمیوں کے ساتھ کیا کریں؟ کیونکہ یروشلیم کے سب رہنے والوں پر روشن ہے کہ اُن سے ایک صریح معجزہ ظاہر ہوا۔ اور ہم اُس کا انکار نہیں کر سکتے" (اعمال ۴: ۱۶)۔ خُداوند مسیح کے معجزات سے بھی کبھی کسی مخالف نے انکار نہ کیا تھا۔ جب اُس نے لعزر کو قبر سے زندہ کیا تو عوام الناس متعجب ہو کر اُسے دیکھنے آئے۔ "لیکن سردار کاہنوں نے مشورہ کیا کہ لعزر کو بھی مار ڈالیں۔ کیونکہ اُس کے باعث بہت سے یہودی چنے گئے اور یسوع پر ایمان لائے" (یوحنا۱۲: ۱۰-۱۱)۔ "پس فریسیوں نے آپس میں کہا۔ سوچو تو کہ تُم سے کچھ نہیں بن پڑتا۔ دیکھو جہان اُس کا پیرو ہو چلا" (آیت ۱۹)۔ وہ اُس کے کلام کو اِنسانی طاقت سے بالا سمجھتے تھے (یوحنا۷: ۴۰) اگر عہدِ عتیق کے انبیاء نے معجزات کئے تو خُدا کے نام سے لیکن مسیح نے اپنے ذاتی اختیار و قدرت سے اور مسیح کے شاگردوں نے مسیح کے نام سے اور بھی بہت سی مثالیں اور نظریں مسیح کے خُداوندانہ اختیار و قدرت کے متعلق پیش کی جاسکتی ہیں۔ لیکن ہم اسی قدر بیان کو کافی سمجھ کرتے ہیں۔

محبت

''جو محبت نہیں رکھتا وہ خُدا کو نہیں جانتا۔ کیونکہ خُدا محبت ہے''(۱۔یوحنا۴: ۱۹، ۸)اور الٰہی محبت کا مظہر خُداوند مسیح ہے۔''کسی راستباز کی خاطر مشکل سے کوئی اپنی جان دے گا۔ مگر شاید کسی نیک آدمی کے لئے کوئی اپنی جان تک دے دینے کی جرات کرے لیکن خُدا اپنی محبت کی خوبی ہم پر یوں ظاہر کرتا ہے کہ جب ہم گنہگار ہی تھے تو مسیح ہماری خاطر موا''(رومیوں ۷:۵؛یوحنا ۱۶:۳)۔کلام کی گواہی یہی ہے کہ خُدا اپنی محبت کی خوبی کو ہم پر مسیح کے ذریعے ظاہر کرتا ہے۔اور محبت کی انتہا اور کمال قربانی ہے۔چنانچہ خُداوند مسیح نے اپنی پاک قربانی کے ذریعے الٰہی محبت کے کمال کی آئینہ داری کی۔'' ہم نے محبت کو اسی سے جانا ہے کہ اُس نے ہمارے واسطے اپنی جان دے دی''(۱۔یوحنا ۱۶:۳)۔خُداوند مسیح نے اپنی زبان حقائق ترجمان سے فرمایا۔ ''اچھا چرواہا میں ہوں۔اچھا چرواہا بھیڑوں کے لئے اپنی جان دیتا ہے۔اور میں بھیڑوں کے لئے اپنی جان دیتا ہوں''(یوحنا ۱۵، ۱۱: ۱۰)۔''کیونکہ ابنِ آدم بھی اس لئے نہیں آیا کہ خدمت لے بلکہ خدمت کرے۔اور اپنی جان بہتروں کے بدلے فدیہ میں دے''(مرقس ۴۵:۱۰؛متی ۲۰:۲۸)۔''اس سے زیادہ محبت کوئی شخص نہیں کرتا کہ اپنی جان اپنے دوستوں کے لئے دیدے''(یوحنا ۱۵:۱۳)اگر خُداوند مسیح کی بے غرض پاک اور کامل قربانی خُدا کی محبت کا ظہور ہے۔تو تجسم محبت کے خُدا کا ظہور ہے۔اور قربانی کے لئے تجسم ضروری ہے۔خُدا کی محبت یہی کیا کم ہے کہ وہ اِنسان کی خاطر جسم اختیار کرتا ہے۔قربانی دینے میں تو الٰہی ایثار کی حد ہے۔ مسیح کی محبت بے غرض تھی۔پاک تھی لازوال تھی۔دوست ودشمن کے لئے مساوی تھی۔راست وناراست دونوں پر حادی تھی۔کامل تھی۔اُس سے بہتر محبت کا نمونہ عظیم سے عظیم شخصیت نہ قدیم سے قدیم کتاب اور نہ کسی اور معبود میں پایا گیا۔جس طرح تمام ستاروں کی مجموعی روشنی خورشید خاور کے بالمقابل ہیچ اور ماند ہے۔اُسی طرح تمام افرادِ عالم کی محبتوں کو مسیح کی لاثانی وغیر فانی محبت کے سامنے کوئی قدر و وقعت نصیب نہیں۔

۲۔ مشہور کہاوت ہے کہ ''کند ہم جنس باہم جنس پرواز۔ کبوتر با کبوتر باز بباز''۔یہ قدرت کا مسلمہ اصول ہے کہ محبوب اور محب کا ہم جنس ومساوی المرتبت ہونا ضروری ہے۔خُدا کی ذات سراپا لطیف اور وار الوراء اور فہم وادرک اِنسانی سے باہر ہے اور انسان خاکی ہے۔یعنی ذاتِ الٰہی اور ذاتِ اِنسانی میں جنسی مغائرت(ناموافقت)ہے۔اور یہی امر محبت وملاپ کے مانع(روکنے والا، ممانعت)ہے۔محبت کے لئے ہم جنسی ضروری ولازمی ہے۔ بغیر ہم جنسی کے میل ملاپ اور محبت کا وجود محال ہے۔بلکہ ہم جنسی کے ساتھ ہی ہم مرتبہ ہونا بھی ضروری ہے۔ایک شہریار کامگار کے ساتھ ایک درویش بوریہ نشیں کی دلی محبت اور دوستی ہوسکے۔دل ماننے کو تیار نہیں۔خُدا اور اِنسان کے درمیان رشتہ محبت وملاپ قائم کرنے کے لئے خُداوند مسیح اپنی شان الٰہی کو چھوڑ کر ''اِنسانوں کے مشابہ ہوگیا''۔

اِنسانوں کا ہم جنس بن گیا۔ابنِ خُدا ہوتے ہوئے ابنِ آدم بن گیا۔''اسی باعث وہ اُنہیں بھائی کہنے سے نہیں شرماتا''(عبرانیوں ۱۱:۲)۔پھر وہ اِنسانی شکل اختیار کرکے کسی شاہانہ تجمل اور دنیوی شان وشوکت کے ساتھ نہیں آیا۔بلکہ نہایت مفلس گھرانے میں پیدا ہوا۔اُس کے سرپرست معاشرت وتمدن کے لحاظ سے مشہور نہ تھے۔بلکہ لوگ حیرت سے کہتے تھے کہ ''کیا ناصرۃ سے کوئی اچھی چیز نکل سکتی ہے؟''اُس کے سردھرنے کے لئے جگہ نہ تھی۔اُس نے اپنی تمام زندگی فقیری حیثیت میں بسر کی۔غربا ومسکین اور روحانی وجسمانی دردمندوں کی ہمدردی اور خدمت کو اپنی زندگی کا واحد نصب العین بنایا۔اور بالآخر تمام جہان کے گناہوں کے عوض میں اپنی قیمتی جان کو عدل کے مذبح پر قربان کرکے الٰہی محبت کے کمال کو بے نقاب کردیا۔''محبت

اس میں نہیں کہ ہم نے خُدا سے محبت کی بلکہ اس میں ہے کہ اُس نے ہم سے محبت کی۔اور ہمارے گناہوں کے کفارے کے لئے اپنے بیٹے کو بھیجا"(ا۔یوحنا۱۰:۴)۔

قدوسیت

یہ صفت خُدا کی تمام صفات کاملہ بلیغہ (کامل) کی درۃ التاج ہے۔اور وہ پاکیزگی جو خُدا ہی کی ذات سے خاص ہے خُداوند مسیح میں جو خُدا کی ذات کا نقش ہے کامل طور پر پائی جاتی ہے۔جبرائیل فرشتے کی گواہی۔"اور فرشتے نے جواب میں اُس (مریم) سے کہا کہ رُوح القدس تجھ پر نازل ہوگا۔اور خُدا تعالیٰ کی قدرت تجھ پر سایہ ڈالے گی۔اوراس سبب سے وہ پاکیزہ جو پیدا ہونے والا ہے۔خُدا کا بیٹا کہلائے گا"(لوقا۳۵:۱)۔خُداوند مسیح کا اپنا اقرار۔"تم میں کون مجھ پر گناہ ثابت کرتا ہے"(یوحنا۴۶:۴)۔پطرس رسول کی گواہی۔"نہ اُس نے گناہ کیا۔اور نہ اُس کے مُنہ سے کوئی مکر کی بات نکلی"(ا۔پطرس ۲۲:۲)۔پولُس رسول کی گواہی۔"ہمارا ایسا سردار کاہن نہیں جو ہماری کمزوریوں میں ہمارا ہمدرد نہ ہوسکے۔بلکہ ساری باتوں میں ہماری طرح آزمایا گیا۔تاہم بے گناہ رہا"(عبرانیوں۱۵:۴)۔رُومی گورنر پیلاطوس کی گواہی۔"میں اِس راستباز کے خون سے بری ہوں۔تم جانو"(متی۲۴:۲۷)۔پیلاطوس کی بیگم کی شہادت۔"اس راستباز سے کچھ کام نہ رکھ۔کیونکہ میں نے آج خواب میں اس کے سبب سے بہت دُکھ اُٹھایا ہے"(متی۱۹:۲۷)۔پہرہ داروں اور رومی صوبہ دار کی گواہی۔"بہت ہی ڈرے اور بولے کہ بے شک یہ خُدا کا بیٹا تھا"(متی۵۴:۲۷)۔بدروح کی گواہی۔"میں تجھے جانتا ہوں کہ تُو کون ہے۔خُدا کا قدوس ہے"(مرقس۲۴:۱)۔"اَے یسوع خُدا تعالیٰ کے بیٹے مجھے تجھ سے کیا کام"(مرقس۷:۵)۔نہ صرف آپ پاکیزگی اور تنزہ تام میں خُدا کے ہمسر تھے۔بلکہ گناہوں کی معافی کا بھی اختیار رکھتے تھے۔ایک دفعہ ایک گنہگار عورت حقیقی تائب دلی سے آپ کے پاک قدموں پر آکر گری تو آپ نے فرمایا۔"تیرے گناہ معاف ہوئے"(لوقا۴۸:۷)۔پھر ایک دفعہ چند آدمی ایک مفلوج کو آپ کے پاس لائے۔آپ نے اُن کا ایمان دیکھ کر اُس مفلوج سے کہا۔"اَے آدمی تیرے گناہ معاف ہوئے"۔لیکن شرع کے علماء اور فقہاء نے اس حکم کو کفر سے تعبیر کیا۔اور کہا کہ سوا خُدا کے کون گناہوں کو بخش سکتا ہے؟اس پر خُداوند نے اُن سے سوال کیا کہ "آسان کیا ہے؟یہ کہنا کہ تیرے گناہ معاف ہوئے۔یا یہ کہنا کہ اُٹھ اور چل پھر؟لیکن اس لئے کہ تُم جانو کہ ابن آدم کو زمین پر گناہوں کے معاف کرنے کا اختیار ہے(اُس مفلوج سے کہا) میں تجھ سے کہتا ہوں اُٹھ!اور اپنا کھٹولا اُٹھا کر اپنے گھر جا"(لوقا ۲۰:۵-۲۴)جب آپ نے اپنے فوق العادت فعل کے ذریعے اپنے پہلے قول کو ثابت کردیا۔"تو وہ سب بڑے حیران ہوئے اور خُدا کی بڑائی کرنے لگے۔اور بہت ڈر گئے اور کہنے لگے کہ آج ہم نے عجیب باتیں دیکھیں"(آیت ۲۶)۔ابتدائے آفرینش سے از آدم تا ایں دم کسی بھی ہستی نے سوائے خُداوند مسیح کے یہ خُداوندانہ دعویٰ نہیں کیا۔اس سے آپ کے الٰہی اختیار، قدرت اور قدوسیت کا بین ثبوت ملتا ہے۔اسی واسطے آپ نے یہ فرمایا۔"میں راستبازوں کو نہیں بلکہ گنہگاروں کو بُلانے آیا ہوں"(متی ۱۳:۹؛مرقس۱۷:۲)اور اسی واسطے مقدس یوحنا رسول کا قول آپ کی عدیم النظیر ذات کے متعلق کیا ہی موزوں تھا کہ "دیکھو یہ خُدا کا برہ ہے جو دُنیا کا گناہ اُٹھالے جاتا ہے"(یوحنا۲۹:۱)۔پس ایزد تعالیٰ کی قدوسیت کے کمال کو بنی نوع انسان پر ظاہر کرنے کے لئے خُداوند مسیح مظہر تھا اور ہے۔

تمام انبیاء کرام پر فضیلت

''بمقامیکہ رسیدی نرسد ہیچ نبی''انجیل کی تعلیم کا سرمایہ غرائب ونادرِ دُنیائے مذہب میں اس لئے ایک انوکھی شان اور امتیازی حیثیت رکھتا ہے کہ اس کی ہیرو وہ عدیم لنظیر اور فقید المثل ہستی ہے۔ جس نے زینت افزائے کاشانہ گیتی ہو کر مذاق روحانیت کے لذت شناسوں اور خُدا بینی کے طالبوں کی سب سے عزیز خواہشات کو جواب دے کر اُن کے دلوں کو گہوارہ مسرت بنادیا۔ اور خُدا کے دُھندلے تصور کو اپنے ظہورِ پر نور سے ایسے روشن کر دیا جس طرح پرانے مبہم مخطوطات پر قلم پھیر کر اُنہیں پھر سے روشن کیا جائے۔ حقائق و معارف روحانیہ اور شمائل وخصائل قدسیہ تامہ۔ حرکات وافعال پسندیدہ ،خیالات وجذبات سعیدہ (نیک) اور الوہیت کے تمام سربستہ (پوشیدہ) اسرار وانوار اور ذاتِ حق تعالیٰ کا پاک ترین حُسن آپ کے نقابِ اِنسانیت میں سے رہ رہ کر چھنتا رہتا تھا۔ آپ کی پر محبت اور وقف ایثار زندگی الٰہی محبت کا ایک حسین و جمیل مرقع (تصویروں کی کتاب) تھی۔ آپ کی مقدس وپاک ترین اور معصوم رفتار وگفتار الٰہی حُسنِ تقدس کی ایک عریاں تصویر تھی۔ اور حضرت اِنسان کی ابتدائی پاکیزہ حالت اور معصومیت کا بے نقاب مجسمہ۔ آپ کے پیکر خاکی میں ملکوتی (فرشتہ) صفات کا عکس صاف نظر آتا تھا۔ اسی واسطے آپ کی جامع الصفات زندگی میں ایک ہمہ گیر جاذبیت (کشش) تھی۔ وہ قدرتِ کاملہ اور حکمت بالغہ جو صرف خُدا ہی کی ذات سے خاص ہے آپ کی پُر حکمت وجلال جسمانی زندگی سے فوق العادت اظہارات کی صورت میں ایسے پھوٹ نکلا کرتی تھی۔ جیسے سحاب (بادل) مُشکیں میں سے برق (بجلی) خاطف (چھین لینے والا، بجلی کی صفت) کے نورانی ڈورے۔ وہ نور کا ستون جو ابر سیاہ کے نقاب میں ہو کر شب کے وقت بنی اسرائیل کی رہبری فرمایا کرتا تھا اُسی سرور کائنات اور سرچشمہ اکرام وحسنات کے جامہ اِنسانیت کو مشرف ومفتخر (عزت بخشا) فرمانے کی ایک تشبیہ تھی۔ اور آپ نے اپنی زبانِ حقائق ترجمان سے بارہا فرمایا۔ ''میں دُنیا کا نور ہوں۔ جو میری پیروی کرے گا وہ اندھیرے میں نہ چلے گا بلکہ زندگی کا نور پائے گا''(یوحنا۱۲:۸)۔ اُس کی نورانی وجلالی زندگی نے واقعی اس عالمِ آب وگل کو مہبط انوار بنادیا۔ یہی الٰہی صفات ہیں جو آپ کو تمام انبیاء ومرسلین اور مقدسین ومتامہین سے ممتاز کر دیتی ہیں۔ اگر ان صفاتِ قُدسیہ الٰہیہ اور خصائص لطیفہ روحانیہ کو آپ کی ذات پاک سے الگ کر دیا جائے تو آپ صرف ایک نبی یا رسول ہی رہ جاتے ہیں۔ اور ہم رسولوں اور نبیوں کو معصوم مطلق اور منزہ عن الخُدا نہیں مانتے اور نہ ہی ماننے کی کوئی وجہ ہے۔ کیونکہ اُن کے گناہوں اور توبہ واستغفار کا بیان صحائف مطہرہ (پاک) میں بالتصریح موجود ہے۔ البتہ وہ اپنے اپنے زمانے کے عام لوگوں کی بہ نسبت خُدا ترسی اور نیکی کے لحاظ سے بہترین اشخاص تھے۔ اسی واسطے خُدا کی طرف سے اُنہیں نبوت ورسالت کے فضائل ومدارج حاصل ہوئے۔ خُداوند مسیح نے اپنے آپ کو تمام انبیاء سے افضل اور قدیم ثابت کیا۔ اور اپنی پیش ہستی وقدامت کا یوں دعویٰ کیا۔ ''میں تُم سے سچ سچ کہتا ہوں۔ پیشتر اس کے کہ ابراہیم پیدا ہوا میں ہوں''(یوحنا۵۸:۸)۔ ''اور اب اَے باپ تو اس جلال سے جو میں دُنیا کی پیدائش سے پیشتر تیرے ساتھ رکھتا تھا مجھے اپنے ساتھ جلالی بنادے''(یوحنا۵:۱۷)۔ موسیٰ پر فضیلت۔ وہ موسیٰ سے اس قدر زیادہ عزت کے لائق سمجھا گیا۔ جس قدر گھر کا بنانے والا گھر سے زیادہ عزت دار ہوتا ہے۔ ''موسیٰ گھر کا خادم اور مسیح گھر کا مختار''(عبرانیوں ۵،۳:۳-۶)۔ داؤد نبی پر فوقیت (مرقس ۳۵:۱۲-۳۷)۔ سُلیمان نبی پر فضیلت ''یہاں وہ ہے جو سلیمان سے بھی بڑا ہے''(متی ۴۲:۱۲)۔ یونس نبی پر فضیلت ''یہاں وہ ہے جو یونس سے بھی بڑا ہے''(متی ۴۱:۱۲)۔ یوحنا اصطباغی کی گواہی ''میرے بعد وہ شخص آنے والا ہے جو مجھ سے زور آور ہے۔ میں اِس لائق نہیں کہ جھک کر اُس کی جوتیوں کا تسمہ کھولوں۔ میں نے تو تمہیں پانی سے بپتسمہ دیا۔ مگر وہ تمہیں روح القدس سے بپتسمہ دے گا''(مرقس ۷:۱-۸)۔ اور جب مسیح ظاہر ہوا تو اسی یوحنا نے اُس کی پیش ہستی کی گواہی دی۔ حالانکہ پیدائش جسمانی کے لحاظ سے یوحنا مسیح سے چھ ماہ پہلے پیدا ہوا تھا۔ تو بھی وہ مسیح کو اپنے سے قدیم کہتا ہے۔ ''یہ وہی ہے جس کی بابت میں نے کہا تھا کہ ایک

شخص میرے بعد آتا ہے۔ جو مجھ سے مقدم ٹھہرا۔ کیونکہ وہ مجھ سے پہلے تھا"(یوحنا ۱: ۳۰)۔ یوحنا رسول کی گواہی۔"ابتدا میں کلام تھا اور کلام خُدا کے ساتھ تھا اور کلام خُدا تھا۔ یہی ابتدا میں خُدا کے ساتھ تھا۔ ساری چیزیں اُس کے وسیلے سے پیدا ہوئیں۔۔۔۔۔"(یوحنا ۱: ۱-۳)۔ وہ لا تبدیل ہے۔"یسوع مسیح کل اور آج بلکہ ابد تک یکساں ہے"(عبرانیوں ۸: ۱۳)۔ یوحنا اُس کو اول و آخر اور ابدالآباد زندہ رہنے والا۔ اور موت و عالم ارواح کی کنجیوں کا مختار کہتا ہے (مکاشفہ ۱۷:۱- ۱۸ ، ۲:۹)۔"وہ قدوس اور برحق ہے"(مکاشفہ ۳: ۷)۔"وہ آمین اور سچا اور برحق گواہ اور خُدا کی خلقت کا مبداء ہے"(مکاشفہ ۱۴: ۳)۔"وہ اَن دیکھے خُدا کی صورت اور تمام مخلوقات سے پہلے مولود ہے۔ تمام آسمانی وزمینی مرئی وغیر مرئی (وہ جس کو دیکھا جاسکے) چیزوں کا میل خُدا کے ساتھ اُسی کے ذریعے ہو سکتا ہے"(کلسیوں ۱۵: ۱-۲۱)۔ وہ خُدا کا بھید ہے۔"اور خُدا کے بھید یعنی مسیح کو پہچانیں۔ جس میں حکمت ومعرفت کے سارے خزانے چھپے ہوئے ہیں"(کلسیوں ۲: ۲-۳)۔ وہ تمام دُنیا کی نجات صرف اُس ہی کے ذریعے ہو سکتی ہے۔ اور بغیر اُس کے نجات محال ہے (اعمال ۱۲: ۴)۔ وہ تمام دُنیا کی عدالت کرنے والا اکیلا منصف ہے۔" باپ کسی کی عدالت نہیں کرتا۔ بلکہ اُس نے عدالت کا سارا کام بیٹے کے سپرد کیا ہے"(یوحنا ۲۲: ۵)۔ خُدا کے ملاپ لئے مسیح ضروری وسیلہ ہے۔"راہ اور حق اور زندگی میں ہوں۔ کوئی میرے وسیلے کے بغیر باپ کے پاس نہیں آتا"(یوحنا ۶: ۱۴)۔ جس طرح عہدِ عتیق کے زمانہ میں انبیاء پر خُدا کی طرف سے الہام ہوتا تھا۔ اُسی طرح نئے عہد کے رسولوں پر خُداوند مسیح کی طرف سے الہام ہوتا ہے۔ چنانچہ مقدس پولُس رسول فرماتا ہے۔"اے بھائیو میں جتائے دیتا ہوں کہ جو خوشخبری (انجیل) میں نے سُنائی وہ اِنسان کی سی نہیں۔ کیونکہ وہ مجھے اِنسان کی طرف سے نہیں پہنچی۔ اور نہ مجھے سکھائی گئی۔ بلکہ یسوع مسیح کی طرف سے مجھے اُس کا مکاشفہ ہوا"(گلتیوں ۱۱: ۱-۱۲)۔" پس ہم مسیح کے ایلچی ہیں"(۲۔ کرنتھیوں ۲۰: ۵)۔"پولُس کی طرف سے جو خُدا کی مرضی سے مسیح یسوع کا رسول ہے"(۲۔ کرنتھیوں ۱: ۱؛ ۱۔ کرنتھیوں ۱: ۱؛ افسیوں ۱: ۱؛ کلسیوں ۱: ۱؛ ۱۔ تیمتھیس ۱: ۱؛ ۲۔ تیمتھیس ۱: ۱؛ ططس ۱: ۱)۔ پطرس رسول کی گواہی"پطرس کی طرف سے جو یسوع مسیح کا رسول ہے "(۱۔ پطرس ۱: ۱؛ ۲۔ پطرس ۱: ۱)۔ خُداوند مسیح کے اپنے الفاظ۔"اے باپ وہ گھڑی آپہنچی۔ اپنے بیٹے کا جلال ظاہر کر تا کہ بیٹا تیرا اجلال ظاہر کرے۔ چنانچہ تو نے اُسے ہر بشر پر اختیار دیا ہے۔ تا کہ جنہیں تو نے اُسے بخشا ہے اُن سب کو وہ ہمیشہ کی زندگی دے۔ اور ہمیشہ کی زندگی یہ ہے کہ وہ تجھ خُدائے واحد اور برحق کو اور یسوع مسیح کو جسے تو نے بھیجا ہے جانیں"(یوحنا ۱: ۱۷-۳)۔"تا کہ سب لوگ بیٹے کی عزت کریں جس طرح باپ کی عزت کرتے ہیں۔ جو بیٹے کی عزت نہیں کرتا وہ باپ کی جس نے اُسے بھیجا عزت نہیں کرتا"(یوحنا ۲۳: ۵؛ امثال ۲۲: ۸-۳۱)۔ میں کلمۃ اللہ کی قدامت وازلیت کا بیان خوب واضح الفاظ میں موجود ہے۔ وہاں پر لفظ دانائی مستعمل ہے اور یونانی لفظ لوگاس (کلمہ) کے معنی دانائی اور کلام کے ہیں۔ اور یہ مسیح کا خطاب ہے۔ ناظرین مذکورہ بالا بیان سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ خُداوند مسیح صرف نبی اور رسول ہی نہ تھے بلکہ نبیوں کو الہام دینے والے دُنیا کے خالق ومالک، نجات دہندہ اور قابل پرستش، جب اس قسم کے الٰہی القاب، الٰہی اقوال وافعال، الٰہی قدرت واختیار، الٰہی صفات وحسنات اور پاکیزگی وقدوسیت تام (تمام، پورا) اُس کی ذاتِ مقدس کے ساتھ وابستہ ہیں۔ تو کیا وجہ ہے کہ اُسے مظہرِ خُدا اور مراۃ الحق (سچائی کا آئینہ) تسلیم کر کے سر نیاز اُس کے پاک ومبارک قدموں پر نہ رکھ دیا جائے۔

عہدِ عتیق ایک کشفی (ظاہری) سلسلہ ہے جس میں مکشوفاتِ قدسیہ الٰہیہ ملہمین پر مختلف طرح ظاہر ہوئے۔ اور عہدِ جدید میں اُسی حقیقت کشفی مگر نامظہوری کا ظہوری تجسم ظاہری اور تجسم بجسد عنصری (خاکی جسم) موجود ہے۔ اگرچہ خُدا تعالیٰ نے اُس وقت بھی مختلف عارضی مظاہرات میں ظاہر ہوتا رہا۔ لیکن وہ خُدا بینی کے خواہشمندوں کی چشم اشتیاق کا خاطر خواہ جواب نہ تھے۔ کوئی مستقل وجامع مظاہر نہ تھے۔ خُداوند مسیح وہ مستقل وجامع مظہر

ہے جس میں حق تعالیٰ کی تمام صفاتِ قدسیہ اور رموز روحانیہ سجدامکان ظہور پذیر ہوئیں۔ گویا حقیقت برنگِ مجاز منصہ ءشہود پر جلوہ فگن (وہ مقام جہاں سے جلوہ نمایاں ہو) ہوئی۔اورانسان کے اس جذبہ سعیدہ (نیک خواہش)اور آرزوئے پسندیدہ کاجواب دیا۔ کہ

کبھی اَے حقیقت منتظر نظر آلباسِ مجاز میں

کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں میری جبینِ نیاز میں

ہم کہاں تک اُس کے شمائل حسنہ وخصائل قدسیہ کی آئینہ داری کریں۔اُس سراپانور کی لاثانی اوربے مثل زندگی کے چہرے کاایک گوشہ بے نقاب کرنا بھی طاقت قلم سے باہر ہے۔ ہماری مندرجہ بالا تمام تحریر شاعرانہ حمد وسپاس (تعریف) نہیں ہے۔ بلک برخلاف اس کے انجیلِ مقدس کے بحربے کنار (سمندر جس کا کنارہ نہیں) کو کوزے میں بند کرنے کی ایک ناکام سی کوشش ہے ۔ کلام ہماری تحریر سے بدرجہازیادہ اُس کے لئے وقفِ محامدت (عمدہ اوصاف) ہے۔ بلکہ کلام بھی یہ اعتراف کرتاہے کہ خُداوند مسیح کی جامع الصفات زندگی اوررفیع القدر ذات کا پورابیان نہیں کرسکا (یوحنا۲۵:۲۱، ۳۰:۲۰)۔

ایک اعتراض کاجواب

اکثر مکدر الطبع (آلودہ طبیعت) اور محجوب (پردہ) الفہم لوگ مقلدان (پیرو) آنخُداوند کے ایمان ویقان (یقین) کی بنیاد کو جنبش دینے کی نیت سے آپ کی عصمت تامہ پر کمینے ہتھیاروں سے حملہ کرناموجبِ حسناتِ کثیرہ سمجھتے ہیں۔اور آفتاب کی طرف خاک دھول اڑاکے یعنی مسیحیت کامقابلہ کرنے کواپنے عقائد کے استحکام کی وجہ تسلیم کئے بیٹھے ہیں۔اور شیر قالین (ایسا قالین جس پر شیر کی تصویر ہو) کو شیر نیستان (جنگل کا شیر) کے بالمقابل کھڑا کرکے اصل کو نقل اور نقل کواصل ثابت کرنے کی ناکام کوششوں پر فتح مندانہ نعرے لگاتے ہیں۔ہم یہاں پراُن کوجواب دینے میں اختصار سے کام لیں گے ۔ کیونکہ اس کتاب کااختصار جو ہمیں منظور ہے اجازت نہیں دیتا کہ مخالفین کے تمام اعتراضات کو رفع کریں۔اور طول بیانی وتصنیع اوقات (وقت گنوانا) کے علاوہ سردردی مول لیں۔ مسیحی مصنفین نے اس امر میں کوئی دقیقہ اُٹھایانہیں رکھا۔ مخالفین خُداوند مسیح کے اس بیان کی بناپر اعتراض اُٹھایا کرتے ہیں کہ ”یسوع نے اُس سے کہاتو مجھے کیوں نیک کہتاہے ؟ کوئی نیک نہیں مگرایک یعنی خُد“ا(مرقس۱۸:۱۰؛لوقا۱۸:۱۹؛متی ۱۶:۱۹)۔

اوّل۔اس مقام میں خُداوند مسیح نے اپنی نیکی کانہ تواقرار کیااورنہ انکار۔ کیونکہ خُداکے نیک ہونے اورانسان کے نیک ہونے میں بڑافرق ہے۔ خُدااس معنی میں نیک نہیں کہ وہ بے گناہ ہے۔ بلکہ وہ قدوس اور بالذاتہ پاک ہے اور تمام نیکیوں کا سرچشمہ ہے۔ پس الٰہی نیکی کااقرارانسانی نیکی کاانکار نہیں ہوسکتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ خُداکی نیکی اور مسیح کی نیکی کوئی دو باتیں نہیں ہیں۔ بلکہ مسیح خُداکی راست بازی ہے (۱۔کرنتھیوں ۱:۳۰)۔ لہٰذا مسیح نے اپنے نیک ہونے کاانکار نہیں کیا۔

دوم۔وہ سائل (سوال پوچھنے والا) مسیح کو دیگر مذہبی اُستادوں اور عالموں کی طرف محض ایک استاد ہی مانتا تھا۔اسی لئے وہ کہتاہے۔ ”اَے نیک اُستاد“ اور جیسے بعض استادوں کے متعلق لوگ کہا کرتے ہیں کہ وہ بڑاشریف النفس ہے۔وہ بہت نیک ہے لیکن اُس نیکی سے مراد معصومیت تام نہیں ہوتی بلکہ اُن میں بعض اوصاف عامتہ الناس کی بہ نسبت اچھے ہوتے ہیں۔ جب کسی استاد یاہادی کو نیک کہاجاتاہے تواس سے یہ مراد نہیں ہوتی کہ وہ نیکی میں خُدا کاہمسر ہے۔اور جب کسی استاد کو عالم فاضل کہاجاتاہے تواُس سے یہ مراد نہیں ہوتی کہ وہ خُداکی مانند علیم کل یاہم دان ہے۔ پس اسی طرح اُس سائل نے

عام استادوں کی طرح نیک استاد کہا۔اور آپ نے اس ظاہری ناکامل اور عام نیکی کو اپنی کو اپنی ذات کے متعلق قبول نہ کیا۔ کیونکہ آپ کی بے نقص اور کامل نیکی کو اِنسان کی سی ناکامل اور ناقص نیکی کے زاویہ نگاہ سے دیکھنا بے انصافی ہے۔ کیونکہ اِنسان کی ادھوری نیکی کے متعلق تو کلام یہ گواہی دیتا ہے۔ ''کیونکہ زمین پر کوئی ایسا راستباز اِنسان نہیں کہ نیکی ہی کرے اور خطا نہ کرے''(واعظ ۲۰:۷)۔ اس لئے مسیح نے اُسے گویا یوں کہا۔ کہ اگر تو مجھے دیگر مذہبی استادوں کی طرح محض اِنسان سمجھ کر ہی نیک استاد کہتا ہے۔ تو کوئی نیک نہیں مگر ایک یعنی خُدا تاکہ سائل یہ غلط خیال اپنے دل سے نکال دے کہ مذہبی اُستاد بھی نیک مطلق ہو سکتے ہیں۔ اور اُس کا اس عام لقب سے مسیح کو خطاب کرنا ایسا ہی تھا جیسے کوئی حضور وائسرائے کو کہے۔ ''سلام تھا بیدار جی''۔

سوم۔(متی ۱۶:۱۹) کو پڑھیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ خُداوند نے نہ تو اپنی نیکی کا اقرار کیا اور نہ انکار۔ بلکہ صرف ایک طرح سے نیکی کے معنی بتائے۔ اور فرمایا کہ ''تو مجھے نیکی کی بابت کیوں پوچھتا ہے۔ یعنی کہ اعمال حسنہ جن کو تُم نجات اور ہمیشہ کی زندگی کی شرط سمجھے ہوئے ہو خُدا کی نظر میں پورے نہیں۔ اور ایسی ادھوری نیکیوں سے ہمیشہ کی زندگی کی اُمید رکھنا عبث ہے۔ حقیقی نیکی تو گناہ آلودہ طبیعت سے ہو ہی نہیں سکتی بلکہ سراپا نیک و پاک طبیعت سے صادر ہوا کرتی ہے۔ کیونکہ ''کیا انجیر کے درخت میں زیتون اور انگور میں انجیر پیدا ہو سکتے ہیں؟ اسی طرح کھاری چشمے سے میٹھا پانی نہیں نکل سکتا''(یعقوب ۱۲:۳) اور اگر نیک بن جانا اپنی ذاتی کوشش سے ممکن ہے تو ''کامل بنو جیسے تمہارا آسمانی باپ کامل ہے''(متی ۴۸:۵؛ افسیوں ۱:۵)۔ ایسی کمالیت ہی ہمیشہ کی زندگی کے لائق اِنسان کو بنا سکتی ہے۔ لیکن اِنسانی کوشش کا یہ حال ہے۔ ''میں جانتا ہوں کہ مجھ میں یعنی میرے جسم میں کوئی نیکی بسی ہوئی نہیں۔ البتہ ارادہ تو مجھ میں موجود ہے مگر نیک کام مجھ سے بن نہیں پڑتے''(رومیوں ۱۸:۷)۔ اعلیٰ درجہ کی بے نقص نیکی کا تو کیا ذکر اُس سائل سے تو معمولی درجہ کی نیکی بھی نہ ہو سکی۔ یعنی جب مسیح نے فرمایا کہ ''جا اپنا سارا مال غُربا کو بانٹ دے۔ اور میرے پیچھے ہو لے۔ تو وہ جوان یہ بات سُن کر غمگیں ہو کے چلا گیا۔ کیونکہ بڑا مالدار تھا''(آیت ۲۲،۲۱)۔ اُس کی اس روش سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ آپ کی بتائی ہوئی معمولی اور ممکن العمل نیکی کو ناممکن العمل سمجھا۔ اور نتیجہ یہ حاصل ہوا کہ وہ معمولی کاموں کو جن پر ہینگ لگے نہ پھٹکڑی (مفت) نیکیاں سمجھتا تھا۔ اسی زاویہ نگاہ سے اُس نے آپ کو ''اَے نیک اُستاد'' کہا۔ اور خُداوند نے اس قسم کی ظاہری اور رسمی و رواجی نیکی کو اپنے اُوپر عائد ہونے نہ دیا۔ اور اس لئے ''نیک اُستاد'' کے الفاظ کو اپنے حق میں قبول نہ فرمایا۔

چہارم۔ اگر آپ اس قسم کی ادنیٰ نیکی کا اطلاق اپنی ذات پر جائز ٹھہرا لیتے تو یہودی گندم نما جو فروش اُستادوں اور ربیوں کو ملامت و تنبیہ نہ کر سکتے۔ بقول ''خود کو فضیحت اوروں کو نصیحت'' اوّل درجہ کی حماقت ہے۔ کیونکہ ''خفتہ را خفتہ کے کند بیدار''۔ اور اسی واسطے آپ ایسے درس دے سکے۔ ''کہ کیا اندھے کو اندھا راہ دکھا سکتا ہے؟ کیا دونوں گڑھے میں نہ گریں گے؟''(لوقا ۳۹:۶)۔ ''اور جس کی آنکھ میں شہتیر ہے وہ اپنے بھائی کی آنکھ کے تنکے کو نہیں نکال سکتا''(متی ۱:۷-۵)۔ یہ باتیں آپ کی عصمت تامہ کی گارنٹی ہیں۔

پنجم۔ اگر آپ کادامن عصمت گناہ کے گرد غبار سے ذرا بھی آلودہ ہوتاتوآپ دوسروں کے گناہ معاف کرنے کااختیار نہ رکھتے۔آپ نے گنہگاروں کے گناہ بخشے (لوقا ۲۰:۵-۲۴؛ ۴۸:۷)اور گناہ سے حاجت توبہ کی لازم آتی ہے۔ لہٰذا مخالفین اپنے اس ردی (بے کار) دعویٰ کے ثبوت میں آپ کی توبہ واستغفار کے متعلق کوئی مقام انجیلِ جلیل سے پیش کریں۔ ورنہ سورج پر تھوکنے سے باز رہیں۔ وہ اپنے ہی منہ پر پڑے گا۔

ششم۔ قرآن شریف اوراحادیث معتبرہ خُداوند کی عصمت تامہ پر زبردست گواہی دیتے ہیں۔ جو تحقیقات کا شائق ہو اسلامی لٹریچر کی درق گردانی کردیکھئے۔ اور مسیحی صحائف مطہرہ کو بھی اچھی طرح مطالعہ کرے۔ اگرچہ مسیح کی الوہیت وقدوسیت کو ثابت کرنے کے لئے مخالفین کی آراء ضروری نہیں۔ کیونکہ انجیل مقدس کی تائید وتصدیق ہی کافی سے زائد ہے۔ اور محتاج نہیں کہ غیر مسیحی علماء کی تائید ہمارے دعویٰ کو تقویت دے۔ تو بھی ہم مصلحتاً اسلام کے ایک جید عالم کی رائے مسیح کے متعلق یہاں قلمبند کرتے ہیں۔ **(مولوی سید وحید الدین خان آزاد اپنی کتاب "حد تحقیق بہ مشربِ سُنی" کی فصل ۳ صفحہ ۴)** میں اپنا شخصی اعتقاد خُداوند مسیح کے متعلق یوں قلمبند فرماتے ہیں۔

> **"مختصراًاپنااعتقاد ہم یہ لکھتے ہیں۔ کہ کتاب بائبل یعنی مجموعہ توریت وانجیل وغیرہ کا بہت حق ہے۔ اور سلسلہ انبیاء بنی اسرائیل میں خصوصاًذات حضرت مسیح علیہ السلام کی ایسی ملکی صفات ہیں۔ کہ اگر ہم اُن کو خُدا نہ کہیں تواُن کو مجرد آدمی بھی نہیں کہہ سکتے۔ کہ اُن کی صفات عام ظاہرا قوتِ بشری سے بہت زائد ہیں۔ اور سوائے اس کے چارہ نہیں کہ اُن کو ہم ایک آدمی معہ اللہ تسلیم کرلیں۔ اور قرآن شریف میں جو ذکر اُن کا بلفظ کلمتہ اللہ، روح اللہ کے ہے۔ سوا اس سے زیادہ ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ اور توریت وزبور وغیرہ میں پیشن گوئیاں نسبت اُن کی اس کثرت سے ہیں کہ قوم یہود کو خود انتظار ایک مسیح کا ہے"۔**

کیا تجسم خُدا کی کسرِ شان ہے

"اُس نے اگرچہ خُدا کی صورت پر تھاخُدا کے برابر ہونے کو قبضے میں رکھنے کی چیز نہ سمجھا۔ بلکہ اپنے آپ کو خالی کردیا۔ اور خادم کی صورت اختیار کی اورانسانوں کے مشابہ ہوگیا۔ اورانسانی شکل میں ظاہر ہوکر اپنے آپ کو پست کردیا" (فلپیوں ۲:۶-۸)۔

مسیحیت کے عظیم الشان اورمایہ ناز مسئلہ تجسم کو غیر معقول ثابت کرنے کی غرض سے غیر مسیحی لوگ اس پر بہت سے لچر پوچ (بیہودہ، بے معنی) اعتراضات اُٹھایا کرتے ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے کہ "تجسم خُدا کی کسرِ شان ہے"۔ یہ اعتراض بہت دفعہ ہمارے سُننے میں آتا ہے۔ لیکن ہم مخالفین کی اس اچھی ذہنیت پر حیران ہیں کہ انہوں نے۔

۱۔ طبقہ جمادات میں پتھر کو خُدا کا مظہر تسلیم کیا۔ اور پتھر کی مورتیوں کو مظہر خُدا سمجھ کراُن کی پرستش پر ضمیر فروشی کی۔ اہلِ اسلام حجر اسود کو جو خانہ کعبہ میں ہے چومتے ہیں۔ اور ہندوں کا توکر ہی کیا۔ اُن کے سر بفلک سنگین صنم خانے کروڑہا پتھر کے بُت اس حقیقت پر شاہد ہیں۔ یہاں تک کہ عابدوں کی تعداد سے معبودوں کی تعداد بڑھی ہوئی ہے۔ بھلا پتھروں سے خُدا کی ذات وصفات کا ظہور کیسے ہو سکتا ہے۔ اور اصنام سنگین کوانسان کی نجات سے کیا واسطہ۔

۲۔ طبقہ نباتات میں خُدا کے مظاہر ماننے۔اور خاص خاص درختوں کی پرستش کرتے ہیں۔ یہ کوراعتقادی تاحال زوروں پر ہے۔ حالانکہ درخت خُدا کی صفات کاملہ کے مظہر نہیں ہو سکتے۔اور نہ ہی وہ اِنسان کا خُدا کے ساتھ ملاپ کرواسکتے ہیں۔ کہاں مظہر اور نجات اِنسانی اور کہاں نباتات!

۳۔ طبقہ حیوانات میں خُدا کے مظاہر ماننے۔ گئو، بیل اور سانپ وغیرہ کی پرستش ہو رہی ہے۔اور مصری میفس کے متبرک سانڈ کو پوجتے تھے ۔ہند میں بھی متبرک سانڈ پوجے جاتے ہیں۔ کیا کوئی عقلمند آدمی مان سکتا ہے کہ حیوان خُدا کی ذاتِ کاملہ اور صفاتِ قدسیہ اللہ کے مظہر ہو سکتے ہیں۔ پھر اُن کو تعظیم الٰہی کی جگہ دینا کفر و شرک نہیں تواور کیا ہے؟

۴۔ طبقہ اِنسانی میں سینکڑوں مظاہر ماننے۔ راجاوں، سوربیروں، بزرگوں، رشیوں، مینوں کو اوتار (مظہر خُدا) تسلیم کیا۔اور اُن کی پرستش مدتوں سے ہوتی چلی آرہی ہے۔اُن کے سنگین مجسمے قریب قریب ہر شہر اور اور مندر میں موجود ہیں۔اور کروڑوں کی تعداد میں خلق خُدا اندھا دھند شبانہ روز اُن کی عبادت میں مصروف ہو کر مورد عتاب الٰہی (خدا کے غصے کا ٹھہرنا) ہو رہی ہے۔ جس طرح ہر ایک ہرن کی ناف میں کستوری نہیں ہوتی۔ ہر ایک سیپی میں موتی نہیں ہوتا۔ ہر دھات سونا نہیں ہوتی۔ ہر شفاف شے آئینہ نہیں ہوتی۔ اُسی طرح ہر اِنسان خُدا کا مظہر نہیں ہو سکتا ہے۔ بلکہ وہی جس میں میں الٰہی صفات اور الٰہی طبیعت موجود ہو۔ دُنیادار، عیش پرست اور جنگجو لوگ خُدا کے مظہر نہیں ہو سکتے۔ ذاتِ مظہر میں اِنسانی والٰہی ہر دو طرح کی صفات کا وجود ضروری ہے۔اُس کی ایک حیثیت خُدا سے اور دوسری حیثیت اِنسان سے مقرون (پاس، نزدیک کیا گیا) ہو۔ تاکہ ربط حادث بالقدیم قائم کر سکے۔ مظہر خُدا میں ان دو حیثیات کا اجتماع لابدی ہے۔اُس کا اِنسان کامل اور خُدا کامل ہونا ضروری ہے۔

واضح ہو کہ تجسم اختیار کرنا خُدا کی کسر شان تب ہوا گر وہ جمادی، نباتاتی اور حیوانی طبقات میں مجسم ہو۔ اِنسان خُدا کی صورت پر پیدا کیا گیا ہے ۔اور مظہر خُدا سے استفادہ بھی وہی کر سکتا ہے۔ نجات کا انتظام بھی اُسی کے لئے کیا گیا ہے۔ خُدا کا ملاپ بھی صرف طبقہ اِنسانی کے ساتھ ہو سکتا ہے تو اندریں صورت اگر خُدا مجسم ہر کر انسانی جامہ پہنے تو اس میں خُدا کی شان نہیں گھٹتی۔ بلکہ برعکس اس کے اِنسانیت کی شان بڑھ جاتی ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ کہ اگر اشرف وجود ادنیٰ وجود کے ساتھ متحد و مقرون (پاس) ہو جائے تو ادنیٰ کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے۔ مثلاً رُوح کے ساتھ اتحاد رکھنے کے باعث ہمارے جسم کی اس قدر و قیمت ہے۔ اگر روح جسم کو چھوڑ جائے تو اس کی ساری قدر و منزلت یکسر جاتی رہے"۔

۱۔ اگر لعل یا جواہر کا ایک ننھا سا ذرہ پیتل کی انگوٹھی پر بطور نگینہ لگایا جائے تو اُس انگوٹھی کی قیمت کس قدر بڑھ جاتی ہے۔ ایک دریتیم کی وجہ سے ایک صدف کی قدر و قیمت کس قدر زیادہ ہو جاتی ہے۔ لیکن جب وہ در بے بہا اُس میں سے نکال لیا جاتا ہے تو خالی سیپی کام کی نہیں رہتی۔اسی طرح خُداوند مسیح جب مجسم ہو کر اِنسانیت سے مقرون ہو گئے تو اِنسانیت کا مرتبہ بڑھ گیا۔

۲۔ پرانے زمانے میں بعض بادشاہ فقیرانہ بھیس بدل کر رات کے وقت اپنی رعیت کے پست و مظلوم طبقہ کے دُکھ درد جاننے کی خاطر ادھر اُدھر اُن کی جھونپڑیوں میں گشت لگایا کرتے تھے۔اور اُن کی مظلومیت و مصیبت کے موجبات کا سراغ لگا کر اگلے روز تختِ عدالت پر بیٹھ کر اُن کا انصاف کر دیتے تھے اگر بادشاہ شاہی شان و تجمل میں اُن کے پاس جاتا تو وہ حواس باختہ ہی ہو جاتے۔ اُن میں کب یہ حوصلہ رہتا کہ بادشاہ کو بلاخوف اُن مظالم و مصائب سے آگاہ کرتے جو زبردستوں کی طرف سے اُن پر روا رکھے جاتے تھے۔اب ظاہر ہے کہ فقیرانہ بھیس بدلنے سے بادشاہ کے اختیار و مرتبہ میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ بے کس و مظلوم لوگوں کے حق میں اُس کا یہ ایثار کثیر المنفعت اور مصائب سے نجات دلانے کا موجب ہو جاتا تھا۔اسی طرح مسیح کے جسمِ اِنسانی میں اس عالم آب و گل پر ظہور فرمانے سے ایزد تعالیٰ کا حد درجہ ایثار ظاہر ہوتا ہے۔ جس سے دُنیا کے تھکے ماندے اور بوجھ سے دبے ہوئے لوگوں کے لئے آرام و مسرت اور حقیقی آزادی کا دروازہ کھل گیا۔

۳۔ ایک لعل وجواہر کے سوداگر(جوہری) کے پاس ایک نہایت خوبصورت ہنس تھا جس کو وہ بہت عزیز رکھتا تھا۔ بہت لوگوں نے اُسے خریدنے کی کوشش کی مگر اُس سوداگر نے ہمیشہ اُس کے بیچنے سے انکار کیا۔اُس کے کئی دوست ناراض ہر کر چلے گئے۔ایک روزہ اُس نے سوچا کہ اس ہنس کی وجہ سے میرے کئی دوست مجھ سے ناراض ہوگئے ہیں۔کیونکہ میں نے اس کو اُن کے ہاتھ بیچنے سے انکار کیا۔ مناسب ہے کہ میں اس کی قیمت دوہزار روپیہ ٹھہرالوں۔ نہ کوئی اتنے دام دے گا اور نہ ہنس لے جائے گا۔ بھلا دوہزار روپیہ دے کر اس مشت پر کا کوئی کیا بنائے گا؟ ایک روز ایک ایک جوہرات کا گاہک کوئی قیمتی جواہر خریدنے کے لئے اُس کی دوکان پر آیا۔ سوداگر اُس وقت دوکان کے اندرونی حصے میں کوئی کام کر رہا تھا۔ گاہک کے دیکھتے دیکھتے اُس ہنس نے ایک لاکھ روپیہ کا ایک قیمتی لعل نگل لیا۔ جب سوداگر باہر آیا تو اُس نے گاہک سے پوچھا کہ آپ کیا خریدیں گے؟ اُس نے کہا کہ "یہ ہنس" سوداگر نے جو اصل حقیقت سے ناواقف تھا کہ اس کی قیمت دوہزار روپیہ ہے۔ گاہک نے فوراً دوہزار روپیہ ڈھیری کر دیا اور ہنس اُٹھالیا۔ سوداگر بہت خوش تھا کہ اچھا بے وقوف ملا ہے۔ جو پانچ دس روپے کی چیز کے دوہزار روپے دے کر چلا گیا ہے۔ چلو کیا خسارہ ہے۔ سراسر نفع ہی ہے۔ دیکھئے اُس لاکھ روپے کے لعل نے اس ہنس کی قدر وقیمت کو بڑھا دیا۔ اگر اُس کے پیٹ کے اندر وہ قیمتی لعل نہ ہوتا تو کون اُس کو اتنی گراں قیمت پر خریدتا؟ اور ہنس کے پیٹ میں پڑنے سے لعل کی قیمت گھٹی نہیں بلکہ قائم رہ۔ کلمتہ اللہ (مسیح) وہ لعل بہشتی تھا"(امثال ۸: ۱۱؛ ۱۹؛ متی ۱۳: ۴۶،۴۵) جو مقدسہ مریم کے بطن میں پڑا تو اُس کی قدر وقیمت بڑھ گی۔ آج اُس نادار عورت کو کروڑوں نفوس مسیح کی ماں سمجھ کر نہایت عزت واحترام سے یاد کرتے ہیں۔ مریم کا اپنا اقرار ملاحظہ ہو۔"میری جان خُداوند کی بڑائی کرتی ہے۔اور میری روح میرے منجی خُدا سے خوش ہوئی۔ کیونکہ اُس نے اپنی بندی کی پست حالی پر نظر کی۔اور دیکھ اب سے ہر زمانے کے لوگ مجھ کو مبارک کہیں گے"(لوقا ۴٦:۱-۴۸)۔ وہ جب اس عالم سفلی میں اِنسانوں کے مشابہ ہو کر آیا تو اُس وقت جتنوں نے اُسے قبول کیا اُس نے اُنہیں خُدا کے فرزند بننے کا حق بخشا(یوحنا۱۲:۱)۔ وہ ابنِ آدم بن گیا تا کہ اِنسانوں کو خُدا کے بیٹے بنائے۔ وہ خاکی بن گیا تا کہ ہم خاکیوں کو افلاکی بنائے۔"وہ اپنی اُس قوت کی تاثیر کے موافق جس سے سب چیزیں اپنے تابع کر سکتا ہے۔ ہماری پست حالی کے بدکی شکل بدل کر اپنے جلال کے بدن کی صورت پر بنائے گا"(فلپیوں ۲۱:۳)۔ وہ صلیب پر چڑھا تو اُس لعنت کے نشان کو برکت کا نشان بنا کر اُس کی شان کر بڑھا گیا۔ اُس کو پسماندہ لوگ قبول کریں تو اُن کی شان بڑھ جاتی ہے۔"وہ اگرچہ دولت مند تھا مگر تمہاری خاطر غریب بن گیا۔ تاکہ تُم اُس کی غریبی کے سبب سے دولتمند ہو جاؤ"(۲۔ کرنتھیوں ۹:۸)۔ وہ مر گیا تا کہ گناہ وہ موت ہمیشہ کے لئے نیست ہو جائیں وہ زندہ ہو گیا تا کہ ہم حیاتِ ابدی کو حاصل کریں۔

پس اَے ناظرین! تجسم خُدا کی کسرِ شان نہیں ہے بلکہ ہم عالم خاکی کے باشندوں کی قدر وقیمت کو بڑھانے اور ہمیں خاکِ مذلت سے اُٹھا کر عرش بریں پر پہنچانے کے لئے خُدا تعالیٰ کی حکمت پر دلالت کرتا ہے خُداوند مسیح عرشِ بریں کو چھوڑ کر اس عالم سفلی میں آیا تا کہ ہم الوہیت (خُدا) سے متحد ہو کر حیاتِ ابدی اور راحتِ سرمدی کو حاصل کریں۔ آمین!

مسیح کامل اِنسان

انجیل کی رُو سے اِنسانِ کامل وہ ہے جس کی ذات ارثی (وراثت)، متعدی، کسبی، عملی اور خیالی ہر قسم کے گناہ سے بلکل آزاد ہو۔ اور عمد وسہو کے گناہ سے قطعی مبرا و منزہ ہو۔ گنہگاروں کی صحبت میں رہے پر گناہ اُس کی پاک طبیعت پر مطلق اثرانداز نہ ہو۔ اور خُداوند مسیح اس معیار کے مطابق اِنسان کامل ہے۔"کیونکہ ہمارا ایسا سردار کاہن نہیں جو ہماری کمزوریوں میں ہمارا ہمدرد نہ ہو سکے۔ بلکہ ساری باتوں میں ہماری طرح آزمایا گیا۔ تاہم بے گناہ رہا" (عبرانیوں ۱۵:۴)۔ اور اُس کی ذات میں گناہ نہیں (ا۔یوحنا۳-۵)۔ اُس بیٹے کو مقرر کرتا ہے جو ہمیشہ کے لئے کامل کیا گیا۔ (عبرانیوں ۲۸:۷) اسی واسطے

ہر مسیحی ایماندار کو اُس کے قد کے اندازے تک پہنچنے کا حکم ہے۔ ''جب تک ہم سب کے سب خُدا کے بیٹے کے ایمان اور اُس کی پہچان میں ایک نہ ہو جائیں ۔اور کامل اِنسان نہ بنیں۔یعنی مسیح کے پورے قد کے اندازے تک نہ پہنچ جائیں''(افسیوں ۱۳:۴)۔

خُدا نے اِنسان کو اپنی صورت پر پاک وراست پیدا کیا تھا۔ لیکن حضرت اِنسان نے گناہ کی کالک سے اپنی وہ فطری جلالی صورت بگاڑ لی۔اور الٰہی صورت کے وہ نورانی خدوخال اور نقش ونگار گناہ نے اُس کے حافظ سے مٹا دیئے۔اب دوبارہ وہ خُدا کی صورت کے ساتھ مشابہت پیدا کرے تو کیونکر کرے؟اور مشکل یہ ہے کہ جس کی صورت پر (مشابہ) وہ بنا تھا وہ نادیدہ ہے۔ ''وہ اُس نور میں رہتا ہے جس تک کسی کی گذر نہیں ہو سکتی نہ اُسے کسی اِنسان نے دیکھا اور نہ دیکھ سکتا ہے''(۱۔تیمتھیس ۱۶:۶)۔پس جس حال کہ اُس شبیہ اللہ کا کوئی مرئی نمونہ ہی اِنسان کے سامنے نہیں تو نادیدہ کی صورت پر کیسے اپنی صورت کو بنائے؟اِنسان کی اس بھاری مشکل کو حال کرنے کے لئے کلمتہ اللہ نے ملبوسِ اِنسانی اختیار کیا۔اور اُس کی کامل اِنسانیت میں اُس کھوئی ہوئی الٰہی صورت کا پورا پورا سراغ ملتا ہے۔ ''کیونکہ الوہیت کی ساری معموری اُسی میں مجسم ہو کر سکونت کرتی ہے''(کلسیوں ۹:۲)۔ ''وہ اندیکھے خُدا کی صورت ہے''(کلسیوں ۱۵:۱)۔لہٰذا وہ نادیدنی خُدا دیدنی نمونہ ہے۔اور اُس کی صورت پر بحال ہونا ہی خُدا کی صورت پر بننا ہے۔لازم ہے کہ ہم ''اُس کے بیٹے کے ہم شکل ہوں''(رومیوں ۲۹:۸)۔وہ اُس گمشدہ الٰہی صورت کا نمونہ ہے جس کے مطابق اِنسان بنایا گیا تھا۔ ''اور جس طرح ہم اُس خاکی کی صورت پر ہوئے۔اُسی طرح اُس آسمانی کی صورت پر بھی ہوں گے''(۱۔کرنتھیوں ۴۹:۱۵)۔

علامہ جامی ''شرح خصوص الحکم'' میں ایک بہت ہی جامع معیارِ اِنسان کامل کا پیش کرتے ہیں۔اور فرماتے ہیں کہ

''اِنسانِ کامل میں تین نشائتیں(پیدائش) ہیں۔اول نشاۃ روحانی۔دوم نشاۃ عنصری، سوم نشاۃ مرا ءتی''۔

(ماخوذ از اِنسان کامل یا مظہر خُدا) چنانچہ اس بیان کردہ معیار کے مطابق بھی خُدوند مسیح کے سوا اور کوئی اِنسان کامل نہیں ہو سکتا۔اور انجیل مقدس سے خُداوند کے متعلق یہ دعویٰ پورے طور پر ثابت ہے۔ملاحظہ فرمائے۔

اوّل۔ نشاۃ روحیہ : ''میں اور باپ ایک ہیں''(یوحنا ۳۰:۱۰)۔ ''میں باپ میں سے نکلا اور دُنیا میں آیا ہوں''(یوحنا ۲۸:۱۶؛۴۲:۸)۔ ''راہ حق اور زندگی میں ہوں''(یوحنا ۶:۱۴)۔ ''الوہیت کی ساری معموری اُسی میں مجسم ہو کر سکونت کرتی ہے''(کلسیوں ۹:۲)۔

دوم۔ نشاۃ عنصریہ۔ ''اب سے ابنِ آدم قادر مطلق خُدا کی داہنی طرف بیٹھا رہے گا''(لوقا ۶۹:۲۲، ۱۷:۲۲، ۲۴، ۳۰)۔

سوم۔ نشاۃ مرائتیہ : ''جس نے مجھے دیکھا اُس نے باپ کو دیکھا''(یوحنا ۹:۱۴)۔ ''وہ اندیکھے خُدا کی صورت ہے''(کلسیوں ۱۵:۱)۔

خُداوند مسیح کی نشاۃ روحیہ ونشاۃ عنصریہ کا قرآن شریف بھی مصدق (تصدیق کرنے والا) ہے۔اور اُسے ''روح اللہ'' اور ''اِنسان'' بھی کہتا ہے۔پس خُداوند مسیح کے سوا اور کوئی نبی رسول، اوتار، بھگت، گرو، رشی، مُنی اور مہاتما وغیرہ اِنسان کامل نہیں ہوا۔اگر کوئی دعویٰ کرے بھی تو بے ثبوت ہو گا۔لوگ اپنی مذہبی کتابوں کے دعویٰ سے بڑھ کر دعویٰ کر کے حق کو چھپاتے۔خود گمراہ ہوتے اور دوسروں کو گمراہ کرتے ہیں۔اور یونہی لفظی کھینچا تانی سے بانیانِ مذاہب کو اُن کے شخصی دُعادی سے بڑھ کر دکھانے کی فضول کوششیں کرتے ہیں۔واضح ہو کہ اس بیسویں صدی کے مسیحی خُداوند مسیح کی زمینی زندگی کے ایام میں موجود نہ تھے۔اس لئے وہ اپنے نجات دہندہ کے چشم دید گواہ نہیں ہو سکتے۔اِسی طرح اس زمانہ کے تمام حامیانِ مذہب اور مقلدان ادیان (مذاہب کے پیرو) بھی اپنے اپنے بانیانِ مذہب کے ایامِ زندگی میں موجود نہ تھے۔وہ بھی اُن کے چشم دید گواہ نہیں ہیں۔اس لئے ہم سب کے

دعاوی کی بنیاد مذہبی کُتب ہی ہوسکتی ہیں۔ لہٰذا صدقِ دلی اور انصاف پروری سے برائے انفصال (جدا ہونا) اور تحقیقِ صداقت اپنی اپنی کُتب کی ورق گردانی کریں تو ثابت ہو جائے گا کہ آپ کے اپنے مذہبی بانیوں کے متعلق دُعاوی، خوش فہمی وہٹ دھرمی کے مبالغ اور شاعرانہ محامد (محمدت کی جمع، اچھائیاں) سے زائد نہیں ہیں۔ ہم نے تو خُداوند مسیح کا اِنسان کامل ہونا اپنے صحائفِ مطہرہ (پاک صحائف) سے ثابت کر دیا ہے۔ اور آیندہ کو جو کچھ ثابت کریں گے اپنے معتقدات (اعتقاد رکھنے والا) سے سند دے کر کریں گے۔

مسیح کن معانی میں خُدا کا بیٹا ہے؟

وہ "پاکیزگی کی رُوح کی اعتبار سے مرُدوں میں سے جی اُٹھنے کے سبب قدرت کے ساتھ خُدا کا بیٹا ٹھہرا" (رومیوں ۱:۴)۔ بیٹے کے بغیر باپ باپ نہیں کہلا سکتا۔ یہاں تک کہ بیٹے کے بغیر باپ کا لفظ بے معنی ہے۔ اس لفظ میں معنی ڈالنے کے لئے بیٹے کا وجود لازمی ہے۔ اس صورت میں بیٹا گویا باپ کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ بغیر بیٹے کے باپ کا تعارف لوگوں سے کروانا محال ہے۔ پس خُدا کا دُنیا پر باپ کی حیثیت میں ظاہر کرنے کے معنی میں بھی مسیح خُدا کا بیٹا ہے۔ "خُدا کو کسی نے کبھی نہیں دیکھا۔ اکلوتا بیٹا جو باپ کی گود میں ہے اُسی نے ظاہر کیا" (یوحنا ۱۸:۱)۔ وہ فرمانبرداری کے اعتبار سے خُدا کا بیٹا ہے۔ "میں اپنی مرضی نہیں بلکہ اپنے بھیجنے والے کی مرضی چاہتا ہوں" (یوحنا ۳۰:۵)۔ "اِنسانی شکل میں ظاہر ہو کر اپنے آپ کو پست کر دیا۔ اور یہاں تک فرمانبردار رہا کہ موت بلکہ صلیبی موت گوارا کی" (فلپیوں ۸:۲)۔ اسی واسطے باپ نے فرمایا کہ "یہ میرا پیارا بیٹا ہے جس سے میں خوش ہوں" (متی ۱۷:۳)۔ وہ الٰہی ذات ہونے کے سبب سے خُدا کا بیٹا ہے "ابتدا میں کلام تھا اور کلام خُدا کے ساتھ تھا اور کلام خُدا تھا۔ یہی ابتدا میں خُدا کے ساتھ تھا" (یوحنا ۱:۱-۲)۔ "وہ اندیکھے خُدا کی صورت اور تمام مخلوقات سے پہلے مولود ہے" (کلسیوں ۱:۱۵)۔ "وہ اُس کے جلال کا پرتو اور اُس کی ذات کا نقش ہے" (عبرانیوں ۱:۳)۔

خُدا سرچشمہ کلام ہونے کی حیثیت سے "باپ" کہلاتا ہے۔ اور کلام (مسیح) اُس سے صادر ہونے کی حیثیت سے "بیٹا" کہلاتا ہے۔ یہ روحانی اصطلاح ہے۔ اس لئے باپ اور بیٹے کے اس رشتہ کو روحانی طور پر رکھنا چاہئے۔ اور کلام جب تک متکلم کی ذات میں مخفی رہے حکمت (لوگاس) کہلاتا ہے اور جب ظاہر ہو تو کلام۔ وہ کلام نفسی (حکمت) ہو کر خُدا کی واحد ذات میں خفی رہتا اور کلام لفظی ہو کر مظہرِ خُدا اور مخلوقات کی پیدائش کی علت (سبب) ٹھہرتا ہے۔ باپ ازلی وابدی حقیقتِ مخفیہ ہے۔ اور بیٹا اُسی کی حیثیتِ ظہوری۔

بہت سے کوتاہ نظر (تنگ نظر) لوگ مسیح کو "خُدا کا بیٹا" کہنے میں خُدا کی جورُو کو وجود لازمی سمجھتے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر اُن کے اس خیال کی غیر معقولیت کو مبرہن کر کے مسیحی مسلمات (درست مسیحی) کے مطابق ابن اللہ کی حقیقت پر مزید روشنی ڈالی جائے۔ سب سے پہلے ہم یہ پوچھ لینے کا حق رکھتے ہیں۔ کہ اگر جورُو کے بغیر بیٹا ہونا ممتنع ہے۔ تو حضرت ابوالبشر (آدم) کی ماں کون تھی۔ باپ کون تھا؟ جیسے آدم کی ماں اور باپ نہ تھے۔ ویسے ہی مسیح کا باپ جسمانی طور پر کوئی نہ تھا کیونکہ وہ مریم باکرہ سے پیدا ہوئے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر ابن اللہ کہنے میں خُدا کی جورو کا وجود لازمی ہے۔ تو عربی محاورہ میں ابن السبیل (سڑک کا بیٹا) کہنے سے سڑک کی جورو کا وجود بھی ضروری ہے۔ چونکہ مسافر کو سڑک کے ساتھ خاص تعلق اور مناسبت ہوتی ہے۔ اس لئے عربی محاورہ میں مجازی طور پر اُس کو ابن السبیل کہتے ہیں۔ نہ یہ کہ سڑک کی بھی کوئی جورُو ہے۔ جس سے مسافر پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح مسیح کو خُدا کا بیٹا کہنے میں خُدا کی جورُو کا وجود ضروری نہیں۔ پھر یہ مسلمات سے ہے کہ خُدا اور اِنسان کی صفات میں بجز مشارکت (حصہ داری) لفظی کے اور کوئی حقیقی اشتراک (شراکت) نہیں ہے۔ مثلاً خُدا سمیع ہے، بصیر ہے، عقیل ہے، مرید ہے۔ بادشاہ ہے۔ اور اِنسان بھی سامع، باصر،

عاقل، صاحب ارادہ اور بادشاہ ہے۔اِنسان کانوں سے سُنتا۔آنکھوں سے دیکھتا۔دماغ سے سوچتا۔دل میں ارادہ کرتا اور تخت پر بیٹھ کر عدالت کرتا ہے۔تو کیا خُدا بھی اِنسان کے سے کان، آنکھ، دماغ، دل اور جسم رکھتا ہے؟ ہر گز نہیں۔اس سے ظاہر ہے کہ خُدا سُننا، دیکھنا، سوچنا اور ارادہ کرنا اور عدالت کرنا اِنسان سے بالکل مختلف ہے۔اور اِنسان کے ساتھ وہ ان اُمور میں محض مشارکت (حصہ داری) لفظی رکھتا ہے۔اسی طرح خُدا کا بیٹا ہونے اور اِنسان کا بیٹا ہونے میں بہت فرق ہے۔اِنسان کا بیٹا بغیر جوُرو کے نہیں ہو سکتا جس طرح بغیر آنکھوں کے اِنسان نہیں دیکھ سکتا خُدا کا بیٹا بغیر جورو کے ہو سکتا ہے۔جیسے وہ بغیر اعضاء کے یہ سارے کام کرتا ہے۔

دراصل خُدا مصدر ہونے کے لحاظ سے باپ ہے۔اور بیٹا صادر ہونے کے لحاظ سے بیٹا ہے۔خُداوند مسیح کا قول ملاحظہ ہو۔"میں باپ میں سے نکلا اور دُنیا میں آیا ہوں" (یوحنا ۲۸:۱۶؛ ۴۲:۸)۔اور ابن اللہ مخلوق نہیں بلکہ مولود ہے۔"وہ اندیکھے خُدا کی صورت اور تمام مخلوقات سے پہلے مولود ہے" (کلسیوں ۱۵:۱)۔اگر وہ محض ابن آدم ہی ہوتا تو لازم تھا کہ قانون ارثی (میراث) کے مطابق اُس میں دُنیوی والدین کی سی عادات وخصائل پائی جاتیں۔لیکن ہم خوب دکھا چکے کہ اُس کی زندگی بھر کے تمام افعال واقوال اور عادات وخصائل الٰہی زندگی۔الٰہی خصلت اور الٰہی صفات کے عین مشابہ تھے۔اسی لئے وہ **جبرائیل کی گواہی کے مطابق خُدا کا بیٹا تھا**۔"اس سب سے وہ پاکیزہ جو پیدا ہونے والا ہے خُدا کا بیٹا کہلائے گا" (لوقا ۳۵:۱)۔

یوحنا اصطباغی کی گواہی۔"چنانچہ میں نے دیکھا اور گواہی دی ہے۔کہ یہ خُدا کا بیٹا ہے" (یوحنا ۳۴:۱)۔

یوحنا رسول کی گواہی۔"یسوع ہی خُدا کا بیٹا مسیح ہے" (یوحنا ۳۱:۲۰)۔

نتن ایل کی گواہی۔"اے ربی تو خُدا کا بیٹا۔تو اسرائیل کا بادشاہ ہے" (یوحنا ۴۹:۱)۔

شاگردوں کی گواہی۔"اُنہوں نے اُسے سجدہ کرکے کہا۔یقیناً تُو خُدا کا بیٹا ہے" (متی ۳۳:۱۴)۔

پطرس کی گواہی۔"تُو زندہ خُدا کا بیٹا مسیح ہے" (متی ۱۶:۱۶)۔

رومی صوبہ دار کی گواہی۔"یہ آدمی بے شک خُدا کا بیٹا تھا" (مرقس ۳۹:۱۵)۔

پولُس رسول کی گواہی۔"اور فوراً عبادت خانوں میں یسوع کی منادی کرنے لگا کہ وہ خُدا کا بیٹا ہے" (اعمال ۲۰:۹)۔

شیاطین کی گواہی۔"اے یسوع خُدا تعالیٰ کے بیٹے" (مرقس ۵:۷؛ متی ۲۹:۸؛ لوقا ۲۸:۸)۔

مسیح کا اپنا اقرار۔"میں خُدا کا بیٹا ہوں" (یوحنا ۳۶:۱۰)۔

خُدا کی گواہی۔"یہ میرا پیارا بیٹا ہے جس سے میں خوش ہوں" (متی ۵:۱۷)۔

پس خُداوند مسیح ابن اللہ کی ابنیت کو جسمانی وانسانی طور پر قیاس کرنا کفر اور جہالت ہے۔اگرچہ مسیحی ایماندار لوگ جنہوں نے نئی پیدائش حاصل کی ہو خُدا کی بیٹے کہلاتے ہیں۔مگر مجازی معنی میں۔اور مجاز حقیقت کی فرع (شاخ) ہے۔ازیں جہت اگر خُدا کا کوئی حقیقی بیٹا نہ ہو تو مجازی کبھی نہیں ہو سکتا۔اور حقیقی بیٹا مسیح ہے جس کو اکلوتا بیٹا کہا گیا ہے۔اور رالفاظ اکلوتا بیٹا ہی سے بخوبی ثابت ہے کہ جس معنی میں مسیح خُدا کا بیٹا ہے اُس معنی میں اور کوئی شریک نہیں (یوحنا ۱۸،۱۴:۱؛ ۱۶:۳)۔اور ایماندار لوگ تو مسیح پر ایمان لا کر اُس کی معرفت خُدا کے بیٹے کہلا سکتے ہیں۔"لیکن جتنوں نے اُسے قبول کیا اُس نے

اُنہیں خُدا کے فرزند بننے کا حق بخشا"(یوحنا ۱۲:۱)۔اور مسیح کی معرفت ایماندار خُدا کے "لے پالک (لے کر پالے ہوئے) فرزند بن جاتے ہیں نہ کہ حقیقی"(گلیتوں ۴:۵)۔اب"جو کوئی بیٹے کا انکار کرتا ہے اُس کے پاس باپ بھی نہیں۔اور جو بیٹے کا اقرار کرتا ہے اُس کے پاس باپ بھی ہے"(۱۔یوحنا ۲:۲۳)۔"جو بیٹے پر ایمان لاتا ہے ہمیشہ کی زندگی اُس کی ہے۔ لیکن جو بیٹے کی نہیں مانتا زندگی کو نہ دیکھے گا۔بلکہ اُس پر خُدا کا غضب رہتا ہے"(یوحنا ۳:۳۶)۔یہ ہیں ابن اللہ کے صحیح معنی جو مسیحی لوگ مانتے ہیں۔اور چُغد طینت (شر شت، خصلت) لوگ خواہ مخواہ کی بھونڈی اور کُفر آمیز تاویلیں اس مبارک مسئلہ کی کر کے اپنی اوچھی (نازیبا) ذہنیت کا اظہار کیا کرتے ہیں۔دراصل وہ نور کے مخالف ہونے کے باعث ایسا کرتے ہیں۔کیونکہ "نور دنیا میں آیا ہے اور آدمیوں نے تاریکی کو نور سے زیادہ پسند کیا۔اس لئے کہ اُن کے کام بُرے تھے۔کیونکہ جو کوئی بدی کرتا ہے وہ نور سے دشمنی رکھتا ہے۔اور نور کے پاس نہیں آتا۔ایسا نہ ہو کہ اُس کے کاموں پر ملامت کی جائے"(یوحنا ۱۹:۲-۲۰)۔

مسیح اِنسان [2] اور خُدا کا برزخِ کامل

خُدائے واجب الوجود اور لا محدود و محیطِ کل کا ممکنات و محدثات اور محدودات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہو سکتا جب تک ایک واسطہ فی مابین الواجب و ممکن نہ ہو۔اور واسطہ بھی وہی ہو سکتا ہے جو بوجہ حادث اور بوجہ قدیم ہو کر ربط حادث بالقدیم قائم کرنے کی صلاحیت رکھے۔اس مسئلہ کے متعلق کہ آیا واجب و ممکن میں واسطہ کی ضرورت ہے یا نہیں؟ تین فریق (گروہ) ہیں۔اور سب کے خیالات میں اختلاف ہے۔

- واحدۃ الوجود کے قائلین (ماننے والے) کے نزدیک تو واسطہ کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔وہ دوئی (جدائی) کے مطلق قائل نہیں۔چنانچہ جب دوئی نہ ہوئی تو واسطہ کی ضرورت نہ رہی۔
- وہ لوگ ہیں جو واسطہ کو تو ضروری مانتے ہیں۔ مگر اُن کا ماننا اور نہ ماننا دونوں برابر ہیں۔ جیسا کہ ابھی ظاہر ہو جائے گا۔اور وہ واسطہ کی تین صورتیں مانتے ہیں۔

اوّل۔واسطہ فی العروض۔ کسی صفت کے ساتھ حقیقتاً و بالذات واسطہ ہی متصف (صفت رکھنے والا) ہو۔اور ذی واسطہ میں وہ صفت مطلقاً نہ ہو۔مگر چونکہ واسطہ و ذی واسطہ میں ایک طرح کا تعلق و ملبس ہے اس بنا پر ذی واسطہ کی طرف بھی اُس صفت کی نسبت کر سکتے ہیں۔مثلاً ریل گاڑی کے بیٹھنے والے حقیقت میں متحرک نہیں ہیں۔بلکہ ریل گاڑی متحرک ہے۔لیکن ایک خاص مناسبت کے لحاظ سے ہم ریل گاڑی کے بیٹھنے والوں کو بھی متحرک کہہ سکتے ہیں۔

دوم۔واسطہ فی الاثبات۔ کوئی صفت ذی واسطہ میں موجود ہو اور واسطہ میں اصلا (اصل کے اعتبار سے) موجود نہ ہو۔بلکہ ذی واسطہ کے موصوف کر دینے میں سفیر محض ہو۔مثلاً رنگریز واسطہ ہے۔لیکن صفت رنگینی ذی واسطہ یعنی کپڑے میں پائی جاتی ہے۔لیکن خود رنگریز میں یہ

---

[2] اس عقلی فلسفہ کے لئے ہم علامہ ایس۔ایم پال صاحب کی تصنیف "اِنسان کامل یا مظہر خُدا" کے قرضدار ہیں۔اور اُس کو نقل کرنے میں بعض جگہ معمولی سی لفظی تبدیلی اختصار کے لئے۔پورا تذکرہ اُن کی تصنیف میں ملے گا"(مصنف)

صفت موجود نہیں ہوتی۔ہاں یہ ممکن ہے کہ وہ خُود اپنے آپ کو گُلا یا جزاًرنگین کردے۔ مطلب یہ کہ جو صفت مستقل طور سے ذی واسطہ یعنی کپڑے میں موجود ہے وہ بعینہ واسطہ یعنی رنگریز میں موجود نہیں ہے۔

سوم۔ واسطہ فی الثبوت۔ وہ صفت واسطہ وذی واسطہ دونوں میں حقیقیہ موجود ہو۔ لیکن واسطہ میں بطور عِلت اور ذی واسطہ میں بطور معلول (وہ شے جس کا کوئی باعث یا سبب ہو، اصطلاح منطق میں پھل، ثمرہ) ہو۔ مثلاً لکھتے وقت قلم کی حرکت سے پیدا ہوتی ہے۔

پس ہاتھ حرکت میں واسطہ اور قلم ذی واسطہ ہے۔ حرکت دونوں کے ساتھ قائم ہے۔ لیکن ہاتھ کی حرکت علت اور قلم کی حرکت معلول ہے۔وسائط ثلاثہ کی تشریح وتفصیل سے خوب روشن کہ خُدا کا واسطہ ہونا عالم کی ذات وصفات میں بمعنی فی العروض (ظاہر ہونا) وفی الثبوت ممکن نہیں۔ اس لئے کہ واسطہ فی العروض سے لازم آتا ہے کہ جتنی صفات مخلوقات میں ہیں حقیقتہً خُدا ہی کی صفات ہیں۔اور مخلوقات کی طرف ان کی نسبت محض مجازی ہے۔اس کے ماننے میں یہ قباحت ہے کہ مخلوقات میں اکثر صفاتِ ذمیمہ (بُرائی) اور اوصافِ دُنیہ ایسی ہیں جن کی نسبت خُدا کی ذات کی طرف کر ناسراسر کفر وگستاخی ہے۔ واسطہ فی الثبوت ہونا اس لئے غلط ہے کہ اوّل تو اس میں وہی قباحت پائی جاتی ہے جس کی تردید ابھی کی جاچکی ہے۔ دوسری خرابی یہ لازم آتی ہے کہ چونکہ معلول تخلف (پیچھے رہ جانا، دیر لگانا) علت سے محال ہے، اس لئے مخلوقات کی صفات قدیم اتنی پڑیں گی، اور یہ عقلی ونقلی طور پر باطل ہے۔ پس واسطہ فی الاثبات میں کسی قدر گنجائش ہے، یعنی کی باری تعالیٰ جو صفات اپنی مخلوقات کو دیتا ہے خود ان صفات سے مبرہ ہے۔اور خالق ومخلوق کی صفات میں بجز مشارکت لفظی کے اور کوئی مناسب ومشابہت نہیں ہے۔ لیکن اس قسم کا واسطہ صرف خالق کے وجود کی ثابت کرتا ہے۔ جیسے مصنوع اپنے صانع اور مکتوب اپنے کاتب پر دلالت کرتا ہے، اس قسم کے واسطہ کو مظہر ناقص کہتے ہیں۔اور یہ اسلئے مفید مطلب نہیں کہ یہ ہم پہلے ہی مانتے ہیں۔ واسطہ تو ایسا چاہیے جو حادث وقدیم اور ممکن وواجب دونوں کو ملائے۔

- وہ فریق ہے۔ جو واجب اور ممکن کے درمیان ایک ایسے واسطہ کے قائل ہیں جس میں وجوب (لازمی) اور امکان دونوں صفتیں موجود ہوں۔تا کہ ربطِ حادث بالقدیم قائم کرسکے۔اور اس واسطہ کو وہ اِنسان کامل اور مظہر جامع اور برزح (مصیبت اور آرام کا درمیانی درجہ) کبریٰ (عظیم) کہتے ہیں۔

لیکن اس میں یہ نقص ہے کہ "اِنسان کامل"، مخلوق اور حادث ہے۔اور واجب وممکن کے درمیان برزخ (مصیبت اور آرام کا درمیانی درجہ) وہ ہو سکتا ہے جو وجوب وامکان ہر دو طرح کی صفات سے متصف (صفت کیا ہوا) ہو۔ چنانچہ حکماء متفلسفین (علمِ فلسفہ کے جاننے والے) اور ماہرین طبعیات دورِ حاضرہ نے تجربیات کی بنا پر موجودات کے ہر طبقہ کو دوسرے طبقہ کے ساتھ ربط دینے کے لئے برزخ (مصیبت اور آرام کا درمیانی درجہ) کے وجود کو لا بدی (ضروری) مانا ہے۔ مثلاً

(۱) البتہ جمادات ونباتات کا برزخ (مصیبت اور آرام کا درمیانی درجہ) مرجان (مونگا) کو مانا ہے۔ مونگا پتھر ہونے کے لحاظ سے جمادی خاصیت رکھتا ہے۔اور قوتِ نامیہ (بڑھنے کی قوت) رکھنے کے باعث نباتی خاصیت (جڑی بوٹیوں جیسی خوبی) بھی رکھتا ہے۔ لہٰذا جمادی ونباتی خصائص کا اس میں اجتماع ہے۔اس لئے وہی ان ہر دو طبقات کا برزخ (مصیبت اور آرام کا درمیانی درجہ) ہے۔

- ❖ زمانہ حاضرہ میں بعض مغربی ممالک میں ایک گوشت خور درخت دریافت ہوا ہے جو حیوانوں اورپرندوں کا گوشت ایسے ہی کھاتاہے ، جیسے شکاری درندے۔ گوشت کھانادرندوں کی خاصیت ہے۔ پس یہ درخت طبقاتِ نباتات وحیوانات ہر دو کی خصائص رکھتاہے۔اس لئے یہی ان ہر دوطبقات کا برزخ (مصیبت اورآرام کادرمیانی درجہ) ہے۔
- ❖ طبقہ حیوانات طبقہ اِنسانی کا برزخ (مصیبت اورآرام کادرمیانی درجہ) بندرمانا گیاہے۔اس جانور میں بعض ایسی صفات پائی جاتی ہیں۔ جن کوخواہ مخواہ خصائص فوق الحیوانات کہناپڑتاہے۔ایک طرف تواس کی معمولی حیوانی خاصیات دیگر تمام حیوانات سے ملتی ہیں۔اور دوسری طرف اس کی خاص اعلےٰ صفات اِنسانی طبقہ کی ادنیٰ خاصیتوں کے مشابہت کو دیکھ کر ہی ڈارون صاحب نے بندرسے اِنسان کا ہوناثابت کرنے کی کوشش کی۔
- ❖ اب طبقاتِ اِنسانی والٰہی کے درمیان "اِنسان کامل" کو برزخ (مصیبت اورآرام کادرمیانی درجہ) ماناجاتاہے لیکن یہ سراسر غلط ہے۔ کیونکہ اِنسان کامل کا وجوب وقدامت سے کوئی تعلق نہیں وہ محض ممکن اور حادث ہے۔ وہ اگرچہ بدرجہ انتہا کمالیت کو حاصل کرلے تو بھی وہ مخلوق اور حادث ہی رہے گا۔اس صورت وہ گڑھا جو حدوث وقدامت اور وجوب وامکان کے درمیان حائل ہے کس طرح بھرا جاسکتاہے ؟ چنانچہ اِنسان وخُدا کا برزخ (مصیبت اورآرام کادرمیانی درجہ) وہی ہوسکتاہے جو بوجہ حادث اور بوجہ قدیم ہوکر ربطِ حادث بالقدیم قائم کرنے کی کامل واکمل صلاحیت رکھے۔یعنی وہ کامل اِنسان اور کامل خُدا ہو۔ پس کلمۃ اللہ جو تکوین (پیدائش) کائنات کی علت ہے۔اور بحیثیت تخلیق خُدا اور کائنات کا درمیانی ہے ،وہی جسم دھار کراِنسانوں کے مشابہ ہوگیا۔ تاکہ وہ خُدا کامل ہونے کے ساتھ اِنسان کامل بھی ہوسکے اور برزخیت (درمیانی) کے فرض کوبطریق احسن انجام دے سکے۔ چنانچہ خُداوند مسیح کے سوااور کوئی اِنسان وخُدا کا برزخ (مصیبت اورآرام کا درمیانی درجہ) نہیں ہوسکتا۔

’’کیونکہ خُدا ایک ہے اور خُدا اوراِنسانوں کے بیچ میں درمیانی بھی ایک یعنی مسیح یسوع جواِنسان ہے‘‘ (۱۔ تیمتھیس ۵:۲)۔

بالفرض محال اگراِنسان کامل بھی برزخ (مصیبت اورآرام کادرمیانی درجہ) ہوسکتاہے تو پھر بھی خُداوند مسیح کے سوا کسی اِنسان کامل کا وجود نابود ہے۔ جیسا ہم پیشتر نشاۃ ثلاثہ میں علامہ جامی کا نظریہ درباره (نسبت، بابت) اِنسان کامل پیش کرکے ثابت کرچکے ہیں۔اُس معیار کے مطابق سوائے مسیح کے کسی اور کواِنسان کامل ثابت کرنا ناممکن ہی نہیں بلکہ محال ہے۔ پس انجیل کا دعویٰ ہے کہ خُداوند مسیح کامل اِنسان اور کامل خُدا ہیں اور خُدا اور دُنیا کے حقیقی درمیانی۔ چنانچہ آپ نے فرمایا۔ ’’راہ حق اور زندگی میں ہوں۔ کوئی میرے وسیلے کے بغیر باپ کے پاس نہیں آتا‘‘ (یوحنا۶:۱۴)۔

یہ ایک کھلی اور ناقابل تردید حقیقت ہے کہ جب تک کسی شخص کے ساتھ واقفیت نہ ہو۔اُس سے محبت کرنا ناممکن ہے۔ واقفیت اور محبت دونوں لازم وملزوم ہیں۔ایک کے بغیر دوسری کا وجود محال ہے۔ جہاں واقفیت ہوگی وہاں محبت ہوسکے گی اور جہاں محبت ہوگی وہاں ضرور پہلے ہی سے واقفیت ہوگی۔دُنیامیں سینکڑوں ایسے شہر ہیں جن کے میں نام سے بھی واقف نہیں ہوں۔اور نہ اُن کے باشندوں کو جانتاہوں۔اس لئے میں اُن سے محبت نہیں کرسکتا۔ جب تک کوئی شخص میرا جان پہچان نہ ہو۔ روشناس نہ ہو میری اوراُس کی کبھی ملاقات ہی نہ ہوئی ہو۔ توبھلا کس صورت میں اُس سے محبت کرسکتاہوں ؟ پس اسی طرح اگر ہم خُدا سے واقف نہیں اور اُس کو جانتے نہیں۔ تو اُس کی عبادت جو محبت پر مبنی ہے کیسے کرسکتے ہیں ؟ اگر کرسکتے ہیں تو ایک ’’نامعلوم خُدا‘‘ کی اور ایسی عبادت کسی حقیقت کی نہ ہوگی بلکہ وہم کی۔ ناواقف ہستی کی نامعلوم خیالی خُدا کی۔ پس خُدا سے محبت کرنے اور اُس کی عبادت کرنے کے لئے اُس سے واقفیت پیدا کرنا ضروری ہے۔اوراُس سے واقفیت نہ تو محض مشاہدہ فطرۃ سے ہوسکتی ہے۔ نہ عقلی دلائل اُس نادیدہ پردہ

نشین ہستی سے ہمارا تعارف کرواسکتی ہیں اور نہ ہی الہام کے لفظی و تمثیلی بیانات اُس کا یقینی علم ہمیں حاصل کرواسکتے ہیں اُس سے واقفیت حاصل کرنے۔ اُس کی ماہیت اور صفات کا صحیح تصور کرنے کے لئے مظہرِ خُدا کی ضرورت ہے۔اور بغیر مظہر کے خُدا کا صحیح اور یقینی تصور ہی محال ہے۔اور وہ مظہرِ جیساہم پہلے یقینی دلائل اسے ثابت کر چکے خُداوند مسیح ہے جس نے فرمایا"جس نے مجھے دیکھا اُس نے باپ کو دیکھا"۔ پس جو کوئی خُداوند مسیح (مظہرِ خُدا) میں ہو کر خُدا کی عبادت کرتا ہے۔وہ یقیناایک معلوم ایک واقف خُدا کی عبادت کرتا ہے۔

اب شاہد کوئی یہ سوال کرے کہ خُداوند مسیح اگر نادیدہ خُدا کی ظاہری صورت ہے۔ جس کو دیکھ کر ہم خُدا سے روشناس ہو سکتے ہیں۔اور ہماری خُدابینی کی خواہش کا جواب مل سکتا ہے۔ تواب صدیوں سے مسیح بھی نادیدہ ہے۔وہ ظاہری مادی صورت میں ہمارے سامنے موجود نہیں ہے۔دوہزار برس قبل جب وہ مجسم صورت میں موجود تھااُسی وقت لوگ اُس میں خُدا کو دیکھ سکتے تھے۔اب اس زمانے کے لوگوں کے لئے خُدا پھر"نامعلوم"ہے۔اس سوال کے جواب میں مندرجہ ذیل امور قابلِ غور ہیں۔

- ❖ فوق العادت امور میں استمرار ودوام (ہمیشہ رہنا) جائز نہیں۔ورنہ وہ اپنے اعلیٰ مقاصد میں ناکام رہیں گے۔اور فطرت کے عام معمولی واقعات میں شامل ہو کر فوق الفطرت نہ رہیں گے۔اور لوگوں کو اُن سے حیرت واستعجاب (حیرانی، تعجب) بھی ہو گا۔ مثلاً سورج کا وجود اگرچہ سرمایہ غرائب (انوکھے) ونوادر (عجیب وغریب) ہے۔لیکن چونکہ ہم اُسے روز دیکھتے ہیں اس لئے نہ تواُس کے طلوع وغروب سے کچھ دلچسپی رکھتے ہیں اور نہ ہی اُس سے حیران ہوتے ہیں۔ مظہرِ خُدا (مسیح) کا زینت افزائے کاشانہ گیتی (جہاں میں ایک چھوٹا سا گھر) ہونا سب سے بڑا نادر اور فوق العادت واقعہ تھا۔اگر وہ ہمیشہ ظاہری ودیدنی صورت میں قائم رہتا تو لوگوں کی دلچسپی کا باعث نہ ہوتا۔دُنیا نے آگے ہی اُس کی کیا قدر کی کہ وہ اور اس دُنیا میں رہتا۔خُدااپنے بیٹے کو ہمیشہ جسمانی صورت میں اس خرابستان (خراب جگہ) میں رکھ کر اپنی بے قدری اور تحقیر گوارا نہیں کر سکتا۔کیونکہ "وہ غیور خُدا ہے"۔
- ❖ خلقت اور خُدا کے درمیان بہت سے واقعات کا ظہور اُس کے صعود فرمانے کے ساتھ وابستہ اور مشروط ہے۔اس لئے اگر وہ اس دیدنی عالم کو چھوڑ کر صعود نہ فرماتا تو وہ واقعات ظہور میں نہ آتے۔علاوہ ازیں عہدِ عتیق وجدید میں اُس کے دوبارہ اس دنیا میں آنے کے متعلق پیش گوئیاں موجود ہیں اُن کا پورا ہونا بھی ضروری تھا۔
- ❖ انجیلِ مقدس اُس کا مکمل فوٹو ہے۔اُس کے مطالعہ سے اُس کا دیدار حاصل کیا جاسکتا ہے۔
- ❖ خُدا کا مظہر مسیح اور مسیح کا مظہر اُس کی کلیسیا ہے۔نادیدہ مسیح کی دیدنی صورت کلیسیاء ہے۔

لیکن موجودہ کلیسیاء مسیح کی ناقص حیثیت ہے۔اس لئے وہ اُس کے نورانی خدوخال کو زیادہ صفائی کے ساتھ دُنیا کے سامنے پیش نہیں کر سکتی یعنی پورے طور پر یہ نہیں کہہ سکتی کہ "جس نے مجھے دیکھا اُس نے مسیح کو دیکھا"۔دُھندلے آئینے میں شکل صاف نظر نہیں آیا کرتی۔اسی طرح کلیسیا جو مسیح کا آئینہ ہے فی الحال بہت سی جسمانی آلائشوں اور نفسانی آلودگیوں کے باعث دُھندلے آئینے کی طرح مسیح کی کامل مظہر نہیں ہے "اب ہم کو آئینے میں دھندلا سا دکھائی دیتا ہے"۔اور جب کلیسیاء اُس جلالی صورت پر درجہ بدرجہ بدلتی اور ترقی کرتی جائے گی۔تو ایک دن اُس کے چہرے سے مسیح کا جلال ایسے منعکس ہو گا جیسے صاف آئینے میں (۲۔کرنتھیوں ۱۸:۳)۔ایک مصور ایک تصویر کو جو فنی نکتہ نگاہ سے نہایت اعلیٰ ہے سامنے رکھ کر اُس کی نقل ایک دوسرے کاغذ پر بناتا ہے۔اُس کا خاکہ کھینچتا ہے۔گاہے مٹاتا اور گاہے پھر بناتا ہے۔اگر اُس کی اُس نامکمل تصویر کو دیکھ کر کوئی کہے کہ یہ تصویر اچھی نہیں بہت بھدی ہے، تو اس سے اصل تصویر کا نقص ثابت نہ ہو گا۔اور عقلمند آدمی فوراً سوچ لے گا کہ یہ نقل ابھی نامکمل ہے۔ کسی وقت یہ ہوبہو اصل کے

مطابق بن جائے گی۔اسی طرح کلیسیاء کا اصل نمونہ مسیح ہے جس کے سانچے میں وہ ابھی ڈھل رہی ہے۔اور تا حال ناقص حالت میں ہے۔ ''لیکن جب کامل آئے گا تو ناقص جاتا رہے گا'' (۱۔کرنتھیوں ۱۰:۱۳)۔پس کلیسیاء مسیح کا مظہر ہے اور درجہ بدرجہ اُس کی ہم شکل بن رہی ہے۔

خُداوند مسیح کی آمد نے خُدا کے وجود باجود کے متعلق پیدا شدہ تمام توہماتِ فاسدہ (خراب) اور اظانین باطلہ کو خرقہ پارنیہ (پُرانا کپڑا) کی طرح تار تار کر کے رکھ دیا۔اگر کوئی گوشہ تنہائی میں یکسوئی قلب کے ساتھ بیٹھ کر اپنی فُرصت کی قیمتی گھڑیوں میں اس تعلیم سعادت (بھلائی) تنظیم پر صفا باطنی اور منصف مزاجی سے غور وخوض کرے تو وہ بغیر ضمیر سے جنگ کئے خُداوند مسیح کو مظہرِ خُدا اور برزخ (مصیبت اور آرام کا درمیانی درجہ) کبریٰ (عظیم) تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔اس طریق پر ثواب اور مسئلہ لاجواب کو سمجھنے کے لئے دیدہ بینا اور ذہن رسا چاہیے۔چونکہ تعصب اور مسئلہ تجسم باہم ضدین ہیں۔اس لئے ایک ہی وقت میں یہ دونوں اکٹھے نہیں رہ سکتے۔پس غرض ہے کہ تعصب کو چھوڑ کر اس پر غور فرمایئے اور یونہی کسی نااہل شخصیت کو کُرسی برزخیت پر زبردستی بٹھانے کی سعی نہ فرمایئے۔

کلام مجسم کی تین صورتیں

کلام مجسم کی تین صورتیں ہیں۔اور اُنہیں کو ہم ان اس کتاب کے گویا اعضائے رئیسہ ٹھہرا کر اب تک بحث کی ہے۔اب ان کی اجمالی طور پر معرض تحریر میں لانا مناسب اور گویا کتاب کے منتہائے مقصود کو خلاصہ بیان کرنا ہوگا۔وہ تین صورتیں یہ ہیں۔

- کائنات کلام مجسم ہے خُدا نے کہا اور وہ موجود ہو گئی۔یعنی جو کلام اُس کے منہ سے صادر ہوا اُس نے کائنات کی صورت میں جسم اختیار کر لیا۔ اس کا مفصل بیان عقل اور مذہب کے زیر عنوان کیا جاچکا ہے۔اور تجسم الٰہی کے بیان میں چھوٹی سُرخی ''موجودات اور خُدا کا علم'' کے ماتحت اجمالی (مختصر) طور پر اس پر بحث کی جاچکی ہے۔
- بائبل مقدس کلام مجسم ہے۔کلام نفسی جو ذاتِ الٰہی میں خفی (پوشیدہ) تھا کلام لفظی کی صورت میں ظاہر ہو کر کتابی شکل میں مرتب ہوا۔اس کو الہام کہتے ہیں۔''الہام کی ضرورت'' کے زیر عنوان اس کو بالتفصیل بیان کیا گیا۔اور ''تجسم الٰہی'' کے بیان میں چھوٹی سُرخی ''الہام اور خُدا کا علم'' کے ماتحت اجمالی طور پر اس پر بحث ہو چکی ہے۔
- کلامِ مجسم کے تیسرے معنی ہیں کہ ذاتِ الٰہی کے اقنوم ثانی نے جسم اختیار کیا جس کا مظہرِ خُدا کہا جاتا ہے۔یہ کلام مجسم کی انتہائی کمالیت ہے جس سے خُدا کی ذات وصفات کا ثبوتی تصور اور یقینی علم حاصل ہوتا ہے۔چنانچہ ''تجسم الٰہی'' کے زیر عنوان اس پر مفصل بحث کی گئی ہے۔

تجسم کے فوائد

- خُدا کی ذات وصفات کا یقینی اور صحیح علم حاصل ہوتا ہے۔اور وہ ''ایک معلوم'' خُدا ثابت ہوتا ہے۔
- اِنسان فطرتی طور پر پیکر (بھرا ہوا) محسوس کا خوگر (معلوم کرنے کو پسند کرنے والا) ہے۔اس لئے اُس کی خُدا بینی کا جواب مظہر دیتا ہے۔
- جنسی مغائرت محبت کی مانع (روکنے والا، ممانعت) ہے۔خُدا اور اِنسان میں جنسی مغائرت (اجنبیت) مسلم ہے۔تجسم کے ذریعے یہ وقت دور ہوتی اور اِنسان صحیح معنوں میں خُدا سے محبت کر سکتا ہے۔
- تجسم کے ذریعے ذاتِ الٰہی کے اقانیم ثلاثہ کا سربستہ (پوشیدہ) راز کھلتا ہے جو بصورت دیگر محال ہوتا ہے۔

- تجسم کے ذریعے اِنسان کی نجات کا انتظام ہوتا ہے۔ چونکہ یہ تقاضا ہے عدل الٰہی اِنسان کی جان کے عوض میں ایک عوضی قربانی کی ضرورت تھی۔ تاکہ اِنسان کی جان موت سے رہائی پائے۔ اور قربانی کے لئے جسم کی ضرورت ہے۔ پس اقنوم ثانی جسم میں ظاہر ہوا تاکہ اِنسان کی جان کا مبادلہ ٹھہرے۔
- خُدا نے اِنسان کو اپنی صورت پر بنایا تھا لیکن انسان نے گناہ کی کالک سے وہ الوہیت نما صورت بگاڑلی اور ضرور ہے کہ وہ دوبارہ خُدا کی صورت پر بنے۔ مگر جس کی صورت پر اُس کو بننا چاہئے وہ نادیدہ ہے۔ اس لئے نادیدہ کی صورت پر کیسے بنے؟ ضرور ہے کہ الٰہی صورت کا کوئی ظاہری و دیدنی نمونہ اُس کے سامنے ہو۔ پس وہ نمونہ مظہرِ خُدا (مسیح) میں ملتا ہے۔ اُس کی صورت پر بننا ہی خُدا کی صورت پر بحال ہونا ہے۔
- خُدائے واجب الوجود اور اِنسان ممکن الوجود محدود کے درمیان حد فاصل (وہ حد جو دو چیزوں کے درمیان آکر ان کو ایک دوسرے سے علیحدہ کردے) ہے۔ جو دونوں کو ایک دوسرے سے جُدا رکھتی ہے۔ ان دونوں کے ملاپ کے لئے ایک واسطہ کی ضرورت ہے۔ اور واسطہ وہی ہو سکتا ہے جو بوجہے حادث اور بوجہے قدیم ہو۔ تاکہ ربطِ حادث بالقدیم قائم کر سکے۔ پس یہ مشکل بھی تجسم کے ذریعے دور ہوتی ہے۔ اور اِنسان کا اُس کے ذریعے سے خُدا سے ملاپ ہو جاتا ہے۔
- تجسم کے ذریعے اِنسان کی قدر و منزلت بڑھ جاتی ہے۔ مظہر کے ایک معنی ہیں "اِنسانیت نما الوہیت" جس نے ایمانداروں کو "الوہیت نما اِنسان" بنا دیا۔ وہ اِنسانوں کے مشابہ ہو گیا جس سے ایماندار اِنسان خُدا کے مشابہ ہو گئے۔

اب دُنیا کی عقلیں گناہ کی شدت سے اس قدر فاسد (آلود) اور تاریک ہو گئی ہیں کہ وہ کسی صورت اس تعلیم سعادت (بھلائی) تنظیم کو تسلیم نہیں کر تیں۔ اگر خُدا نادیدہ و پوشیدہ اور فوق الفہم و ادراک رہے تو لوگ اُس کو کسی دیدنی وہ ظاہری اور ممکن الفہم صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور اگر وہ کسی صورت ظاہری میں ظاہر نہ ہو تو اُس کی ہستی کے متعلق شکوک میں پڑ کر آخر اُس سے منکر ہو جاتے ہیں۔ اور اگر وہ کسی دیدنی صورت میں تجسم اختیار کر کے مرئی (وہ جسے دیکھا جا سکے) و مجسم اور ممکن الفہم ہو جائے اور اُن کی خُدا بینی کی فطری خواہش کا جواب دے تو لوگ اُس کو محض ایک خُدا رسیدہ اور راستباز آدمی سمجھ کر اُس کی الوہیت و خُدائی کا یکسر انکار کرتے ہیں۔ اب بتایئے ان دو صورتوں کے علاوہ اور کون سی تیسری صورت ممکن ہے جس سے خُدا انسان کی خُدا بینی کی خواہش کو پورا کرے؟

"میں نے تیری خبر کان سے سُنی تھی۔ پر اب میری آنکھ تجھے دیکھتی ہے" (ایوب ۵:۴۲)۔

(۹)

گناہ

ہر گناہ زنگیست بر مراتِ دل   دل شود زیں زنگ ہا خوار و خجل

چوں زیادت گشت دل را تیرگی   نفس دوں را بیش گرد و خیر گی

آغازِ گناہ

تمام مذاہبِ عالم اور ادیان دہر کسی نہ کسی صورت میں گناہ کے وجود کے قائل ہیں۔ اگرچہ گناہ کے آغاز کے متعلق سب کے خیالات اور آراء میں اتفاق کُلی نہیں۔ بلکہ بعض خیالات اور فلسفے ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ تاہم یہ سب تسلیم کرتے ہیں کہ گناہ دُنیا میں ضرور موجود ہے۔ بعض اُس کو اگیان (لاعلمی) اوڈیا اور بھَرم مانتے ہیں۔ بعض اُس کو طبع انسانی کا خاصہ ذاتی مانتے ہیں اور خُدا کو نیکی و بدی ہر دو کا موجد تسلیم کئے بیٹھے ہیں۔ گناہ کا وجود مسلم الثبوت ہے۔ اور کوئی صاحبِ بصیرت اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا۔ اور بدی و نیکی ایسی دو متضاد اشیاء ہیں جن میں تاحشر کبھی اتحاد و مطابقت نہیں ہو سکتی۔ کافہ انام (آدمیوں کا گروہ، سب لوگ) پر کوئی ایسی زبان اور لُغت یا کتاب نہیں جس میں گناہ کے وجود کے ثبوت میں الفاظ چاہئے "نہ چاہئے" واجب "ناواجب" جائز "ناجائز" روا "ناروا" مناسب "نامناسب" اچھا "اور بُرا" وغیرہ نہ پائے جاتے ہیں۔ اور آج تک کوئی ایسی سوسائٹی معرضِ ظہور میں نہیں آئی جس نے ان الفاظ کے مفہوم کو وہم سے تعبیر کرکے ان کے زور کو کھو دیا ہو۔ ہر فردِ بشر اپنے وجدانیات (جاننے اور دریافت کرنے کی قوت) میں اس حقیقت نفس الامری (وہ حالات واقعی جنہیں دوست دشمن سب نے مانا ہے) کو بزور محسوس کرتا اور ان ٹیوئشل گواہی رکھتا ہے۔ ضعیف (کمزور) سے ضعیف ضمیر بھی جائز و ناجائز اور واجب و ناواجب کی کیفیت سے آگاہ ہے۔ گناہ ایک ایسی حقیقت ہے جو گویا جبری طور پر انسان کو اپنے وجود کا قائل بناتی ہے۔ زبان سے کوئی اس کا انکار کرے تو کرے لیکن دل سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اب جس طرح یہ صحیح ہے کہ گناہ کے آغاز کے متعلق تمام مروجہ عقائد اور فلسفے باہمد گر (آپس میں) متضاد و متبائن (اُلٹا) ہیں۔ اُسی طرح یہ بھی درست ہے کہ ایک ہی وقت میں ہم اُن سب کو صحیح و درست نہیں سمجھ سکتے۔ اب اس جگہ ہم تمام دیگر خیالات و نظریات کو چھوڑ کر صرف بائبل مقدس کی روشنی میں آغازِ گناہ کے خیال کو بدلائل عقلیہ (عقلی دلیل) اور براہین نقلیہ (نقل کی ہوئی دلیل) پیش کریں گے۔ جس سے گناہ کی پوری حقیقت ناظرین پر کھل جائے گی۔

بائبل مقدس کا بیان ہے کہ خُدا تعالیٰ پاک و قدوس ہے۔ "بنی اسرائیل کی ساری جماعت سے کہہ کہ تُم پاک رہو۔ کیونکہ میں جو خُداند تمہارا خُدا ہوں پاک ہوں"(احبار ۱۹:۲)۔ "اور ایک (فرشتے) نے دوسرے کو پکارا اور کہا۔ قدوس۔ قدوس۔ قدوس رب الافواج ہے۔ ساری زمین اُس کے جلال سے معمور ہے"(یسعیاہ ۶:۳؛ مکاشفہ ۴:۸؛ ۱۵:۴)۔ "خُداوند کا شکر کرو اس لئے کہ وہ نیک ہے"(۱۔ تواریخ ۱۶:۳۴)۔ خُدائے قدوس و برحق جو تمام مصنوعاتِ مرئیہ (وہ چیزیں جو دکھائی دیں) وغیر مرئیہ (وہ چیزیں جو دکھائی نہ دیں) اور مخلوقاتِ سفلیہ و علویہ (اوپر اور نیچے کی مخلوق) کی

علت فاعلی ہے وہ اپنی طبیعت و فطرت کے خلاف کسی شئے کو ناپاک نہیں پیدا کر سکتا۔ کیونکہ پاک طبیعت کی علت سے ناپاک طبیعت کے معلول کا صدور عقلاً اور نقلاً محال ہے۔ جب وہ خود پاک ہے تو اُس نے مخلوقات کو بھی پاک ہی پیدا کیا۔ چنانچہ بائبل مقدس کا بیان ہے کہ جب خُدا نے سب کچھ پیدا کیا تو کہا کہ "اچھا ہے" (پیدائش ۱۸،۱۲،۱۰:۱) اور اِنسان کی پیدائش کے متعلق بائبل کا بیان ہے کہ "پھر خُدا نے کہا کہ ہم اِنسان کو اپنی صورت پر اپنی شبیہ کی مانند بنائیں" (پیدائش ۲۶:۱)۔ "اور خُدا نے اِنسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا" (پیدائش ۲۷:۱)۔ "خُدا نے اِنسان کو راست بنایا" (واعظ ۷:۲۹)۔ یعنی خُدا نے اِنسان کو پاک راست صاحب ارادہ اور فاعل مختار بنایا۔ خُدا کی صورت پر پیدا کئے جانے سے یہی مراد ہے۔ اور خُدا نے اِنسان کو تمام مخلوقات پر خلیفہ اور سردار مقرر کیا (پیدائش ۲۶:۱؛ زبور ۵:۸-۸) اور خُدا کی حکومت دیگر انی مخلوقات کے علاوہ اِنسان فرشتگان پر بھی تھی اور ہے۔ اور انسان بطور نائب خُدا کے تمام دُنیا پر حکمران ٹھہرایا گیا۔ اور خُدا نے خالق و حاکم ہونے کی حیثیت سے آدم کو چند اوامر نواہی (ایسے احکام جو نہیں کے ساتھ ہیں) بھی دیئے کیونکہ اُس میں اخلاقی وجود و فاعل مختار ہونے کے باعث خُدا کی مرضی کے مطابق یا مخالف عمل کرنے کی قوت فطرتاً موجود تھی۔ شجرِ ممنوعہ کا پھل اُس نے کھایا اور خُدا کے فرمان کی نافرمانی کی۔ شجرِ ممنوعہ کے بیان کو تمثیلی سمجھئے یا اور کوئی اُس کی تاویل کیجئے۔ تاہم یہ ضرور ثابت ہے کہ خُدا کا حکم آدم وحوا نے عدول کیا۔ اور وہ خُدا کی حضوری سے خارج کئے گئے۔ پس گناہ مخلوق کا مخلوق ہے۔ خُدا کا مخلوق آدم اور آدم کا مخلوق گناہ۔ جس طرح پوتا اپنے دادا کا مولود نہیں ہوتا بلکہ اُس کے مولود کا مولود ہوتا ہے۔ اسی طرح گناہ کی ابتدا اِنسان سے ہوئی نہ کہ خُدا سے جب اِنسان کی طبیعت گناہ کے باعث بگڑ کر ناپاک و فاسد ہو گئی تو خُدا کی پاکیزہ طبیعت کے ساتھ اُس کی مطابقت و موافقت قائم نہ رہی۔ اس واسطے تضاد و تفاوتِ طبائع کے باعث خُدا او انسان میں جُدائی ہو گئی۔ کیونکہ دو متضاد طبائع کا اجتماع و اتحاد ناممکن ہے۔ یعنی اجتماع ضدین محال ہے۔ یہ ہے آغازِ گناہ کے متعلق بائبل کی معقول فلاسفی۔

ایک اعتراض کا جواب

بعض لوگ نافہمی سے یہ سوال کیا کرتے ہیں کہ جبکہ خُدا نے علام الغیب اور ہمہ دان (ہر بات سے واقف) ہے، تو ضرور اُس کو آدم کے گنہگار ہونے کا اُس کی تخلیق سے پہلے ہی علم ہو گا۔ اور جب یہ علم تھا تو اُس نے دیدہ و دانستہ اُس کو گناہ میں گرنے ہی کیوں دیا؟ اگر آدم گناہ میں نہ گرتا تو آج دُنیا کو گناہ اور اُس کے نتائج دُکھ و موت کے تلخ تجربے اُٹھانے نہ پڑتے۔ اس سوال کے جواب میں اس قدر عرض ہے کہ خُدا عالم الغیب ہے اور ساتھ ہی اُس کا علم لاتبدیل بھی ہے۔ خُدا کی صفتِ عالم الغیب ہے اور ساتھ ہی اُس کا علم لاتبدیل بھی ہے۔ خُدا کی صفتِ عالم الغیب کے متعلق بائبل کا بیان ملاحظہ ہو۔ "میں خُدا ہوں اور مجھ سا کوئی نہیں۔ جو ابتدا ہی سے انجام کی خبر دیتا ہوں۔ اور ایامِ قدیم سے وہ باتیں جو اب تک وقوع میں نہیں آئیں بتاتا ہوں" (یسعیاہ ۴۶:۹-۱۰؛ زبور ۱۳۹:۱۵-۱۶)۔ خُدا کو پورا علم تھا کہ آدم گناہ میں گرے گا۔ اب اگر وہ گناہ میں نہ گرتا تو خُدا کا علم تبدل پذیر پر ثابت ہوتا۔ یعنی اُس کے علم کے مطابق واقع نہ ہوتا۔ خُدا قدیم سے جانتا تھا کہ آدم پیدا ہو گا۔ میری نافرمانی کرے گا اور دُکھ اور موت کی سزا اُٹھائے گا۔ چونکہ خُدا کا علم لاتبدیل ہے اس لئے عین اُسی طرح تمام واقعات معرض ظہور میں آئے نہ کہ اُس کے علمِ قدیم کے خلاف اور ساتھ ہی یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ خُدا کو علم تو تھا کہ آدم گناہ میں گرے گا لیکن اُس کی مرضی یہ نہ تھی کہ آدم گنہگار ہو جائے۔ علم اور مرضی میں بہت فرق ہے۔ مثلاً ایک ڈاکٹر کو علم ہے کہ یہ مریض نصف گھنٹے کے بعد مر جائے گا۔ لیکن تو بھی اُس کی مرضی نہیں کہ وہ مر جائے۔ اگر اس پر یہ سوال بڑھایا جائے کہ خُدا کی مرضی کیوں پوری نہ ہوئی؟ تو اس کا جواب ہر ایک کے ذاتی تجربہ پر مبنی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ دُنیا خُدا کی مرضی کو پورا نہیں کر رہی۔ گناہ کا وجود خُدا کی مرضی کی مخالفت کا ثبوت ہے۔ اور یہ بات اِنسان کی کامل فعل مختاری پر دلالت کرتی ہے۔ مرضی خُدا کی ہے کہ گناہ نہ ہو۔ اور اس الٰہی مرضی کو پورا کرنا یا نہ کرنا اِنسان فاعل مختار کے ہاتھ میں

ہے۔خواہ پورا کرے یا نہ کرے۔اوراسی تناسب سے سزاو جزا بھی اُس کے لئے موجود ہے۔اگر خُدا جبری طور پر اپنی مرضی منوائے تو اِنسان کی فعلِ مختاری کہاں رہے گی؟اور نیکی وبدی اور جزاوسزاوغیرہ مہمل (بیکار، ترک کیاہوا) وبے معنی الفاظ ہوں گے اور نیکی وبدی ایسے مفہوم ہوں گے جن کا کوئی مصداق نہ ہو۔قسری افعال نیک یا بد نہیں ہوا کرتے بلکہ اختیاری افعال نیک یا بد کہلا سکتے ہیں۔مثلاً اگر کسی کتابت میں نقائص ہیں تو یہ قلم کا قصور نہیں۔ اور خوش خطی میں قلم کی نیکی نہیں۔کیونکہ قلم فاعل مُضطر (تکلیف میں مبتلا، بے بس) ہے۔کتابت کی اچھائی یا برائی کا ذمہ دار ہاتھ ہے جو کہ متحرک بالا رادہ اور فاعل مختار ہے۔ہم ایک مثال سے واضح کریں گے کہ حضرت ابوالبشر (آدم) نے اپنی آزاد مرضی واختیار سے خُدا کے حکم کو ٹھکرادیا۔فرض کرو کہ ایک مالک اپنے نوکر کو کچھ دام دیتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ باغ میں جاکر میرے لئے آم خرید لاؤ۔اور ساتھ ہی یہ تاکید کرتا ہے کہ اگر تُم خرید کر لاؤ گے تو ہم خوش ہوں گے۔اور اگر چوری کرکے لاؤ گے تو ہم ناراض ہوں گے۔اور تمہیں اپنے گھر سے نکال دیں گے۔اب حکم اُس کو مل چکا اور وہ خوب جان گیا کہ تعمیل میں میری خیر اور عدول حکمی میں میرا نقصان ہے۔وہ ایک باغ میں جاتا ہے اور باغبان سے آنکھ بچا کر چوری سے آم توڑتا اور مالک کے حضور لاتا ہے۔اب مالک اُس کی بد یانتی کے باعث اگر اُسے اپنے گھر سے نکال دے تو مالک کس صورت قابلِ الزام ہے؟اور نوکر کس صورت بے قصور ہے؟اگر اُس کو دام نہ دئے جاتے اور پھر اُس سے یہ توقع کی جاتی کہ وہ آم لائے تو البتہ مالک کا قصور ہوتا۔مگر اُس کو آم خریدنے کی قابلیت مالک کی طرف سے دی گئی تھی۔لیکن وہ اُس قابلیت (دام) کو کام میں نہ لایا۔اسی طرح خُدائے تعالیٰ نے آدم میں قابلیت نیکی اور فرمانبرداری کی پیدا کرکے پھر اُس سے حکم کی تعمیل طلب کی۔لیکن آدم نے اُسی نیک قابلیت کو غلط راہ پر استعمال کرکے خُدا کی مرضی کو ٹھکرادیا۔جب حکم مل چکا اور وہ توڑا گیا تو عدل پیدا ہوگیا۔اور وہی عدل قانون شِکن کو مُجرم ٹھہراتا ہے۔اس واسطے ابوالبشر وامّ اُلبشر (آدم وحوا) کو عدل الٰہی کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔اور گناہ کی سزادُکھ وموت اُن کے حصے میں آئی۔اگر حکم نہ دیا گیا ہوتا تو عدول حکمی (حکم توڑنا) بھی نہ ہوتی۔کیونکہ ”جہاں شریعت (حکم) نہیں وہاں عدول حکمی بھی نہیں“(رومیوں ۱۵:۴)۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر گناہ نہ ہوتا تو نیکی وپاکیزگی کی قدر وقیمت اِنسان نہ جان سکتا۔ضد کی حقیقت ضدِ ہی سے کھلتی ہے۔

اگر اب بھی مُعترض (اعتراض کرنے والے) کے پاس کوئی اعتراض ہے تو عرض ہے کہ اُس کو دُنیا میں کوئی امر ایسا نہ ملے گا جس پر نُکتہ چینی نہ ہوسکے۔مثلاً اگر کوئی مسیح کے اس قول پر غور کرے کہ ”جس کسی نے بُری خواہش سے کسی عورت پر نگاہ کی۔وہ اپنے دل میں اُس کے ساتھ زنا کرچکا“۔تو وہ یہ اعتراض کوسکتا ہے کہ اگر آنکھ کے ذریعے بد نظری کا گناہ صادر ہوتا ہے تو خُدا نے آنکھ کو بنایا ہی کس لئے؟اور اگر ہاتھ سے تلوار پکڑ کر کسی کا خُون کردیا تو کہ ہاتھ خُدا نے کیوں بنادیا جس سے خُون ہوجاتا ہے۔اسی قسم کے یہ سوال ہیں کہ خُدا نے شجر ممنوعہ کو اُگایا ہی کیوں۔یا اگر آدم نے گرنا ہی تھا تو اُسے پیدا ہی کیوں کیا؟

اگر ایک مکان کو جلتے ہوئے دیکھ کر اُس کے مکین یہ سوچنے بیٹھ جائیں کہ اس آتشزدگی کے اسباب ووجوہات کیا ہیں؟کیوں آگ لگی۔کس نے لگائی۔کس غرض سے لگائی۔کب لگائی۔کبھی پہلے کیوں نہ لگائی؟تو کون ہے جو اُن کی نادانی پر نہ ہنسے۔سب سے پہلے آگ کو بجھانے کی تدابیر کو عملی جامہ پہنایا جائے۔ورنہ اسباب وموجبات کی تلاش کرتے کرتے مکان جل کر خاک ہوجائے گا۔ہم ناظرین سے گذارش کرتے ہیں کہ ایسے توہمات باطلہ میں پڑکر حق سے روگردانی نہ کریں۔اس کا نتیجہ پہلے گمراہی اور پھر ہلاکت ہے۔

گناہ کیا ہے؟

”آدمی کا ضمیر خُداوند کا چراغ ہے۔جو اُس کے تمام اندرونی حال کو دریافت کرتا ہے“(امثال ۲۷:۲۰)۔

ایک تعریف گناہ کی یوں ہو سکتی ہے کہ جو کچھ اِنسان اپنے ضمیر کی روشنی میں بُرا سمجھتا ہے اُس پر عمل کرنا گناہ ہے۔ ضمیر خُدا نے اِنسان کو ایک عجیب حسِ بخشی ہے جو اُس کو فطرتاً جائز و ناجائز افعال میں امتیاز دکھاتی ہے۔ اور ساتھ ہی ناجائز افعال کے ارتکاب سے روکتی ہے۔ پھر بھی بعض کام ایسے ہیں جو بذاتہ بُرے نہیں اور جن کو اِنسان محض سوسائٹی کے زیر اثر بُرے سمجھنے لگتا ہے اُن پر بھی ضمیر ناجائز ہونے کا فتویٰ لگاتا ہے۔ یہ اس لئے ہوتا ہے کہ اکثر اوقات اِنسان بچپن سے ایک ہی قسم کی سوسائٹی کے زیر اثر تربیت پاتے پاتے، ایک ہی قسم کی باتوں کو سنتے سنتے ایک ہی طریق پر چلتے چلتے اور سوسائٹی کے پوشیدہ مگر قوی (مضبوط) اثرات کے ماتحت ایک ایسے مصنوعی طریق کا عادی ہو جاتا ہے کہ اُس کو وہ تمام باتیں جو اُس طریق کے برخلاف ہوں گناہ معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک بُت پرست اگر بت پرستی کر ترک کرنا چاہے تو اُس کا ضمیر اُس کے اس خیال کا ناجائز ٹھہراتا ہے۔ ایک سکھ اگر اپنے کیس (بال) کٹوانے کا ارادہ کرے تو اُس کا ضمیر اُس کے اس ارادہ پر ناجائز ہونے کا فتویٰ لگائے گا۔ تاہم درحقیقت یہ دونوں باتیں گناہ نہیں ہیں۔ اس لئے ہر وہ فعل جس کو ضمیر ناجائز ٹھہراتا ہے گناہ نہیں ہے۔ کیا وجہ ہے کہ ضمیر اپنے فرضِ منصبی کو درست طریق پر انجام نہیں دیتا؟ وجہ یہ ہے کہ گناہ نے اپنے زبردست عمل تخریبیہ سے جہاں عقل، دل اور دماغ کو بگاڑ دیا ہے۔ وہاں ضمیر پر بھی اثر انداز ہو کر اُس کی مقررہ رفتار میں فرق ڈال دیا ہے۔ ''عقل اور دل دونوں گناہ آلودہ ہیں'' (ططس ۱:۱۵)۔ ''عقل بگڑی ہوئی ہے'' (۲۔ تیمتھیس ۳:۸؛ ا۔ تیمتھیس ۶:۵)۔ تو بھی ضمیر کو قطعی معطل اور اذکار (ذکر کی جمع، بیانات) رفتہ سمجھنا درست نہیں۔ اُس کی رہنمائی پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ پر ہمیشہ نہیں۔ گو ضمیر نقصان سے خالی نہیں تو بھی وہ اپنے فرض منصبی کو بہت حد تک درستی سے انجام دیتا ہے۔ اصل مضمون کو چھوڑ کر ضمیر کی ماہیت پر بحث کرنا اس وقت مناسب نہیں۔ ورنہ ہم اس کی حقیقت پر مزید روشنی ڈالتے۔ پھر دوسری تعریف گناہ کی یہ ہے کہ ''جو کوئی گناہ کرتا ہے وہ شرع کی مخالفت کرتا ہے۔ اور گناہ شرع کی مخالفت ہی ہے'' (ا۔ یوحنا ۳:۴)۔ جس طرح گناہ حضرت ابوالبشر سے وراثتاً تمام نسل اِنسانی میں چلا آیا (رومیوں ۵:۱۲) اُسی طرح وہ اخلاقی شرع جو خُدا نے اُس کی پیدائش کے وقت بخشی تھی کسی نہ کسی صورت میں وراثتاً تمام بنی نوع اِنسان میں منتقل ہوتی آئی ہے۔ اور وہ شریعت کسی تحریری صورت میں نہ تھی بلکہ آدم کے دل پر مرتسم (مہر لگایا گیا) کی گئی تھی۔ چنانچہ اُس کا کچھ نہ کچھ بقیہ تمام اقوام عالم کے دل میں فطرتی طور پر موجود ہے۔ اور اس ابتدائی باطنی شریعت کا بیان کلامِ مقدس میں یوں ہے۔ ''اس لئے کہ جب وہ قومیں جو شریعت (ظاہری الہامی شریعت) نہ رکھنے کے وہ اپنے لئے خود ایک شریعت ہیں۔ چنانچہ وہ شریعت (باطنی شریعت) کی باتیں اپنے دلوں پر لکھی ہوئی دکھاتی ہیں'' (رومیوں ۱۴:۲-۱۵)۔ الہامی شریعت اُس ابتدائی باطنی شریعت کا اعادہ (دوہرانا) ہے۔ پس شرع خواہ باطنی ہو یا ظاہری اُس کا ہر تجاوز گناہ ہے۔ اور گناہ کے چار اقسام ہیں۔

- **سیاسی گناہ۔** یعنی جو حکومت وقت کے خلاف عمل میں آئے۔ جیسے کوئی شخص جعلی سکے بنائے۔ اشیائے ممنوعہ کی چھپ کر تجارت کرے۔ ان صورتوں میں وہ حکومت کا مجرم ہے۔ اور سیاسی ملزم کا جب تک سراغ نہ ملے وہ سزا سے بچا رہتا ہے۔ مُجرم ثابت ہونے پر اُس کو سزا دی جاتی ہے۔
- **سوسائٹی کا گناہ۔** یعنی جو کسی سوسائٹی کے مقررہ قوانین وضوابط کے خلاف کیا جائے۔ جیسے کیس (لمبے بال) رکھنا سکھ سوسائٹی کا قانون ہے اگر کوئی سکھ ہوتے ہوئے بال کٹوا دے تو وہ سوسائٹی کا مجرم ہو گا۔ اور سوسائٹی سے خارج کیا جائے گا۔ مگر توبہ کر کے بحال ہو سکتا ہے۔
- **فطرۃ کا گناہ۔** یعنی قوانین طبعیہ کی خلاف ورزی۔ جیسے کوئی شخص قانون کششِ زمین کے خلاف عمل کرنے سے بلندی سے گر کر مر جائے۔ یا آگ میں ہاتھ ڈالنے سے جل جائے۔ یہ قوانین اپنے تجاوز کے ساتھ ہی سزا دیتے ہیں۔ توبہ کرنے یا معافی مانگنے کا ان پر مطلق اثر نہیں ہوتا۔

❖ **خُدا کا گناہ**۔ یعنی خُدا کی طبیعت کے خلاف عمل کرنا۔ جیسے اُس کی ہستی سے منکر ہونا۔ بُت پرستی۔ کفر والحاد کا ارتکاب۔ الٰہی گناہ باقی سب گناہوں پر حاوی ہے۔ اور اُس کی سزا سب سے زیادہ ہولناک ہے۔ لیکن شرع الٰہی کے تجاوز کے نتائج نے الفور ظہور میں نہیں آتے۔ کیونکہ خُدا رحیم و مہربان ہے۔ اور ہر گنہگار کو موقع دیتا ہے کہ وہ اپنی بدکرداری سے تائب ہو۔ اس لئے واعظ کہتا ہے کہ "چونکہ بُرے کام پر سزا کا حکم فوراً نہیں دیا جاتا۔ اس لئے بنی آدم کا دل اُن میں بدی پر بہ شدت مائل ہے" (واعظ ۸:۱۱)۔ لیکن اِنسان اپنی کوتاہ اندیشی (تنگ نظری) سے خُدا کے صبر و تحمل سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر موردِ عتابِ الٰہی ٹھہرتا ہے۔ مندرجہ بالا تین قسم کے گناہوں کی سزائیں جسمانی اور ایں جہانی ہوتی ہیں۔ مگر خُدا کے خلاف گناہ کرنے کی سزا ایک تو جسمانی و روحانی دونوں طرح کی ہوگی دوسرے اُس نے عدالت کا ایک خاص دن ٹھہرایا ہے اگرچہ وہ جسمانی طور پر بدکاروں کو اس جہان میں بھی عارضی سزائیں دیتا ہے۔

مسیحیت محض عدم نیکی و عدم پاکیزگی کو گناہ نہیں کہتی۔ جیسا کہ غیر اقوام سمجھتی ہیں۔ بلکہ از روئے انجیل گناہ ایک امر وجودی اور نفس الامری حقیقت ہے۔ نہ کہ اعتباری محض وعدمی شے۔ محض نیکی کی نفی گناہ نہیں ہے۔ بلکہ نیکی کی نفی اور گناہ کا اثبات دونوں باتیں مل کر گناہ ہیں۔ گناہ منفی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ اثباتی غیر مسیحی لوگ بھاری غلطی میں مبتلا ہیں کہ وہ محض عدم نیکی کو گناہ سمجھے ہوئے ہیں۔ اس لئے وہ چند ظاہری نیکیاں کر کے سمجھتے ہیں کہ اب ہم نیک ہیں۔ لیکن مسیحیت کا خیال یہ ہے کہ ممکن کہ ایک آدمی نیکی کرے مگر خود نیک نہ ہو۔ نیکی کا فقدان گناہ کے وجود کی دلیل نہیں۔ بلکہ گناہ کا وجود سبب اور عدم نیکی اُس کا نتیجہ ہے۔ گناہ نے اِنسان کی فطرت پر قبضہ جما کر نیکی کو اُس سے خارج کر دیا ہے۔ اب نیکی و پاکیزگی کا تسلط اس صورت میں ممکن ہے کہ پہلے گناہ فطرت اِنسانی سے قطعی خارج کر دیا جائے۔ کیونکہ جب تک ایک بھرے ہوئے برتن میں سے پہلی چیز نکال نہ دی جائے تب تک دوسری اُس میں سما نہیں سکتی۔

اِنسان کی اصل فطرت کے بگڑ جانے کا نام گناہ ہے۔ خُدا نے اِنسان کو اس لئے پیدا نہ کیا تھا کہ وہ اُس سے برگشتہ ہو کر اُس کی مرضی کے خلاف کام کیا کرے، بلکہ اس لئے کہ وہ خُدا کے ساتھ پوری مطابقت و یگانگت رکھے اور اُس کی مرضی کے مطابق چلے۔ چونکہ اس وقت اِنسان سراسر خُدا کی مرضی کے خلاف چل رہا ہے۔ لہٰذا وہ اپنی اصلی فطرت پر قائم نہیں ہے، بس یہی گناہ ہے گناہ وہ ہے جو اِنسان کے تمام افعال واقوال کو ملوث کر دیتا ہے۔ اور بدافعال کا صدور وارتکاب اِنسان کے اعماقِ طبع (طبیعت کی گہرائی) میں ایک ایسے مکروہ چشمے کا آئینہ دار ہے جس میں ڈوب ڈوب کر وہ افعال صادر ہوتے ہیں۔ وہ افعال اگر ظاہر نہ بھی ہوں تو بھی اُس گندے چشمہ کے وجود کا انکار محال ہے۔ صرف ظاہری افعال جیسے خون کرنا، چوری کرنا اور گالی بکنا وغیرہ ہی گناہ نہیں ہیں بلکہ یہ تو گناہ کا عملی ظہور میں نہ بھی آئیں (گو محال) تو بھی ہم کسی اِنسان کو پاکِ مطلق نہیں کہہ سکتے۔ مثلاً اگر سانپ کسی کو نہ ڈسے تو بھی اُس کے زہریلا ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ خواہ ڈسے خواہ نہ ڈسے بہر حال زہر اُس کے اندر موجود ہے۔ اسی طرح اِنسان سے خواہ کسی فعل بد کا ارتکاب نہ بھی ہو تو بھی گناہ اُس کی طبیعت میں موجود ہوتا ہے۔ پس شرع الٰہی کا ہر چھوٹے سے چھوٹا تجاوز گناہ ہے۔ "اور شریعت اِنسان کو گناہ سے آزاد نہیں کر سکتی۔ بلکہ وہ تو صرف گناہ کی پہچان ہی بخشتی ہے۔ شریعت کے وسیلے تو گناہ کی پہچان ہی ہوتی ہے" (رومیوں ۳:۲۰)۔ جس طرح تھرمامیٹر صرف یہ ظاہر کرتا ہے کہ بخار کتنے درجے کا ہے اور اُس بخار کو دور نہیں کر سکتا۔ اسی طرح شریعت گناہ کے وجود کا علم بخشتی ہے۔ اُس سے آزاد نہیں کر سکتی۔

بہت سے لوگ جن کی فطرت بالکل مسخ اور ضمیر مردہ ہو چکا ہے گناہ کے وجود کا سرے سے انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ گناہ ایک بدیہی (ظاہر) حقیقت ہے۔ ذرا غور کرو کہ لوگ مکانوں اور صندوقوں کو قفل کیوں لگاتے ہیں؟ سرکاری خزانے پر دن رات پہرے کیوں لگے رہتے ہیں؟ روپیہ بنکوں میں کس لئے جمع کیا جاتا ہے؟ اس لئے کہ دُنیا میں چور موجود ہیں۔ کیا چوری کرنا نیکی ہے؟ کیا پولیس کا انتظام۔ عدالتیں، ہتھکڑیاں، جیلیں، پھانسیاں اور شکنجے راست

بازوں کو سزائیں دینے کے لئے بنائے گئے ہیں۔ بلکہ صرف مجرموں کے لئے تمام ممالک واقوام عالم میں حکومتوں اور تعزیری قوانین (سزا کے متعلق قوانین) کاوجود زبردست ثبوت اس بات کا ہے کہ گناہ دُنیا میں ہمہ گیر طور پر موجود ہے۔اور حکومت اُس کی روک تھام کا ایک جبری وظاہری انتظام ہے۔ تاکہ دنیا میں اندھیر نہ مچ جائے اور دنیا میں کوئی زبان کتاب اور کوئی لغت ایسی نہ ملے گی کہ جس میں گناہ کے مترادف الفاظ موجود نہ ہوں۔ پس گناہ ضمیر کی مخالفت ہے۔ شرع الٰہی کی مخالفت ہے۔اِنسان کی خودی کا بُرا ظہور ہے۔ایک نفس الامری (وہ حالات واقعی جنہیں دوست دشمن سب نے مانا ہے) حقیقت ہے۔اِنسان کی اصلی فطرت کے بگاڑ کا نام ہے۔اِنسان کی طبیعت کو عارض (لاحق ہونا، بیماری) ہے۔اور ایک روحانی مرض ہے۔ پس اب ''اگر ہم کہیں کہ ہم بے گناہ ہیں تو اپنے آپ کو فریب دیتے ہیں۔اور ہم میں سچائی نہیں'' (یوحنا۸:۱)۔

گناہ کی علت

جیسے پیشتر اس کے پانی پیا جائے پیاس ہوتی ہے۔ پیشتر اس کے کہ مٹھائی کھائی جائے کھانے کی خواہش ہوتی ہے۔اسی طرح پیشتر اس کے کہ خون کیا جائے قتل کی خواہش ہوتی ہے۔ پیشتر اس کے کہ چوری کی جائے چوری کی خواہش ہوتی ہے۔ پیشتر اس کے کہ زنا کیا جائے زنا کی خواہش موجود ہوتی ہے۔ تو ثابت ہوا کہ ہر فعل کے ارتکاب سے پیشتر ہی اُس فعل کی خواہش اِنسان کے دل میں موجود ہوتی ہے۔اور خواہش ہر فعل پر مقدم ٹھہرتی ہے۔ لہٰذا خواہش علت اور فعل یعنی خواہش کا عملی ظہور معلول ہے۔ پس گناہ کی علت بُری خواہش ہے۔ ''تاکہ اُن کے وسیلے سے تم اُس خرابی سے چھوٹ کر جو دُنیا میں بُری خواہش کے سبب سے ہے۔۔۔'' وغیرہ (۲۔پطرس ۱:۴)۔ ''ہر شخص اپنی ہی خواہشوں میں کھنچ کر اور پھنس کر آزمایا جاتا ہے۔ پھر خواہش حاملہ ہو کر گناہ کو جنتی ہے'' (یعقوب ۱۴:۱-۱۵)۔اور یہی بُری خواہش ہے جو حضرت ابوالبشر سے وراثتاً اُس کی تمام نسل کو ملی ہے۔اسی واسطے خُداوند مسیح نے گناہ کی علت (بُری خواہش) کو روکنے پر زور دیا اور صرف نیت کی بُرائی کو ہی گناہ ٹھہرایا۔ آپ نے فرمایا۔ ''میں تُم سے یہ کہتا ہوں کہ جس کسی نے بُری خواہش سے کسی عورت پر نگاہ کی وہ اپنے دل میں اُس کے ساتھ زنا کر چکا'' (متی ۵:۲۷)۔اور یہ بُری خواہش اِنسان کی فطرۃ اوّلہ نہیں بلکہ فطرۃ ثانیہ ہے۔اور اس کے اعماقِ قلب (دل کی گہرائی) میں ایک گناہ کا منبع ہے جس میں سے افعال بد پھوٹ پھوٹ کر صادر ہوتے اور فضائے عالم کو متعفن (بدبودار کرنے والا) کرتے ہیں۔ بدافعال کا ظہور گویا اعماقِ قلب کا اعلان ہے۔اور خواہش بد کوئی اکتسابی (ذاتی محنت سے حاصل کرنا) شئے نہیں بلکہ موروثی (وراثت میں ملی ہوئی) ہے۔اسی واسطے اِنسانی تدابیر سے اس کا ازالہ (مٹانا) محال ہے۔ مذہبی تعلیم، وعظ ونصیحت اور حکومت کی تعزیری تجاویز (سزا دینے والی تجویز) وعوامل صرف بری خواہش کے معلولات (بدافعال) یعنی چوری، زنا، حق تلفی، ظلم، لڑائی فساد اور خون ریزی وغیرہ کو عارضی طور پر روک سکتے ہیں، لیکن ان کی علت (بری خواہش) اندفاع وازالہ میں قطعی قاصر ہیں۔ جب تک اِنسان کی نیت بد نہ تب تک ارادہ بُرا نہیں ہو سکتا۔اور جب تک ارادہ بُرا نہ ہو فعل بد کا صدور محال ہے۔ اگر بدون (بغیر) ارادہ بد کے افعال بد کا صدور ممکن مانا جائے تو وہ افعال اضطراری (بے اختیاری، بے قراری) ٹھہریں گے نہ کہ اختیاری اور یہ باطل ہے۔ پس فعل بد کے صدور کی علت بُرا ارادہ اور برے ارادے کی علت بُری خواہش ہے۔ اِنسان کی خواہش وارادہ گناہ سے اس قدر مانوس (پسند) ہو چکے اور طبیعت گناہ کی طرف اس درجہ مائل ہو چکی ہے کہ جب تک اُس کی خواہش، میلان طبع (طبیعت کا رجحان) اور ارادہ کو کسی فوق العادت طریق سے تبدیل نہ کر دیا جائے حقیقی نیکی اُس سے صادر ہو ہی نہیں سکتی۔ اگر کوئی نیکی صادر بھی ہو گی تو وہ گندی دھجی کی مانند ہو گی (یسعیاہ ۶:۶۴)۔ گناہ اِنسان کی فطرت میں اس قدر رچ گیا ہے کہ یرمیاہ نبی اُسے اِنسان کی ایک فطرتی ناقابلیت سے تشبیہ دیتا ہے (یرمیاہ ۲۳:۱۳)۔ فخر بانہ میلانات (فخر کرنے والے رجحانات) ومذموم (خراب) رجحانات گناہ آلودہ طبیعت کے لازمی نتائج ہیں۔

اکثر لوگ گناہ کی حقیقت کو نہیں سمجھتے۔ وہ گناہ صرف اُس کو سمجھتے ہیں جو ظہور میں آئے ۔ لیکن نیت کی سفلیت (پستی) کو گناہ نہیں سمجھتے۔ حالانکہ نیت وخواہش کی بدی تمام جرائم وذمائم (برائی یا مذمت کی صورت ہونا) کا مرکز ہے۔ ذرا سوچئے کہ جب ایک آدمی دوسرے آدمی کی نیت کی بُرائی سے کسی صورت آگاہ ہو جاتا ہے۔ تو باوجود اُس سے کوئی فعل بد سرزد ہونے کے اُس سے نفرت کرتا ہے۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نیت کی برائی واقعی نفرت کا موجب ہے۔ اور اگر انسان ایک دوسرے کے باطنی خیالات کے جان لینے پر قادر ہوتا تو ضرور ایک دوسرے سے نفرت کرتا۔ اب دیکھئے کہ خُدا ہمارے باطن سے اس قدر آگاہ ہے جس قدر ہمارے ظاہر سے۔ ''میں تمہارے دل کے خیالات کو جانتا ہوں'' (حزقی ایل ۱۱: ۵؛ ۱۔ کرنتھیوں ۵: ۴)۔ تو بتائے کہ ہماری بُری نیت اور بُری خواہش سے وہ کیوں نفرت نہ کرے گا؟ اور بُری خواہش (علت گناہ) کا مرکز دل ہے۔ اس لئے کلام میں آیا ہے کہ دل سب چیزوں سے زیادہ حیلہ باز اور لاعلاج ہے'' (یرمیاہ ۱۷: ۹)۔ ''بنی آدم کا دل بھی شرارت سے بھرا ہے'' (واعظ ۹:۳؛ ۸: ۱۱)۔ اور خُداوند مسیح نے فرمایا۔ ''جو باتیں منہ سے نکلتی ہیں۔ وہ دل سے نکلتی ہیں۔ اور وہی آدمی کو ناپاک کرتی ہیں۔ کیونکہ بُرے خیال، خون ریزیاں، زناکاریاں، حرام کاریاں، چوریاں، جھوٹی گواہیاں، بدگوئیاں دل ہی سے نکلتی ہیں۔ یہی باتیں ہیں جو آدمی کو ناپاک کرتی ہیں'' (متی ۱۸: ۱۵—۲۰)۔ ''اِنسان کے دل کا خیال لڑکپن سے بُرا ہے'' (پیدائش ۲۱: ۸)۔ اس لئے اِنسان کے لئے ہدایت الٰہی یہ ہے کہ ''اپنے دل کی خوب حفاظت کر۔ کیونکہ زندگی کا سرچشمہ وہی ہے'' (امثال ۲۳: ۴)۔ اور داؤد نبی اس گناہ آلود دِل کی تبدیلی کے لئے خُدا سے یوں التجا کرتا ہے۔ ''اے خُدا میرے اندر پاک دل پیدا کر۔ اور میرے باطن میں از سر نو مستقیم رُوح ڈال'' (زبور ۱۰: ۵۱)۔ دیگر مذاہب صرف عملی گناہ پر زور دیتے اور بدخیالی وبداندیشی کو گناہ نہیں سمجھتے۔ لیکن میسیحیت کی فضیلت وامتیاز اسی سے ظاہر ہے کہ وہ اِنسان کی نیت کی بُرائی اور خواہش وارادہ کی نجاست وخباثت پر گناہ ہونے کا فتویٰ دیتی اور بدخیالی وبداندیشی کو شرع الٰہی کا عدُول ٹھہرا کر فعل سے زیادہ ارادہ فعل کو معیوب ٹھہراتی ہے۔ کیونکہ خُدا باطن کی صفائی پسند کرتا ہے نہ کہ ظاہری کی۔ نادان لوگ عملی گناہوں کے محض دوسروں کی نظر سے بچ کر پوشیدہ طور پر مرتکب ہوتے اور چند ظاہر داری کی نیکیاں کرکے خود کو پاک ونیک سمجھنے لگتے ہیں اور دل کو یونہی تسلی دے لیتے ہیں کہ ہم گنہگار نہیں ہیں۔ کلامِ مقدس ایسوں کے متعلق یوں فرماتا ہے۔ ''ایک پشت ایسی ہے جو اپنی نگاہ میں پاک ہے۔ لیکن اُس کی گندگی اُس سے دھوئی نہیں گئی'' (امثال ۱۲: ۳۰)۔ ''اِنسان کی ہر ایک روش اُس کی نظر میں راست ہے۔ پر خُداوند دلوں کو جانچتا ہے'' (امثال ۲: ۲۱:۹؛ ۲۰؛ واعظ ۲۰: ۷)۔ جب مصدر ہی ناپاک ہو تو اُس سے نیکی وپاکی کا صدور کیسے ممکن ہے؟ (یعقوب ۱۲: ۳)۔ پس گناہ کی علت بُری خواہش ہے اور بغیر علت کی تبدیلی کے معلول کی تبدیلی محال ہے۔ جب تک اِنسان کی بُری خواہش وبُری طبیعت نئے سرے سے نیک اور پاک نہ ہو جائے تب تک حقیقی نیکی اُس سے صادر ہی نہیں ہو سکتی (متی ۱۸: ۷)۔

گناہ ہمہ گیر ہے

گناہ کی ہمہ گیر کے متعلق عقلی دلائل:۔

۱۔ دُنیا میں کوئی ایسی کتاب، لغت یا زبان نہیں ہے۔ جس میں گناہ کے مترادف الفاظ موجود نہ ہوں۔ ہم اس مضمون کے آغاز ہی میں اس کا ذکر کر چکے ہیں کہ ہر زبان میں ایسے الفاظ بکثرت موجود ہیں جن سے گناہ کا ہمہ گیر ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ کوئی لفظ تب تک ایجاد نہیں ہوتا جب تک خارج میں اُس کا کوئی مدلول (دلالت کیا گیا، بتایا گیا) نہ پایا جائے۔ واقعات پیش آمدہ کے مطابق اُن کے اظہار کے لئے الفاظ بنائے جاتے ہیں۔ مثلاً لفظ عداوت کبھی ایجاد نہ ہوتا اگر دُنیا میں عداوت ودشمنی نہ ہوتی۔ لفظ غم کبھی ایجاد نہ ہوتا اگر غم کوئی شئے یا کیفیت نہ ہوتی۔ اگر دُنیا میں کبھی کوئی بیماری

ہی نہ ہوتی توالفاظ بیماری، مرض، علالت (بیماری) اور حکیم وطبیب اور نُسخہ ودواوغیرہ ہر گزایجاد نہ ہوتے۔اور سرسام (ایک بیماری جس سے دماغ میں ورم آجاتاہے)، بُرص (کوڑھ)، طاعون، ہیضہ، نمونیہ اور بُخار وغیرہ الفاظ کا وجود نابود ہوتا۔اسی طرح گناہ کے مترادف یااُس کی مختلف فروعات کے اظہار کے لئے دُنیا کی ہر زبان میں بکثرت الفاظ موجود ہیں۔اگر گناہ کوئی ہمہ گیر شئے نہ ہوتا تواُس کے مفہوم کے اظہار کے لئے ہر ملک کی زبان میں کثیر التعداد الفاظ ہر گزنہ ہوتے۔لہٰذا گناہ ایک نفس الامری (وہ حالات واقعی جنہیں دوست دشمن سب نے مانا ہے) حقیقت ہے اور ہمہ گیر ہے۔

۲۔ ہر ملک اور ہر قوم میں کسی نہ کسی صورت میں حکومت اور تعزیری انتظام (سزا کا انتظام) کا وجود گناہ کی ہمہ گیری کا زبردست ثبوت ہے۔ عدالتیں، حکومتیں اور تعزیرات گناہ (گناہ کی سزائیں) کو قوتِ بازو سے روکنے کے لئے معرضِ وجود میں آئیں۔چونکہ یہ انتظام ہمہ گیر ہے لہٰذا گناہ بھی ہمہ گیر ہے۔

۳۔ گناہ ایک متوارث شئے ہے۔یعنی جس طرح صحتِ وسقم۔ضعف وقوت، شکل وشباہت اور عادات وخصائل اور امزجہ وطبائع قانون ارثی کے مطابق والدین سے بچوں میں منتقل ہوتے ہیں۔اُسی طرح گناہ کی علت (بری خواہش) بھی ارثی طور پر اولاد میں منتقل ہوتی ہے۔اور طبیعتِ موروثی کا ہمہ گیری ہونا مسلم ہے۔لہٰذا گناہ ہمہ گیر ہے۔

۴۔ تجربہ نوعی (بنی آدم) نے گناہ کی ہمہ گیری کو خوب ثابت کردیاہے۔گناہ کا وجود ایک بدیہی (ظاہر) حقیقت ہے۔اور کوئی ملک کوئی شئے کوئی قوم، کوئی جماعت، کوئی خاندان اور کوئی فردِ واحد بھی اس سے آزاد نہیں اس حقیقت کا انکار محال ہے کیونکہ یہ واقعات ومشاہدات پر مبنی ہے۔

۵۔ ہندوازم واسلام جو اس ملک کے بڑے مذہب مانے جاتے ہیں ان کے مسلمات سے گناہ کی ہمہ گیری ثابت ہے۔ہندو مذہب میں عقیدہ تناسخ (ایک صورت سے دوسری صورت اختیار کرنا، روح کا ایک قالب سے دوسرے قالب میں جانا) مسلم ہے اور ازروئے تناسخ تمام جیو بندھ میں آتے ہیں۔اور اُن کا بندھ میں آنا کسی گذشتہ جرم کے بغیر ممکن نہیں۔لہذا اُن کے مسلمات کی رُو سے تمام جیو گنہگار ہیں۔پھر اسلامی مسلمات کی رُو سے بھی گناہ کی ہمہ گیری مسلم الثبوت ہے۔قُرآن کی (سورہ نحل) میں مرقوم ہے۔کہ "اگر اللہ انسانوں سے اُن ظلم کی بازپُرس کرے تو زمین پر ایک متحرک کو بھی نہ چھوڑے"۔پھر حدیث صحیح بخاری وصحیح مسلم میں بھی اسی مطلب کا مضمون ہے جس کا مطلب یہ ہے۔"کہ تُم میں سے کسی کا عمل اُس کو ہر گز جنت میں داخل نہ کرے گا۔توآپ کے ساتھیوں نے پوچھا کہ اَے رسول اللہ کیا آپ کو بھی آپ کو عمل جنت میں داخل نہ کرے گا؟آحضرت نے فرمایا۔کہ مجھ کو بھی میرا عمل جنت میں داخل نہ کرے گا۔خُدا کی رحمت وفضل کے سوا کوئی چارہ نہیں"۔پس اسلامی متعقدات سے بھی گناہ کی ہمہ گیری ثابت ہے۔

گناہ کی ہمہ گیری کے متعلق بائبل مقدس کی منقولی دلائل۔

۶۔ بائبل سے گناہ کی ہمہ گیری کا ثبوت ملتاہے۔کلام میں آیاہے کہ "گناہ کی مزدوری موت ہے"(رومیوں ۶:۲۳)۔چونکہ تمام اِنسان مرتے ہیں۔لہٰذا سب گنہگار ہیں گناہ سبب ہے اور موت اُس کا نتیجہ ہے۔اگر گناہ نہ ہوتا تو موت بھی نہ ہوتی۔جبکہ گناہ کا نتیجہ (موت) ہمہ گیری ہے۔توخود سبب گناہ کیوں ہمہ گیر نہ ہوگا؟اور کوئی نتیجہ بغیر سبب کے نہیں ہوتا۔گناہ کی ہمہ گیری کے ثبوت میں چند مقامات بائبل مقدس سے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

۱۔ "جس طرح پانی میں چہرہ چہرے سے مشابہ ہے۔اُسی طرح آدمی کا دل آدمی سے"(امثال ۲۷:۱۹)۔

۲۔ "اِنسان ہے کیا کہ وہ پاک ہو؟اور وہ جو عورت سے پیدا ہوا کیاہے کہ صادق ہو"(ایوب ۱۵:۱۴)۔

۳۔ ''خُداوند نے آسمان پر سے بنی آدم پر نگاہ کی تاکہ دیکھے کہ کوئی دانشمند کوئی خُدا کا طالب ہے یا نہیں۔ وہ سب کے سب گمراہ ہوئے وہ باہم نجس ہو گئے۔ کوئی نیکوکار نہیں۔ ایک بھی نہیں''(زبور ۲:۱۵-۳:۲؛۳-۵۳:۳)۔

۴۔ ''اور اپنے بندے کو عدالت میں نہ لا۔ کیونکہ تیری نظر میں کوئی آدمی راستباز نہیں ٹھہر سکتا''(زبور ۲:۱۴۳)۔

۵۔ ''کون کہہ سکتا ہے کہ میں نے اپنے دل کو صاف کر لیا ہے۔ اور میں اپنے گناہ سے پاک ہو گیا ہوں''(امثال ۹:۲۰)۔

۶۔ ''کیونکہ زمین پر کوئی ایسا راستباز اِنسان نہیں کہ نیکی ہی کرے اور خطا نہ کرے''(واعظ ۲۰:۷)۔

۷۔ قول المسیح۔ ''کوئی نیک نہیں مگر ایک یعنی خُدا''(لوقا ۱۹:۱۸)۔

۸۔ ''اس لئے کہ سب نے گناہ کی اور خُدا کے جلال سے محروم ہیں''(رومیوں ۲۳:۳؛۱۲:۵)۔

۹۔ ''اگر ہم کہیں کہ ہم بے گناہ ہیں تو اپنے آپ کو فریب دیتے ہیں۔ اور ہم میں سچائی نہیں''(۱۔ یوحنا ۸:۱)۔

ہم نے گناہ کی ہمہ گیری کو معقولات و منقولات سے پایہ ثبوت تک پہنچا دیا۔ اب ہر شخص اپنے گریبان میں منہ ڈال کر اپنی باطنی حالت کا امتحان کرے۔ اور اپنے آپ کو خوب جانچ لے کہ واقعی وہ گنہگار ہے یا نہیں۔ اگر کوئی اب بھی اپنے آپ کو بکلی پاک و راستباز سمجھے تو وہ جان لے کہ گناہ کی شدید تیرگی (تاریکی) نے اُس کے ضمیر کو جو اُس کے باطن کے لئے بمنزلہ ایک چراغ کے ہے (امثال ۲۷:۲۰) یہاں تک مدھم کر دیا ہے کہ وہ اپنے باطن کی گناہ آلودہ تاریک حالت کو جان نہیں سکتا۔ اور ایسا شخص قابلِ رحم ہے۔

کیا گناہ اِنسان کی اصلی فطرت ہے؟

اگرچہ پیچھے کئی جگہ ثابت کر آئے کہ گناہ اِنسان کی نیچر کا خاصہ ذاتی نہیں ہے۔ پر شائد کوئی اور زیادہ وضاحت سے اس امر کا ثبوت چاہئے۔ لہٰذا ہم چند دلائل سے اس خیال کی کہ گناہ جُزوِ انسانیت ہے تردید کریں گے۔

۱۔ جو بات کسی ذی حیات جنس کی ذات کا خاصہ نہیں وہ اُس کے لئے نقصان دہ اور مضرت رساں ثابت ہو گی۔ اب دیکھئے کہ صحت جسمانی اِنسان کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ اس سے اُس کو کوئی تکلیف یا نقصان نہیں ہوتا۔ لیکن مرض جزوِ انسانیت نہیں بلکہ ایک اور چیز ہے۔ اس لئے اُس سے دُکھ اور نقصان ہوتا ہے۔ سانپ کا زہر سانپ کے لئے مضرتِ رساں نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ اُس کے خاصہ ذاتی ہے۔ سانپ کسی کو ڈس کر خوش ہوتا ہے۔ ہم کانوں سے کچھ سُن کر خوش ہوتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی بہرہ ہو جائے تو وہ بہت ناخوش اور رنجیدہ ہوتا ہے۔ کیونکہ بہرہ پن فطری خاصہ نہیں ہے۔ اسی طرح گناہ سے اِنسان کو دُکھ اور رنج محسوس ہوتا ہے۔ اس لئے وہ فطرتِ اِنسانی کا خاصہ ذاتی نہیں ہے۔

۲۔ چونکہ گناہ کرنے کے بعد اِنسان کو ایک تو رنج ہوتا ہے۔ اور دوسرے اُس فعل ناکردنی پر پچھتانا پڑتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ گناہ اِنسانی فطرت کا خاصہ نہیں ہے۔ پطرس نے مسیح کا انکار کیا اور پچھتا کر زار زار رویا۔ یہوداہ اسکریوطی نے مسیح کے ساتھ غداری کی اور اُس کا غم اور پچھتاوا خودکشی پر منتج (نتیجہ) ہوا۔ پس اگر گناہ ذاتی خاصہ ہوتا تو اُس سے خوشی ہی حاصل ہوتی نہ کہ رنج اور پچھتاوا۔ اگر کوئی خوشی ہوتی بھی ہے تو بہت تھوڑے عرصہ کی۔ جیسے شراب پینے سے ایک آدھ گھنٹے کے لئے سُرور ہوتا ہے۔ لیکن بڑے سے بڑا گنہگار بھی کسی نہ کسی وقت اپنے گناہ پر ضرور نادم ہوتا اور پچھتاتا ہے۔ اگر کوئی کہے کہ چور کو چوری کرنے سے ہمیشہ خوشی ہوتی ہے اور پچھتاوا کبھی نہیں ہوتا۔ کیونکہ چوری سے جو مال و دولت ہاتھ آتا ہے وہ اُس کی طبیعت پر رنج و پچھتاوے کو غالب آنے نہیں دیتا، تو اس کے جواب میں اس قدر عرض ہے کہ اگر خود چور کے گھر میں چوری ہو جائے تو کیا پھر بھی اُسے خوشی حاصل

ہو گی؟ ہر گز نہیں۔ اُس کو ضرور رنج اور افسوس ہو گا۔ پس اس سے ثابت ہوتا ہے کہ چوری کرنا گناہ ہے۔ اور گناہ فطرتِ اِنسانی کا خاصہ نہیں بلکہ غیر شئے ہے۔ لہٰذا اس سے آزاد ہونا اصلی فطرت کا تقاضا ہے۔

۳۔ گناہ تمام افرادِ عالم میں یکساں نہیں ہے۔ اس لئے طبیعت اوّلہ نہیں بلکہ ثانیہ ہے۔ کسی میں ایک گناہ ہے اور دوسرے میں وہ نہیں کوئی اور ہے۔ ایک شخص خونی تو ہے مگر غُرباء کے ساتھ بہت ہمدردی کرتا ہے۔ ایک آدمی زانی تو ہے مگر خونی نہیں ہے۔ ایک آدمی لالچی تو ہے مگر سچ بولنے میں مشہور ہے۔ ایک آدمی بُت پرست تو ہے مگر جھوٹ، فریب، خون ریزی اور ظلم وغیرہ سے نفرت کرتا ہے۔ جس طرح سانس لینا۔ سُننا، سونگھنا، سونا، جاگنا اور کھانا پینا وغیرہ ذاتی خصائص تمام افراد عالم میں یکساں ہیں، اُسی طرح اگر گناہ اِنسان کی ذاتیات کا جُز ہوتا تو تمام نوعِ اِنسانی میں یکساں ہوتا۔ یعنی اگر ایک شخص چوری کرتا تو تمام دُنیا چوری کرتی۔ اگر ایک شخص جھوٹ بولتا تو ضرور تھا کہ دُنیا کے تمام لوگ جھوٹ بولا کرتے۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ لہٰذا گناہ جُزوِ اِنسانیت نہیں ہے۔

۴۔ خُدائے قدوس سے ناپاک طبیعت کے معلول (وہ شے جس کا کوئی باعث یا سبب ہو، اصطلاح منطق میں نتیجہ، پھل،) کا صادر ہونا قطعی ممتنع (منع کرنے والا) و محال ہے۔ کیونکہ قدوسیت اور ناپاکی باہم گر (ایک دوسرے کے ساتھ۔ آپس میں) نقیضین (ضد) ہیں۔ اور ایک نقیض دوسرے نقیض کی علت نہیں ہو سکتا۔ جیسے آفتاب میں سے تاریکی کبھی صادر نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا گناہ اِنسان کی فطرت اوّلہ نہیں۔

۵۔ گناہ کو جُزو فطرتِ اِنسانی ماننے سے احکام و شرائع اور اوامر و نواہی (وہ احکام جن میں نہ کرنے کا حکم ہو) الہٰیہ کا بطلان لازم آئے گا۔ خُدا خود گناہ کو اِنسان کی طبیعت میں پیدا کر کے اُس کے خلاف احکام صادر نہیں کر سکتا۔

۶۔ اگر گناہ عرضِ ذاتی ہے تو خُدا تعالیٰ کسی کو سزا و جزا نہیں دے سکتا۔ اور عدالت و ابدی زندگی سے انکار لازم آئے گا۔

۷۔ خُدا کے تمام انتظامات دربارہ ازالہ گناہ اور نجاتِ بنی نوعِ اِنسان باطل ٹھہریں گے۔ کیونکہ خاصہ ذاتی کا انفکاک (جُدا ہونا) اپنی ذات سے محال ہے۔

۸۔ گناہ بدی کے حامل ہونا خُدا کی عین فرماں برداری ہو گی۔ اور نیکی کے عامل ہونا خُدا سے سرکشی و مخالفت کرنا ہو گا۔

جب کہ گناہ کو اِنسان کی اصلی فطرت ماننے سے مندرجہ بالا قباحتیں لازم آتی ہیں۔ تو یہ خیال کو خود باطل ہو کر محال ٹھہرا۔ اور ثابت ہوا کہ گناہ اِنسان کی طبیعت کا خاصہ ذاتی نہیں۔ طبیعت اوّلہ نہیں بلکہ طبیعت ثانیہ یا عرض انضمامی (پیوست کرنا، شمولیت) ہے۔ یعنی خُدا نے تو ابوالبشر کو پاک وراست پیدا کیا تھا۔ لیکن وہ خود الٰہی نافرمانی کر کے گنہگار ہو گیا۔ ''تو میں نے صرف اتنا پایا کہ خُدا نے اِنسان کو راست بنایا۔ پر اُنہوں نے بہت سی بندشیں تجویز کیں'' (واعظ ۲۹:۷)۔ اور اُس گناہ سے اِنسان کی طبیعت بگڑ گئی۔ اور وہ طبعی بگاڑ وراثتاً آدم سے تمام نسلِ اِنسانی میں منتقل ہو گیا (رومیوں ۱۲:۵)۔

اس دُنیا میں بے شمار جسمانی امراض پائے جاتے ہیں۔ اور وہ امراض یا تو موروثی ہوتے ہیں۔ یعنی آباواجداد سے اولاد کر وراثتاً ملتے ہیں۔ جیسے تپ دق کے مریض والدین کے بچے بھی تپ دق میں مبتلا ہوتے ہیں۔ یا متعدی ہوتے ہیں۔ یعنی مریضوں کی صُحبت و سنگت سے لاحق ہوتے ہیں۔ جیسے کوئی تندرست آدمی کسی کوڑھی یا تپ دق کے مریض کی صحبت میں رہنے سے خود بھی اس مرض کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور یا کَسبی (فعل سے) ہوتے ہیں۔ یعنی اپنی ہی غفلت و نادانی سے پیدا ہوتے ہیں۔ جیسے کوئی آدمی گرم گرم چاہے پی کر اُوپر سے فوراً برف کا ٹھنڈا پانی پی لے اور گرسرد ہو کر بیمار ہو جائے۔ جس طرح یہ جسمانی بیماریاں جسم کے لئے مضرت رساں ہیں۔ اُسی طرح گناہ ایک روحانی مرض ہے اور رُوح کی تخریب و تنزل کا موجب ہے۔ اور یہ روحانی مرض (گناہ) بھی تین ہی طرح پر ہے۔

طبعی موروثی گناہ

آدم اور حوا کے گناہ میں گرنے سے اُن کی طبیعت ناپاک اور گناہ آلودہ ہو گئی۔اور اُس بُری طبیعت کا اثر وراثتاً اُن کی نسل میں منتقل ہوتا آیا۔"دیکھ میں نے بدی میں صورت پکڑی۔اور میں گناہ کی حالت میں ماں کے پیٹ میں پڑا"(زبور ۵۱:۵)۔"شریر پیدائش ہی سے کجروی اختیار کرتے ہیں۔وہ پیدا ہوتے ہی جھوٹ بول کر گمراہ ہو جاتے ہیں"(زبور ۵۸:۳)۔"میں جانتا تھا کہ تو بالکل بے وفا ہے۔اور رحم ہی سے خطاکار کہلاتا ہے"(یسعیاہ ۴۸:۸)۔"اِنسان کے دل کا خیال لڑکپن سے بُرا ہے"(پیدائش ۸:۲۱)۔"پس جس طرح ایک آدمی کے سبب سے گناہ دُنیا میں آیا۔اور گناہ کے سبب موت آئی۔اور یوں موت سب آدمیوں میں پھیل گئی۔اس لئے کہ سب نے گناہ کیا"(رومیوں ۵:۱۲)۔گناہ کو موروثی کہنے سے یہ نہ سمجھا چاہے کہ اولا داپنے والدین کے گناہوں کی سزا میں بھی مبتلا ہوتی ہے۔ہر گز نہیں بلکہ بدی کا میلان وراثتاً والدین سے اولاد میں منتقل ہوتا ہے نہ کہ سزا بھی۔"گناہ تو کردی وپدرت بہ قتل گاہ رسید" والا معاملہ نہیں۔اس کے متعلق کلامِ الٰہی کا فیصلہ ملاحظہ ہو۔"اُن ایام میں پھر یوں نہ کہیں گے کہ باپ دادا نے کچے انگور کھائے اور اولاد کے دانت کھٹے ہو گئے۔کیونکہ ہر ایک اپنی ہی بدکرداری کے سبب سے مرے گا۔ہر ایک جو کچے انگور کھاتا ہے۔اُسی کے دانت کھٹے ہوں گے"(یرمیاہ ۳۱:۲۹-۳۰؛گلتیوں ۶:۵)۔اگر کوئی ہمارے اس دعویٰ کی تردید میں (خروج ۲۰:۵) کو پیش کر کے یہ ثابت کرنا چاہے کہ اولاد اپنے آباو اجداد کی سزا میں مبتلا ہوتی ہے تو اُس کے متعلق عرض ہے۔کہ سزا دو قسم کی ہوتی ہے۔یعنی سزائے نظامت اور سزائے عدالت۔خُدا اس دنیا میں کبھی کسی کو عدالتی سزا نہیں دیتا۔بلکہ اُس کے لئے ایک خاص دن مقرر ہے۔لیکن سزائے نظامت جسمانی اور ایں جہانی ہوتی ہے۔اُس میں بے شک بچے بھی والدین کے ساتھ سزا پاتے ہیں۔جیسے طوفانِ نوح میں بدکرداروں کے ساتھ اُن کی اولاد بھی ہلاک ہوئی۔لیکن اس سے اُن کا کوئی روحانی نقصان نہیں ہوا۔وہ سزائے عدالت کے لئے باقی رکھے گئے ہیں۔جب بدی حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہے تو خُدا بدکاروں کو اُن کی نسل سمیت مٹا دیتا ہے۔جیسے ایک مصور اپنی تصویر کو جس میں نقص پیدا ہو جائیں ربڑ سے مٹا دیتا ہے۔جو سزائیں حاکموں کی طرف سے بدکاروں کی اصلاح کے لئے دی جاتی ہیں وہ بھی خُدا کی انتظامی سزا میں شامل ہیں۔سزائے نظامت توبہ کرنے سے ٹل بھی جاتی ہے۔جیسے نینوا کے لوگوں نے جب اپنی بدکرداری سے توبہ کی اور خُدا کی کے حضور خاکساری اختیار کی تو اُن کی سزا ٹل گئی (یوناہ ۳:۵-۱۰)۔لیکن سزائے عدالت رُوحانی سزا ہے اور اٹل ہے۔اُس سے کوئی بدکار بچ نہیں سکتا۔

متعدی گناہ

یعنی بدکرداروں کی قُربت وصحبت سے بھی اِنسان کی طبیعت بد سے بدتر ہوتی جاتی ہے۔اس لئے کلام میں آیا ہے کہ "فریب نہ کھاو بُری صحبتیں اچھی عادتوں کو بگاڑ دیتی ہیں"(ا۔کرنتھیوں ۱۵:۳۳)اور (زبور ۱:۱) میں اُس آدمی کو مبارک کہا گیا ہے جو شریروں کو صحبت سے پرہیز کرتا ہے (امثال ۲۰:۱۳؛۲۴:۲۲؛۲۴:۱)۔

کسبی گناہ

"ہر شخص اپنی ہی خواہشوں میں کھنچ کر اور پھنس کر آزمایا جاتا ہے۔پھر خواہش حاملہ ہو کر گناہ کو جنتی ہے"(یعقوب ۱:۱۴-۱۵؛۲۔پطرس ۱:۴) گناہ نے فطرتِ اِنسانی پر اثر انداز ہو کر زندگی کے شیریں چشمہ کو زہریلا بنا دیا ہے۔کے سبب اس دُنیا میں اِنسان ہر قسم کے مصائب جسمانی وآلا

م(دکھ،رنج)روحانی میں مبتلا نظر آتا ہے۔اور زندگی ایک ناقابل برداشت بوجھ معلوم ہوتی ہے۔ریاضتِ بدنی اور تزکیہ نفس(نفس کو پاک کرنا)وغیرہ کے ہمہ گیر خیالات گناہ کے وجود اوراُس کے باعث اِنسان کی روحانی بے چینی اور قلبی اضطراب (بے چینی) کے مظہر ہیں۔ بلکہ ان جسمانی ورحانی آلام(الم کی جمع،رنج وغم)ومصائب سے تنگ آکرانسان نے خودکشی کوذریعہ نجات سمجھا۔یونانی حکماء کا یہ خیال ہے کہ طبعی موت خُودکشی کوذریعہ نجات سمجھا۔یونانی حکماء کا یہ خیال ہے کہ

"طبعی موت خودانسان کے پاس آتی ہے۔اور خودکشی اِنسان کو موت کے پاس لے جاتی ہے"۔

فیثا غورث افلاطون اور ارسطوخودکشی کے بظاہر مخالف ہیں۔اور افلاطون خودکشی کی مخالفت کے باوجود دبی زبان سے یہ کہتا ہے کہ

"شدتِ افلاس(بھوک،غربت)ومصائب سے جب زندگی ناقابل برداشت ہوجائے توخُودکشی جائز ہے"۔

مارکس اُریلئیس کہیں خودکشی کا مخالف اور کہیں حامی ہے۔وہ کہتا ہے کہ

"ہر شخص کو اپنی جان پر کامل اختیار حاصل ہے"۔

حکیم اپی کیورس کا یہ عندیہ ہے کہ۔

"خوب غور کرلو موت کا تمہارے پاس آنا بہتر ہے یا تمہارا موت کے پاس جانا"۔

اس کی تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ اُس کے پانچ شاگرد خودکشی کے مرتکب ہوئے۔پلینسی بڑے فخر سے کہتا ہے کہ

"موت کے بارے میں عبد کو معبود پر فضیلت حاصل ہے کہ وہ اپنی حسب مرضی زندگی کا خاتمہ کرسکتا ہے۔اور یہ فطرت کی فیاضی کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ دُنیا میں ایسی جڑی بوٹیاں پیدا کردی گئی ہیں۔ جن کی مدد سے اِنسان اپنے مصائب کا آسانی سے خاتمہ کرسکتا ہے"۔

ہیجیسی ایک مشہور فاضل گذرا ہے جسے "خطیب مرگ" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔یہ شخص ایک طرف تو حصولِ لذت کواِنسانی حیات کی غرض وغایت ٹھہراتا ہے۔اور دوسری طرف موت کی بہترین نعمت قرار دیتا ہے۔یہ بڑا سحر بیان خطیب اور عظیم آتش نوا مقرر تھا۔اس کی خطابت کا یہ اثر ہوا کہ ہزاروں آدمیوں نے خودکشی کرنا شروع کردی۔روزانہ خودکشی کے واقعات ظہور پذیر ہونے لگے۔ان اموات کا ملک کی آبادی پر بہت بُرا اثر پڑا۔ اس لئے حکومت نے ہیجیسی کو سکندریہ سے جلاوطن کردیا۔رُوم کے شعرا متاخرین میں سلیس(آسان)اٹالیکس کو بڑا درجہ حاصل تھا۔وہ بھی خودکشی سے مرا۔رُوم کا مشہور جزل لایگنس زہر کھا کر ہلاک ہوگیا۔اُس کے اس فعل کو ایثار۔اور وطن دوستی سے تعبیر کیا گیا۔ کلبی پرمی گرنس جب زندگی سے اکتا گیا۔تو اُس نے خودکشی کے وقت بہت سے دوستوں کو دعوت دی۔اور اُن کی موجودگی میں آگ میں کود کر ہلاک ہوگیا۔

اے پکٹٹس کہتا ہے۔

"یہ خُوب یادرکھو کہ دروازہ کھلا ہوا ہے بچوں سے زیادہ تر بزدل نہ بنو۔جس طرح جب بچے کھیل کُود سے اکتا جاتے ہیں تو صاف کہہ دیتے ہیں کہ اب نہ کھیلیں گے۔اسی طرح جب تو زندگی سے عاجز آجاؤ تو فوراً زندگی ترک کردو"۔

حکیم سنیکا کے خطبہ کے چند اقتباسات درج ذیل ہیں:۔

"اگر موت نہ ہوتی تو یہ زندگی کیسا ناقابل برداشت عذاب ہوتی۔موت پر میرے موذی سے موذی دشمن کا بھی دسترس نہیں۔درحقیقت موت ایسی شئے ہے جو تمام مصائب کے لئے سپر ہے"۔تم تکالیف سے نجات حاصل

کرناچاہتے ہو۔ تواس کے لئے جس طرف نظر اُٹھاؤ تمہیں وسائل وذرائع بہ افراط ملیں گے۔ پہاڑ اور چٹان کی بُلندی، دریا، کوئیں اور سمندر کی تہ جہاں چاہو ذریعہ نجات موجود ہے۔ (یعنی جس طریقہ سے چاہو خودکشی کر سکتے ہو)۔ جب مجھے طریقہ موت میں انتخاب کرنا ہے۔ تو کیوں نہ میں آسان موت کو تکلیف دہ موت پر ترجیح دے کر اختیار کریوں؟ جس طرح مجھے اپنے رہنے کے لئے مکان کے انتخاب کا اور سفر کے لئے جہاز کے انتخاب کا حق حاصل ہے۔ اُسی طرح طریقہ موت کے انتخاب کا بھی حق حاصل ہے۔ جس طریقہ پر تمہیں اچھا معلوم ہو زندگی کو خیر باد کہو۔ خواہ تلوار کی کاٹ سے خواہ رسی کے پھندے سے خواہ زہر کے گھونٹ سے۔ بہرحال اپنی مشکل آسان کرو"۔

"طریق زندگی میں تُم دوسروں کی خوشی ومرضی کی پرواہ کرتے ہو۔ لیکن طریقِ موت بالکل تمہاری ذاتی خوشی پر منحصر ہے۔ جب تک تمہاری خوشی ہے زندہ رہو۔ جب دیکھو کہ زندگی ناقابل برداشت ہوگئی ہے تو پھر بھی اُسے جھیلتے رہنا خود تمہارا قصور ہے۔ جہاں سے تم آئے ہو وہاں واپس چلے جانا بالکل تمہارے قدرت واختیار میں ہے۔ اور اس حق سے فائدہ اُٹھانے سے تمہیں کون روک سکتا ہے"؟

(تاریخ اخلاق یورپ)

خودکشی کے متعلق اس قدر لمبے چوڑے اقتباسات پیش کرنے سے غرض صرف یہ ہے کہ ناظرین کو گناہ کے ہولناک نتائج کی تصور کھینچ کر دکھائی جائے۔ کلام میں آیا ہے کہ "گناہ کی مزدوری موت ہے"۔ "اور گناہ جب بڑھ چکا تو موت پیدا کرتا ہے" پس موت خواہ طبعی ہو خواہ غیر طبعی اور چاہے جسمانی ہو یا روحانی وہ ضرور گناہ کا لازمی نتیجہ ہے۔ جب مرضِ گناہ عام ہوگیا تو مریضانِ گناہ نیم حکمیوں (دنیوی فلاسفروں) کی ستم ظریفیوں کا تختہ مشق ہے۔ اور بمصداق "نیم حکیم خطرہ جان" اُن کی حالت بد سے بدتر ہوگئی۔ یعنی فلاسفروں نے جہاں اس زندگی کے عذاب سے نجات حاصل کرنے کے کئی غلط طریقے بتائے وہاں خُودکشی کو بھی ذریعہ نجات قرار دیا۔ اور بنی آدم کو قعرِ ضلالت (گمراہی کی گہرائی) میں گرادیا۔

خارجی عالم کی طبعی اشیاء اور جاندار مخلوق جن پر خُدا نے اِنسان کو حکمرانوں ٹھہرایا تھا اب حضرت اِنسان کے مخالف نظر آتی ہیں۔ اور اس مخالفت کی اصل وجہ بھی گناہ ہے۔ اور انسان اور نیچر کی اشیاء کے مابین ناموافقیت کی دو وجوہات ہیں۔

ا۔ اِنسان کا طبعی بگاڑ

ایک شخص جب بخار میں مبتلا ہوتا ہے تو بخار سے اس کی طبیعت بگڑ جاتی ہے۔ اور عدم صحت طبع کے باعث اسے پانی روٹی اور دیگر خوردنی اشیا کڑوی معلوم ہوتی ہیں۔ اور ہوا روشنی سے اسے نفرت ہوجاتی ہے حالانکہ روٹی، پانی، ہوا اور روشنی میں کوئی بگاڑ نہیں ہوتا۔ وہ اصلی حالت میں ہوتے ہیں۔ صرف علالت (بیماری) طبع کے باعث مریض کو وہ چیزیں بدمزہ اور خلافِ طبع معلوم ہوتی ہیں۔ اسی طرح اِنسان کی طبیعت گناہ کے مرض سے بگڑ گئی ہے۔ اور وہ روحانی طور پر مریض ہے۔ اس لئے فطرت کی وہ عام چیزیں جو کسی وقت اُس سے موافقت رکھتی تھیں اب خلافِ طبع معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً سانپ اُس کی ڈسنا چاہتا ہے۔ شیر اُس کے خون کا پیاسا ہے۔ اسی طرح چیتا، بھیڑیا، بچھو، مکھیاں وغیرہ سب اُس کو اپنے مخالف نظر آتے ہیں۔ پر دراصل یہ تمام چیزیں تو ویسی کی ویسی ہی ہیں۔ بگاڑ صرف اِنسان کی اپنی طبیعت میں ہے۔ اگر گناہ کا مرض اُس کی طبیعت سے خارج ہوجائے تو کوئی شئے اُس کی مخالف نہ رہے۔ اور ایک وقت آنے والا ہے جس میں ایسا ہی ہوگا۔ یعنی اِنسان مرض گناہ سے آزاد ہو کر اپنی اصلی ابتدائی پاکیزہ فطرت بر بحال کیا جائے گا۔ اور اُس

وقت ''بھیڑیا برّے کے ساتھ رہے گا اور چیتا بکری کے بچے کے ساتھ بیٹھے گا۔ اور بچھڑا اور شیر بچہ اور پلا ہوا بیل مل جُل کر رہیں گے۔ اور ننھا بچہ اُن کی پیش روی کرے گا۔ گائے اور ریچھنی مل کر چریں گی۔ اُن کے بچے اکٹھے بیٹھیں گے۔ اور شیر بیل کی طرح بھوسہ کھائے گا۔ اور دودھ پیتا بچہ سانپ کے بل کے پاس کھیلے گا۔ اور وہ لڑکا جس کا دودھ چھڑایا گیا ہو افعی کے بل میں ہاتھ ڈالے گا۔ وہ میرے کوہِ مقدس پر نہ ضرر پہنچائیں گے نہ ہلاک کریں گے''(یسعیاہ ٦:١١-٩)۔

٢۔ اِنسان کی اصل مرتبہ سے تنزل

اِنسان اور اشیائے نیچر کے مابین ناموافقت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اِنسان نے خُدا کا گناہ کر کے اپنا اصل مرتبہ کھو دیا۔ خُدا نے اُسے پاک وراست پیدا کر کے تمام موجودات پر حکمران ٹھہرایا تھا (زبور ٥:٨-٨)۔ لیکن اُس نے گناہ کر کے اپنی طبیعت کو خُدا کی طبیعت کا مخالف بنالیا۔ اور حکم عدولی سے اپنا وہ تمام اختیار واقتدار کھو دیا اور اپنے عہدہ سے معزول ہو گیا۔ اس لئے اب نیچر کی اشیاء اُس متنزل ومعزول شدہ حاکم کے اختیار کو تسلیم نہیں کرتیں، کیونکہ اگر کوئی گورنر شہنشاہ کے برخلاف سر اُٹھانے کے باعث اپنے عہدہ سے معزول کر دیا جائے تو رعیت اُس کے رُعب واختیار کو خاطر میں نہ لائے گی اور نہ ڈرے گی۔ یہی حال خلیفہ خُدا حضرت اِنسان کا ہوا۔ اُس نے خُدا سے بغاوت کی اس لئے نیچر (فطرت) کی ادنیٰ مخلوق پورے طور پر اُس کے تابع نہیں رہی۔ درندے اُس کو پھاڑنا چاہتے ہیں۔ سانپ اُس کو ڈسنا چاہتے ہیں۔ دریا اُس کو ڈبو دینا چاہتا ہے۔ جراثیم اُس کے خون کے پیاسے ہیں۔ اگر یہ مخلوق کبھی اُس سے خوف بھی کھاتی ہے تو یہ اُس کی شوکتِ گذشتہ اور جلالت رفتہ کا اثر ہے۔ اب اگر وہ کسی طرح پھر اپنی وفاداری کا ثبوت دے کر سابقہ منصب پر بحال نہ کیا جائے تو اُس کی اختیار پورے طور پر تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

گناہ کے نتائج

اب تک ہم نے گناہ کے جسمانی نتائج کا جابجا (جگہ بہ جگہ) ذکر کیا ہے۔ منجملہ ان تمام جسمانی نتائج کے گناہ کے تین نہایت ہولناک روحانی نتائج ہیں۔ جن کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

١۔ **طبعی بگاڑ**۔ خُدا نے اِنسان کو پاک وراست پیدا کیا تھا۔ یہ اِنسان کی اصلی فطرت تھی۔ لیکن گناہ نے اُس کی پاکیزہ فطرت پر اثر انداز ہو کر اُسے پاک سے ناپاک بنا دیا۔ لٰہذا وہ اصل فطرت پر قائم نہ رہا۔ پاکیزگی کے کھنڈرات پر گناہ نے اپنی عمارتیں اُٹھائیں۔ اور زندگی کے شیریں چشمہ کو زہریلا بنا دیا۔ پس گناہ کا پہلا نتیجہ یہ ہے کہ اُس نے اِنسان کی طبیعت کو بگاڑ دیا۔

٢۔ **خُدا تعالیٰ پاک وقدوس ہے** (استثنا ٤:٣٢) اور اِنسان ناپاک اور گنہگار ہو گیا۔ اور خُدا اور اِنسان کی طبائع باہم دگر (آپس میں) متضاد ہو گئیں۔ اور ضدین کا اجتماع محال ہے۔ لٰہذا خُدا اور اِنسان میں جُدائی واقع ہو گئی۔ ''کیونکہ راست بازی اور بے دینی میں کیا میل جول؟ یا روشنی اور تاریکی میں کیا شراکت؟'' (٢۔ کرنتھیوں ١٤:٦)۔ اور اس جُدائی سے مراد بعد مکانی نہیں۔ کیوں کہ ''ہر چند کہ وہ ہم میں کسی سے دور نہیں۔ کیونکہ اُسی میں ہم جیتے اور چلتے پھرتے اور موجود ہیں'' (اعمال ٢٧:١٧-٢٨)۔ بلکہ یہاں جُدائی سے مراد طبعی ناموافقیت ہے (زبور ٤:٥؛ یسعیاہ ٥٩:٢) اور خُدا سے جُدائی کا نتیجہ اِنسان کے لئے سب سے زیادہ ہولناک ہے۔

۳۔ **سزائے عدالت**۔ خُدا العادل ہے اور اِنسان اُس کی عدول حکمی (حکم توڑنا) کرکے اُس کا مجرم ٹھہرا۔ خُدا کی شریعت کا عدول کرنا ہی گناہ ہے۔ (ا۔یوحنا ۳:۴)۔ اب وہی شریعتِ الٰہی جس کو حضرت اِنسان نے توڑا اُس کو مجرم ٹھہرا کر اُس پر سزا کا حکم لگاتی ہے۔ اس لئے کلام فرماتا ہے کہ "شریعت تو غضب پیدا کرتی ہے" (رومیوں ۴: ۱۵)۔ اس لئے گنہگار ابدی ہلاک کا سزاوار ہے۔ "اور گناہ کی مزدوری موت ہے" (رومیوں ۶: ۲۳)۔ "اور گناہ جب بڑھ چکا تو موت پیدا کرتا ہے" (یعقوب ۱: ۱۵)۔ اور وہ موت جو گناہ کی مزدوری ہے صرف جسمانی اور طبعی موت نہیں کیونکہ:۔

ا۔ اس صورت میں جسمانی موت گناہ کی مزدوری یا سزا نہیں بلکہ جزا ٹھہرے گی۔ کیونکہ سزا تو موتِ طبعی پر ہی ختم ہو جائے گی۔ اور موت کے بعد ایک راست و ناراست جنت کا وارث ٹھہرے گا اور جسمانی موت بہشت میں داخل ہونے کا دروازہ ٹھہرے گی۔

۲۔ بہشت میں داخل ہونے کے لئے ضروری ہوگا کہ گناہ کریں۔ تاکہ طبعی موت آئے۔ اور بہشت میں پہنچادے اور نیک کردار لوگ بدنصیب ٹھہریں گے۔ کیونکہ نیکی کرنے سے موت نہ آئے گی اور اُنہیں جنت کی بجائے اس دنیا کے آلام و مصائب (دکھ، رنج) میں رہنا پڑے گا۔

۳۔ خُدا کی بخشش کوئی چیز نہ ٹھہرائے گی۔ اور راست و ناراست ہر دو کو ایک دفعہ موت کے منہ میں جانا پڑے گا۔ اور ساری دُنیا کے لئے مرنا ضروری ہے۔ تو اس حالت میں خُدا کی بخشش کیا فائدہ رکھے گی۔ ہر ایک کے لئے ضرور ہے کہ مرے۔ خُدا کی رحمت کسی کا بھلا نہ کرے گی۔

۴۔ بچوں کا خوردسالی میں مرنا یہ ثابت کرے گا کہ وہ بالغوں کی بہ نسبت زیادہ گنہگار ہیں۔ کیونکہ اُن کی موت جلد اور قبل از وقت واقع ہوتی ہے۔ جیسے قاتل جو سب سے بڑا مجرم سمجھا جاتا ہے وہ چور کی بہ نسبت جو چھوٹا مجرم سے جلد مارا جاتا ہے۔ یعنی اُسے قبل از مرگ پھانسی دی جاتی ہے۔

۵۔ پھر بڑے بڑے گنہگاروں کا عرصہ دراز تک زندہ رہنا یہ ثابت کرے گا کہ گناہ کی زیادتی عمر کی درازی کا موجب ٹھہری۔ اور بچوں کا صغر سنی (کم عمری) میں مرنا یہ ثابت کرے گا کہ گناہ کی کمی عمر کی کوتاہی کا باعث ہوئی۔

پس ثابت ہوا کہ گناہ کی مزدوری (سزا) یہ جسمانی اور طبعی موت نہیں ہوسکتی۔ بلکہ روحانی موت جس کو انجیلِ مقدس میں دوسری موت کہا گیا ہے۔ "یہ دوسری موت ہے" (مکاشفہ ۲۱: ۸؛ ۱۴: ۲۰)۔ خُداوند مسیح نے بھی اس رُوحانی موت (مزدِ گناہ) کا بیان صفائی سے کیا ہے۔ "جو بدن کو قتل کرتے ہیں۔ اور رُوح کو قتل نہیں کرسکتے اُن سے نہ ڈرو۔ بلکہ اُسی سے ڈرو جو رُوح و بدن دونوں کو جہنم میں ہلاک کرسکتا ہے" (متی ۱۰: ۲۸)۔ جس طرح فطرت کے اسبابِ خارجیہ کے ساتھ جسم کی مطابقت و موافقت قائم نہ رہنے سے جسمانی اور طبعی موت آتی ہے۔ اور قوانین طبعیہ کی مخالفت سے جسمانی موت بطور نتیجہ کے لازمی ٹھہرتی ہے۔ اسی طرح قوانینِ روحانیہ واخلاقیہ (احکام و شرائع الٰہیہ) کی عدولی اور خلاف ورزی رُوحانی موت کا موجب ٹھہرتی ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہمیشہ اشرف وجود کے فساد سے ادنیٰ وجود کا فساد لازم آتا ہے۔ اس لئے رُوح کے فساد سے جسم کا فساد بطور لازم و ملزوم کے ضروری ٹھہرا۔ پس جسمانی موت نتیجہ ہے رُوحانی موت کا۔ روحانی موت کی علت گناہ اور جسمانی موت کی علت رُوحانی موت ہے[3]۔ اور یہ رُوحانی اصطلاح ہے۔ خُدا کی زندگی سے خارج ہو کر اِنسان میں بقا کی تاثیر قائم نہ رہی۔ جیسے ایک برقی تار کا تعلق پاور ہاوس سے منقطع ہوجانے پر اُس میں برقی قوت مفقود (لاپتہ) ہوجاتی ہے۔ "کیونکہ اُن کی عقل تاریک ہوگئی ہے۔ اور وہ اُس نادانی کے سبب جو اُن میں ہے اور اپنے دلوں کی سختی کے باعث خُدا کی زندگی سے خارج ہیں" (افسیوں ۴: ۱۸)۔ ایک مچھلی سمندر سے جُدا ہو کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ گو اُس کے مرنے میں کچھ عرصہ بھی لگ جائے۔ تو بھی موت کے قبضہ میں وہ اُسی وقت سے آجاتی ہے جب سمندر سے جُدا ہوجاتی ہے۔ موت اُس پر آہستہ آہستہ اثر کرکے آخر اُسے فنا کردیتی ہے۔ اسی طرح اِنسان

[3] روحانی موت سے مراد روح کی فنا یا نیستی نہیں ہے بلکہ خُدا سے جُدا ہونا روحانی موت ہے۔

جب خُدا سے گناہ کے باعث جُدا ہو گیا تو اُس کی رُوحانی موت اُسی وقت سے شروع ہو گئی۔ اور اگر کسی صورت اُس کا خُدا سے ٹوٹا ہوا تعلق پھر سے جوڑا نہ جائے وہ موت کے یقینی راستہ پر ہے۔ اور ایک وقت ضرور فنا ہو جائے گا۔ ادنیٰ وجود ہمیشہ اشرف وجود کے ساتھ متعلق رہ کر قائم رہ سکتا ہے۔ اور اس سے جُدا ہو کر فنا ہو جاتا ہے۔ جس طرح جسم رُوح کے سہارے زندہ رہتا ہے اُسی طرح رُوح خُدا کے سہارے زندہ رہتی ہے۔ رُوح سے جُدا ہو کر جسم فنا ہو جاتا ہے۔ اور خُدا سے ہو کر رُوح کا فنا ہونا ضروری ہے۔ پس رُوحانی موت کے یہی معنی ہیں۔ اب ہم رُوحانی مردگی کے متعلق کلامِ مقدس کی سند بھی پیش کرتے ہیں۔ تاکہ ناظرین ہمارے اس بیان کو محض ذہنی فلسفہ ہی نہ سمجھیں۔ بلکہ جان لیں کہ اس حقیقت کی بنیاد کلامِ مقدس پر ہے۔ ''اور اُس (خُدا) نے تمہیں بھی زندہ کیا جب اپنے قصوروں اور گناہوں کے سبب مردہ تھے'' (افسیوں ۲:۱)۔ ''جب قصوروں کے سبب مردہ ہی تھے تو ہم کو مسیح کے ساتھ زندہ کیا'' (افسیوں ۲:۵، ۶)۔ ''اور اُس نے تمہیں بھی جو اپنے قصوروں اور جسم کی نامختونی کے سبب سے مردہ تھے اُس کے ساتھ زندہ کیا'' (کلسیوں ۲:۱۳)۔ ''پس جب تُم مسیح کے ساتھ جلائے گئے'' (کلسیوں ۱:۳؛ رومیوں ۶:۵)۔ اور وہ کام جو اِنسان رُوحانی مردگی کی حالت میں کرتا ہے کلام اُنہیں ''مردہ کام'' کہتا ہے۔ ''پس آؤ۔ مسیح کی تعلیم کی ابتدائی باتیں چھوڑ کر کمال کی طرف قدم بڑھائیں۔ اور مردہ کاموں سے توبہ کرنے اور خُدا پر ایمان لانے کی۔۔۔ وغیرہ'' (عبرانیوں ۶:۱)۔ ''مسیح کا خُون جس نے اپنے آپ کو ازلی رُوح کے وسیلے خُدا کے سامنے بے عیب قُربان کر دیا تمہارے دلوں کو مردہ کاموں سے کیوں نہ پاک کرے گا'' (عبرانیوں ۹:۱۴)۔

اَے ناظرین! ہم نے گناہ کی حقیقت و ماہیت کی تحقیق و تدقیق میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت (غفلت، کمی، نظرانداز) نہیں کیا۔ بلکہ نہایت وضاحت سے اُس کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ ایسا کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جب تک کسی مرض کی نوعیت و ماہیت کی صحیح تشخیص (شناخت) نہ کی جائے اُس کا علاج محال ہوتا ہے۔ مسیحیت کے باہر تمام فلسفوں نے گناہ کی ماہیت کے سمجھنے میں غلطی کھائی۔ اور اُس کے اسباب و موجبات اور نتائج کا صحیح سراغ لگانے میں قطعی قاصر رہے۔ اسی واسطے اُن کے نجات کے طریقے ادھورے اور نادرست ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ مسیحیت کے طریقہ نجات اور دیگر تمام مذاہب کے طریق نجات میں بعد المشرقین ہے۔ پس اپنے دل و دماغ کو تعصب سے خالی کر کے مسیحی طریقہ نجات پر جو آئندہ صفحوں میں مدلل (دلیل سے ثابت کیا ہوا، معقول) طور پر بیان کیا گیا ہے غور فرمائے۔

(۱۰)

نجات

جس طرح گناہ کے وجود کو تمام مذاہب اور تمام فلسفے کسی نہ کسی صورت میں تسلیم کرتے ہیں۔اُسی طرح اُس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی ضرورت کے بھی سب بزور (جبراً،زبردستی) قائل ہیں۔اور سب مانتے ہیں کہ گناہ سے آزاد ہونا ضروری اور اصلی فطرت پر بحال ہونا لابدی (لازمی) ہے۔جو شخص صدق دلی سے گناہ کے مسئلہ پر جو ہم نے گذشتہ اوراق میں پیش کیا غور وخوض کرے گا وہ اس حقیقت کا قائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جب کہ واقعی اِنسان کی ایسی ابتر حالت ہے تواُس سے آزاد ہونا ضروری اور اصلی فطرت کا واجبی تقاضا ہے اور اگر کسی صورت اس ہلاکت آفریں حالت سے آزادی حاصل نہ کی جائے تو ہلاکت لازمی ہے۔اور گناہ سے آزاد اور اصلی پاکیزہ حالت پر بحال ہو کر تقربِ الٰہی (خُدا کی قربت) کو حاصل کرنا ہی نجات ہے۔اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس غیر فطری (گناہ آلودہ) حالت سے کس طرح آزادی حاصل کی جائے۔ اور مقاربتِ الٰہی (خُدا کی نزدیکی) ومواصلتِ وجود لا متناہی (جس کی کچھ انتہا نہیں اس کے ساتھ پیوستگی) کے مشکل سوال کا کیا حل ہے ؟دُنیا کے تمام رائج الوقت مذاہب اور فلسفے اس سوال کے مختلف جواب دیتے ہیں۔یعنی حصولِ نجات کے متعلق سب مذاہب کے طریقے باہم متضاد ومتبائن (اُلٹ،فرق فرق) ہیں۔اوراُن میں بعد المشرقین ہے۔ان کثیر التعداد عقائد کو دیکھ کر متلاشی نجات کے دل میں جو دوسرا سوال قدرتی طور پر اُٹھتا ہے وہ یہ ہے کہ آیا یہ سب عقائد صحیح ہیں یا ان میں سے کوئی ایک ؟اگر سب صحیح ہیں تو ایک شخص آن واحد میں ان سب متضاد خیالات وعقائد کا کیسے حامی ہو سکتا ہے ؟یہ بدیہی (ظاہر) حقیقت ہے کہ کوئی شخص فی نفسہ ان تمام عقائد کو ایک ہی وقت میں درست تسلیم نہیں کر سکتا۔کیونکہ یہ سراسر محال ہے۔اور اگر صرف ایک عقیدہ ہی درست ہے تو وہ کونسا ہے ؟یہ قدرتی سوالات ہیں جو ایک متلاشی حق کے دل کو بے چین کر دیتے ہیں۔لہٰذا یہ نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم مختصر طور پر یہاں نجات کے متعلق چند مروجہ (رائج کیے ہوئے) عقائد کی تحقیق کریں۔اور سب سے اول دو بدیہی (ظاہر) اور مشہور طریقے جو تمام اہلِ دُنیا مشترک طور پر ازالہ گناہ اور حصولِ نجات کے لئے قدیم سے عمل میں لاتے رہے ہیں پیش کریں گے۔ایک اُن میں سے اختیاری اور دوسرا جبری طریقہ ہے۔

اختیاری طریقہ

جب سے دُنیا میں گناہ کا احساس ہوا ہے تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ بہت سے ریفارمر (اصلاح کار) ہر قوم میں پیدا ہوتے آئے جن کا نصب العین (زندگی کا مقصد) یہ رہا کہ اپنی اپنی قوم کو تہدید و تلقین کریں۔بدی سے روکیں نیکی کی ترغیب دلائیں۔چوری، حق تلفی، جھوٹ،فریب،زنا،خون ریزی،بدخواہی،بداندیشی،بے انصافی اور ظلم وستم وغیرہ گناہوں کو مٹانے کے لئے مصلحانِ قوم،ہادیان دین اور مقننانِ زمین (زمین پر قانون نافذ کرنے والے) نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔اپنی جانیں چھڑک دیں۔اِن عیوب وذنُوب (جھوٹ) کی مدافعت کے لئے کروڑہا من کتابیں لکھیں گئیں۔ہر زمانے میں تقاریر کی گئیں۔سوسائٹیاں قائم کی گئیں۔قومی ومذہبی مجالس وجود میں لائی گئیں۔ہر مذہب نے امصار (بہت سے شہر) ودیار (گلیوں) میں مبلغ

ومبشر بھیجے۔ مدارس قائم کرکے تعلیم کو تمام کافہ انام (سب لوگ) پر پھیلا دیا گیا۔ تہذیب کو ترقی کی اعلیٰ منازل پر پہنچایا گیا۔ خُدا ترس لوگوں نے بدی کے تخم کو مٹانے اور نیکی کے پودے دُنیا میں لگانے کے لئے اپنی زندگیوں کو وقفِ ایثار کر دیا۔ روزے رکھے گئے۔ نمازیں پڑھی گئیں تہوار منائے گئے متبرک مقامات کی زیارتیں کی گئیں۔ مذہبی رہنماؤں کی سرگرم تقریریں اور دل ہلا دینے والے وعظ ونصیحت ہر زمانے کے لوگوں کے کانوں پر دستک دیتے رہے۔ یہ سب کچھ کس لئے ہوا؟ صرف اس لئے کہ نوعِ اِنسان گناہ کی آہنی زنجیروں سے آزاد ہو کر نیکی اور راست بازی کی جستجو کرے اور حقیقی اخلاقی شائستگی کو حاصل کرے۔ لیکن ذرا انصاف سے کہئے کہ ان سرگرم کوششوں، انتھک محنتوں اور جگر کاویوں نے کون سے خوشگوار نتائج اب تک پیدا کئے؟ کیا یہ مخلصانہ وسائل گناہ کے استیصال (جڑ سے اکھاڑنا) میں کامیاب ہوئے؟ اور کیا گناہ کے سیاہ داغوں سے دُنیا کا دامن صاف ہو گیا؟ ہر گز نہیں گناہ بیش از پیش موجود ہے بقول

"مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی"۔

جبری طریقہ

تاریخ شہادت دیتی ہے کہ دنیا میں راعی ورعیت (کاشتکار اور چرواہے) کا سلسلہ بہت قدیم سے چلا آیا ہے۔ اور بادشاہ کا ہمیشہ یہ کام رہا ہے کہ وہ زورِ بازو سے بدی کو اپنی سلطنت میں سے مٹائے۔ چنانچہ اسی مقصد کے ماتحت ہر زمانہ میں بادشاہوں نے تعزیری قوانین (سزا کے قانون) بنائے۔ پولیس قائم کی، فوج تیار کی، ہتھکڑیاں اور بیڑیاں بنائیں۔ پھانسیاں اور شکنجے تیار کئے۔ جیلیں وجود میں لائے۔ خونیوں اور قاتلوں کو پھانسیاں دیں۔ چوروں اور غداروں سے جیلوں کو بھر دیا۔ ڈاکوؤں کو گولیوں سے اُڑا دیا۔ غرضیکہ شجر گناہ کے استیصال اور جرائم کے انسداد (روکنے کا بندوبست) کے لئے جبر و تشدد اور رعب وداب کو بحدِ امکان استعمال کیا گیا۔ مگر چوروں نے قید خانہ سے نکل کر پھر چوری پر کمر باندھی۔ لوگوں کی آنکھوں کے سامنے ڈاکوؤں کو نہایت عبرت ناک طریقوں سے شکنجوں میں کھینچا گیا تو بھی دیکھنے والوں نے عبرت حاصل نہ کی۔ بلکہ وہ تمام جرائم وذمائم اُسی صورت میں بلکہ اُس سے بھی زیادہ اس وقت بھی موجود ہیں۔ کیا جبر اور قوتِ بازو سے گناہ مٹ گیا؟ ہر گز نہیں تجربہ شاہد ہے کہ جرائم کے تعزیری واصلاحی طریقِ علاج یقیناً ناقص ہیں۔ کیونکہ وہ گناہ کے اصل منبع ومخرج (جہاں سے کوئی چیز نکلتی ہے) تک نفوذ (سرایت کرنا، اندر گھسنا، اثر کرنا) نہیں کرتے بلکہ اُس کے مظاہر پر مواخذہ (جواب طلبی) کرتے ہیں۔ جس حال کہ اِنسانی کوشش کے بازو صدیوں آزمالئے گئے۔ تو اب آیندہ کیا اُمید کی جاسکتی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ اِنسانی طاقت گناہ کی طاقت پر ہر گز غالب نہیں آسکتی۔ اس لئے کلام فرماتا ہے۔ "ہر چند تو اپنے کو سجی سے دھوئے اور بہت سا صابون استعمال کرے۔ تو بھی خُداوند فرماتا ہے۔ تیری شرارت کا داغ میرے حضور عیاں ہے" (یرمیاہ ۲۲:۲؛ ۱۳:۲۳)۔

تناسخ: ہم ہندوؤں کے ختم نہ ہونے والے مسئلہ تناسخ (روح کا ایک قالب سے دوسرے قالب میں جانے کا عمل، آواگون) کے سلسلہ کی تفصیل سے ناظرین کے صبر وسکون کا امتحان لینا نہیں چاہتے۔ اس لئے چند مختصر مگر معقول دلائل سے یہ ثابت کریں گے کہ عقیدہ آواگون (تناسخ) کے مطابق گناہ کی طبیعت سے رہائی اور حقیقی نجات کا حصول محال ہے۔ یہ محض ایک ذہنی فلسفہ ہے جو عالم اسباب کی ناہمواری اور غیر یکسانیت کو دیکھ کر گھڑا گیا ہے اور جس پر یقین کرنے سے اِنسان کی رُوحانی پریشانی ذہنی اضطراب اور قلبی بے قراری بدستور قائم رہتی ہے۔ اور وہ حقیقی اطمینان رُوحانی اور تسکین قلبی سے قطعی محروم رہتا ہے۔ مندرجہ ذیل دلائل سے اس وہمی مسئلہ کی غیر معقولیت مبرہن (دلیل سے ثابت کیا ہوا) ہوتی ہے۔

۱۔ اگر تمام موجودات کا تجزیہ کیا جائے تو دو اجزاء حاصل ہوتے ہیں۔ یعنی رُوح اور مادہ۔ اور حامیان تناسخ کا عقیدہ ہے کہ خُدا ان دونوں چیزوں کا خالق نہیں ہے۔ بلکہ وہ دونوں خُدا کے ساتھ قدیم ہیں۔ اس صورت میں رُوح و مادہ خُدا کے محتاج نہیں ہیں۔ بلکہ اپنی ہستی کی از خود علت ہو کر خُدا کے دائرہ حکومت سے خارج ہیں۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہوئے کہ خُدا اس دُنیا کا خالق نہیں بلکہ صرف ترتیب دہندہ ہے۔ اور جب خُدا ان (رُوح و مادہ) پر حقِ خالقیت نہیں رکھتا تو اُس کا کیا حق ہے کہ آزاد رُوحوں کے متعلق سزا و جزا کے احکام صادر فرما کر اُنہیں تناسخ کے لا متناہی چکر میں تا ابد گھماتا رہے؟ اور نہ وہ کسی سے استحقاقِ عبادت (عبادت کا حق طلب کرنا) رکھتا ہے۔

۲۔ اگر بالفرض محال یہ مان لیا جائے کہ خُدا کو سزا و جزا دینے کا حق حاصل ہے۔ تو اس صورت میں اندھوں، لنگڑوں، محتاجوں اور اپاہجوں پر رحم کرنا اور اُن سے ہمدردی کرنا خُدا سے مخالفت و بغاوت کرنے کے مترادف ہو گا، کیونکہ خُدا تو اُن کو اُن کے سابقہ اعمالِ بد کے باعث دُکھ میں رکھنا چاہتا ہے۔ اور انسان ہمدردی کے جذبہ سے متاثر ہو کر اور اُن کے دُکھوں کو کم کر کے عدل الٰہی کا مخالف اور خُدا کا مجرم ٹھہرتا ہے۔ اس صورت میں رحم، ہمدردی اور محبت کے مواقع ہی نہ رہیں گے۔ اور نیکی کا وجود ہی دُنیا سے نابود (ختم) ہو جائے گا۔ کیونکہ نیکی کے مفہوم میں جتنی باتیں شامل ہیں اُن کا غالب حصہ مظلوموں لاچاروں اور بے کسوں ہی سے متعلق ہے۔ پس خُدا کے قیدیوں کو آرام دینا اور اُن کی استمداد و معاونت کرنا خُدا کی مخالفت ٹھہرے گی اور اعمالِ حسنہ (نیک کرم) جن پر تناسخ کی نجات کا مدار ہے ملیامیٹ (فنا) ہو جائیں گے۔

۳۔ جیو کی طبیعت کو اُس کے متعلقہ جنم کے مطابق بنا دینا کوئی سزا نہیں۔ کیونکہ وہ تو اُس کی طبعی حالت ہو گی، اور یہ ظاہر ہے کہ طبیعت ہر گز سزا نہیں ہو سکتی۔ مثلاً ایک غریب مزدور کو مجرم ہونے پر یہ سزا دی جائے کہ وہ سڑک پر پتھر کوٹا کرے تو یہ اُس کے لئے سزا نہ ہو گی۔ کیونکہ یہ کام وہ پہلے بھی کیا کرتا ہے، یا کسی مجرم کو یہ سزا دی جائے کہ تُم رات بھر سویا کرو، یہ بھی طبعی بات ہے اور اس سے سزا کا مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔ ہاں اگر ایک گورنر کو اُس کے جُرم کی پاداش (بدلہ) میں سڑک پر پتھر کوٹنے پر لگا دیا جائے تو اُس کے لئے یہ ضرور سزا ہو گی۔ کیونکہ اُس کی اپنی شاہانہ طبیعت اور سزا کی نوعیت میں بہت اختلاف ہے۔ اور اس صورت میں اُس کے نفس کی اصلاح بھی ہو سکتی ہے۔ مگر سزا کو طبیعت بنا دینے سے نہ تو وہ سزا ہی رہے گی اور نہ اُس سے کسی اصلاح کی اُمید ہو سکتی ہے۔ تمام حیوانات اپنی حیوانی حالت میں خوش ہیں۔ اگر کسی کتے یا کسی اور جانور کو قتل کرنا چاہو تو وہ اپنے بچاؤ کے لئے فوراً بھاگتا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جس جسم (قید) میں وہ ہے اُس سے آزاد ہونا نہیں چاہتا، بلکہ اُسی میں خوش ہے۔ جس سے صاف نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ اپنی اُس حالت کو قید، بندھ یا سزا نہیں سمجھتا، بلکہ طبعی حالت، پس طبیعت سزا نہیں ہو سکتی، اور اس طریقہ سے تہذیب النفس اور ارتقاءِ رُوحانی و اخلاقی کا امکان ہی محال ہے۔

۴۔ کسی مجرم کو ہتھکڑیاں اور بیڑیاں لگانے اور قید میں بند رکھنے سے دو مقصد ہوتے ہیں۔ ایک تو سزا دینا جس سے اُس کی اصلاح بھی ہوتی ہے۔ اور دوسرے اُس کی آیندہ نقل و حرکت پر پابندیاں لگا کر اُسے اور جرائم کے ارتکاب سے کچھ عرصہ کے لئے روکنا۔ تاکہ اس کی مجرمانہ عادت جاتی رہے۔ وہ پچھلے جرائم کی سزا بھگتتا اور آیندہ جرائم کے ارتکاب کا راستہ اُس پر کچھ عرصہ کے لئے بند کیا جاتا ہے۔ اور وہ قید کی حالت میں واقعی کسی اور جُرم کا ارتکاب کرنے کے ناقابل ہوتا ہے۔ مگر خُدا کے قیدیوں کا حال دیکھئے کہ وہ قید میں رہ کر بھی دوسروں کا نقصان کر سکتے ہیں بلکہ انصافِ خُداوندی اور انتظامِ الٰہی ملاحظہ فرمایئے کہ جرائم کے ارتکاب میں سہولت بہم پہنچانے کے لئے اُن کی قوت کو کئی گناہ بڑھا دیا جاتا ہے۔ مثلاً ایک شیر اگر اس قدر شہزور نہ ہو تو اپنی زندگی میں ہزاروں جانوں کو ہلاک نہ کر سکے۔ اگر شیر کی جُون (جنس) فی الحقیقت جیو کے لئے کوئی قید ہوتی تو لازم تھا کہ ایک تو شیر کی قوت بہت کم

ہوتی اور دوسرے اُس میں کسی دوسرے کو ہلاک کرنے کی قابلیت نہ ہوتی۔ اس لحاظ سے اِنسانی عدالت وانتظام کو الٰہی انتظام میں معدلت (انصاف) پر فضیلت حاصل ہے۔ چونکہ عقیدہ تناسخ کی رُو سے خُدا کے انتظام میں نقص ثابت ہوتا ہے۔ اس لئے یہ عقیدہ خود سراسر لغو اور بے بنیاد ہے۔

۵۔ کسی مصیبت زدہ اِنسان یا کسی بھی حیوان کو یہ علم نہیں کہ کس خاص گناہ کی پاداش میں وہ اُس خاص جسم (سزا یا بندھ) میں مقید ہے۔ اس لئے بلا اظہار جرم (بغیر جرم بتائے) کسی کو سزا دینا ایک تو بے انصافی اور ظلم ہے اور دوسرے اس سے مجرم کی اصلاح محال ہے۔ اگر جرم سے آگاہی ہو تو سزا اصلاح کا کام دے سکتی ہے ورنہ نہیں۔

۶۔ عقیدہ تناسخ کے مطابق کل (۸۴) لاکھ جونیں (اجناس) مسلم ہیں۔ اور اِنسانی جُون اُن میں سے ایک ہے۔ اِنسانی جُون کرم جُونی (فعل کی جگہ) ہے۔ اور باقی (۸۳۹۹۹۹۹) جُونیں بھوگ جُونیاں (قیدیں) ہیں۔ جبکہ (۸۴) لاکھ اجناس میں سے (۸۳۹۹۹۹۹) اجناس تو قیدوں میں ہیں اور صرف ایک جنس (انسانی جُون) آزاد ہے۔ اور اِنسانی جُون میں بھی بیماروں، لاچاروں، اندھوں، لنگڑوں اور مُفلسوں و بیکسوں کی تعداد غالب ہے۔ اور وہ بھی خُدا کے قیدی ہیں تو اس صورت میں قیدیوں کی تعداد آزادوں کی تعداد سے لاکھوں گنا زیادہ ہوئی۔ اس کی کوئی بدیہی (ظاہر) مثال عالم میں نہیں ہے کہ قیدی آزادوں سے زیادہ ہوں۔ اور وہ بھی کروڑوں بلکہ سنکھوں کی تعداد میں۔ یہ بھی اس عقیدہ کے بطلان کی دلیل ہے۔

۷۔ آواگون (تناسخ) کی رُو سے کسی نیچ قوم میں پیدا ہونا بھی سابقہ بُرے اعمال کی سزا ہے۔ تو اس صورت میں ہندووں کا شُدھی سنگٹھن کا ڈھکو سلہ قائم کر کے اچھوت اُدھار کرنا عدل الٰہی کی مخالفت و بغاوت نہیں تو اور کیا ہے۔ خُدا نے اُنہیں سزا دی ہے کہ نیچوں کے گھر پیدا ہوں اور آریہ پرچارک اُنہیں شُدھ کرتے پھرتے ہیں۔ یہ کیا اندھیر ہے؟ شاید خُدا کی ناراضگی کو اس امر میں وہ بھی محسوس کرتے ہیں اور اسی لئے اچھوتوں کو چکمے جھانسے دے کر سطحی طور پر شُدھ (پاک) کرتے پھرتے ہیں اور در اصل اُن کے ساتھ مرتبت (مرتبہ) ہونے سے گھبراتے ہیں۔

بخوفِ طوالت اتنے ہی دلائل پر اکتفا کیا جاتا ہے اور اسی قدر بیان سے ناظرین پر خوب روشن ہو گیا ہو گا کہ عقیدہ تناسخ محض مفروضات وتوہمات ذہنیہ کا مجموعہ ہے۔ اور حصولِ نجات کے لئے اُس پر اپنے ایمان کی بنیاد رکھنا خُدا کی ہستی سے انکار کرنے کے برابر ہے۔ تناسخ کی نجات مادیات کی حدود سے تجاوز نہیں کرتی۔ اور حظائظ جسمانیہ ولذائذ نفسانیہ (زندگی میں جسمانی اور نفسانی فوائد) کو زندگی کی غایت (انجام، غرض) سمجھا گیا ہے اور اعمال حسنہ (نیک اعمال) کو نجات کی شرط قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ گناہ آلودہ طبیعت سے حقیقی نیکی کا صدور محال ہے۔ ہم نے اس مبحث کے آغاز ہی میں دو طریقے (اختیاری وجبری) گناہ کی مدافعت کے متعلق درج کئے ہیں۔ اور اُن میں دکھایا ہے کہ گناہ کا ازالہ انسانی تدابیر سے محال ہے۔ پس جب گناہ ہی کا ازالہ واندفاع محال ہے تو نیکی کہاں سے آجائے گی؟ جیسے گناہ آلودہ طبیعت سے گناہ ہی صادر ہوتا ہے ویسے ہی نیک طبیعت سے نیکی کا حصول ضروری ہے۔ اب ہم اس بیان کو یہیں ختم کرتے ہیں۔ اعمال حسنہ بیان میں اس مبحث (بحث) پر مزید روشنی ڈالی جائے گی۔

تزکیہ نفس

گناہ کی موجودگی دُنیا میں ہر قسم کے دُکھ درد۔ رنج وآلام (الم کی جمع، رنج وغم) اور مصائب وعقوبت کا باعث ہے اور تمام لوگ دل سے متمنی ہیں کہ کسی طرح جسمانی آلام (الم کی جمع، رنج و غم) سے اُن کا دامن چھوٹ جائے اور حقیقی خوشی اور اطمینان قلبی حاصل ہو جائے۔ یہ واقعی بہت سعیدہ (نیک، بھلا) خواہش ہے اور انسان کی ابتدائی پر سکون واطمینان فطرت کا واجبی تقاضا ہے۔ لیکن اُس مسرت مقصودہ کی نوعیت کے اعتبار سے دو قسم کے خیال دُنیا میں پائے جاتے ہیں۔ اور ان خیالات کی حمایت میں دو گروہ پیدا ہو گئے ہیں۔ ایک تو وہ لوگ ہیں جو روحانی خوشی اور ابدی مسرت کے

جویاں(تلاش کرنے والا) ہیں۔ اور جسم کو حقیر اور ناچیز سمجھ کر اُسے بے دردانہ طور سے ریاضت کے شکنجوں میں کھینچتے ہیں اور تزکیہ (پاک کرنا) وریاضت جسمانی کو اُس روحانی خوشی کے حصول کا واحد ذریعہ سمجھتے ہیں اور وجود عنصری کو اُس اعلیٰ روحانی مقصد کے حصول میں سدِراہ(روک بننا) سمجھ کر اُس سے ایسی دُشمنی کرتے ہیں کہ بعض دفعہ تو وہ مجبور ہو کر طائر (پرندہ) رُوح کو پرواز کرنے کے لئے آزاد کر دیتا ہے۔ یہ فطرتِ کے خلاف جہاد ہے اور خُدا کی ناشکر گذاری۔ خُدا نے جب خود ہی جسم بنایا اور اُس کے قائم رکھنے کے لئے اس کارخانہ فطرت میں ہر طرح کے سامان پیدا کر دئے۔ کھانے کے لئے خوراک پہننے کے لئے پوشاک۔ بیماریوں کے علاج کے لئے ہر نوع کی جڑی بوٹیاں اور ادویہ بنادیں۔ حکماء واطباء کو حکمت وذہانت سے بہرہ ور فرمایا تاکہ وہ اِنسانی اجسام کو قائم رکھنے کے لئے ان ادویہ کا درست استعمال کر سکیں۔ یہ تمام سامان اس جسد خاکی (جسم) کی حفاظت اور پرورش کے لیے دیا گیا، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خدا جسم کی حفاظت کو ضروری سمجھتا ہے اور اُس کی مرضی یہی ہے کہ جسم تادیر قائم رہے۔اب اگر اس جسم کو ریاضت کے ذریعہ اذیت دی جائے۔اس کی پرورش بند کر دی جائے اور فاقہ کشی اختیار کی جائے تو کیا یہ خُدا کی مرضی کی مخالفت نہ ہوگی؟ضرور ہوگی دوسری بات یہ ہے کہ جسم کو دُکھ اور ایذا دینے سے گناہ جو آلام (الم کی جمع، رنج وغم) ومصائب کا موجب ہے ہر گز مرِدہ نہیں ہو سکتا۔ جیسے سانپ کے بل کو مارنے سے سانپ نہیں مر سکتا۔ اور ترکِ دُنیا سے فعلی اور عملی گناہوں کا امکان گو مٹ جاتا ہے تاہم خیالی اور ارادی گناہ سے کبھی چھٹکارا نہیں ہو سکتا۔ جیسے ایک مبروص (کوڑھی) کو دیگر کوڑھیوں سے الگ رکھنے پر بھی اُس کا مرض دور نہیں ہوتا۔ایک سانپ کو دوسرے سانپوں سے جُدا رکھنے سے اُس کا زہر دور نہیں ہوتا۔ہاں البتہ اگر کسی سانپ کو غیر آباد ویرانے میں چھوڑ آئیں تو اُس کا ڈس لینے کا امکان مٹ جاتا ہے۔ مگر زہر تو دور نہیں ہوتا۔

اسی طرح سے وہ بُری طبیعت اور گناہ کا متوارث اعلان جو نوعِ اِنسانی کے ہر ہر فرد میں موجود ہے تزکیہ نفس (نفس کو پاک کرنا) اور ترکِ دُنیا(دُنیا کو چھوڑ دینا) سے دور نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ان ذرائع سے گناہ کا ازالہ محال اور نجات کا حصول ناممکن ہے۔اس طریق میں افراط (کثرت) ہے۔

دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جو جسمانی اور نفسانی خوشی ہی کو سب کچھ سمجھے بیٹھے ہیں۔ اگر کسی طرح نجات کے قائل بھی ہیں تو جنت میں نفسانیات ومادیات کو ساتھ ہی رکھتے ہیں۔ وہ نفسِ امارہ (انسان کی خواہش جو برائی کی طرف مائل کرے) کے یہاں تک غلام ہو چکے ہیں کہ روحانی خوشیوں کو بھی نفسانیات پر ہی قیاس کرتے ہیں۔اور اس زندگی کے بعد کسی اعلیٰ رُوحانی زندگی اور اعلیٰ اور غیر فانی رُوحانی خوشی کے قائل نہیں۔اُن کا عقیدہ یہ ہے کہ "کھائیں پئیں۔ کیونکہ کل تو مر ہی جائیں گے" (۱۔کرنتھیوں ۱۵:۳۲)۔اور انجیلِ جلیل اُن کے حق میں فرماتی ہے۔ "اُن کا انجام ہلاکت ہے۔اُن کا خُدا پیٹ ہے۔ وہ اپنی شرم کی باتوں پر فخر کرتے ہیں۔اور دُنیا کی چیزوں کے خیال میں رہتے ہیں" (فلپیوں ۳:۱۹)۔ "اور وہ حق سے محروم ہیں اور دینداری کو نفع ہی کا ذریعہ سمجھتے ہیں" (۱۔ تیمتھیس ۶:۵)۔ایسے لوگ اس دنیا کی عیش وعشرت اور چند روزہ آرام وخوشی کو مکتی اور نجات سمجھے بیٹھے ہیں۔ تناسخ کے حامی بھی اسی دُنیا کے آرام وراحت اور مدارج ومعارج کو حقیقی خوشی سمجھ کر یہ سوال کیا کرتے ہیں کہ اگر پرماتما نیائے کاری (انصاف کرنے والا) ہے تو اُس نے بعض کو غریب اور بعض کو امیر کیوں پیدا کیا اور خوش حالی وتنگدستی کو اِنسان کے گذشتہ جنم کے بھلے یا بُرے اعمال کا نتیجہ مانتے ہیں۔ حالانکہ اس دُنیا کی جسمانی ونفسانی خوشی وراحت کسی صورت نجات کی خوشی نہیں ہو سکتی۔اور نہ اس دُنیا کا دُکھ درد خُدا کی عدالت کے باعث ہے۔ یہ چیزیں اگر دُنیا کو ملتی ہیں تو محض جسم کو کسی عرصہ تک قائم رکھنے کے لئے۔ نیک اعمال جو خاص روح سے متعلق ہیں وہ رُوحانی نجات اور رُوحانی خوشی کا موجب ہو سکتے ہیں نہ کہ نفسانی وجسمانی خوشی کا۔ اگر یہ تمام فوائد ومنافع کرموں ہی کا پھل ہیں تو ایسے لاکھوں آدمی موجود ہیں جو دہریہ والدین کے بیٹے اور دہریہ دادا کے پوتے ہیں۔ لیکن باوجود دہریہ ہونے کے دُنیوی جاہ وثروت (مال ودولت) اور آرام وآسائش ورثتاً اُن کے حصہ میں آتے ہیں۔ یہ سراسر دھوکا ہے۔انجیل اس خیال کی بزور مخالف ہے۔اُوپر کے خیال میں افراط ہے اور اس خیال میں تفریط (کسی کام میں کمی کرنا، کوتاہی) ہے۔ فریق اوّل جسم کو

ناچیز وحقیر سمجھ کر اُس کا مٹانا چاہتا ہے تا کہ روحانی اطمینان کو حاصل کرے۔اور فریق ثانی جسم کی بُری خواہشات کا غُلام ہے۔اور روح اور رُوحانی خوشی کی طرف سے قطعی لاپرواہ ہے۔ ان دونوں خیالوں میں افراط وتفریط(کمی بیشی) ہے جو کہ معیوب ہے۔ انجیل ان دونوں خیالات کے بین بین(درمیانی، ملاجلا) چلتی ہے۔وہ ریاضت جسمانی کے خلاف فرماتی ہے۔"ان باتوں میں اپنی ایجاد کی ہوئی عبادت اور خاکساری اور جسمانی ریاضت کے اعتبار سے حکمت کی صورت تو ہے۔ مگر جسمانی خواہشوں کے روکنے میں ان سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا"(کلسیوں ۲۳:۲)۔"دینداری کے لئے ریاضت کر۔ کیونکہ جسمانی ریاضت کا فائدہ کم ہے۔ لیکن دینداری سب باتوں کے لئے فائدہ مند ہے۔اس لئے کہ اب کی اور آیندہ کی زندگی کا بھی وعدہ اسی کے لئے ہے"(ا۔تیمتھیس ۷:۴-۸)۔اور موخر خیال کے متعلق انجیل یہ فرماتی ہے۔"کیونکہ نہ ہم دُنیا میں کچھ لائے اور نہ کچھ اُس میں سے لے جاسکتے ہیں۔ پس اگر ہمارے پاس کھانے پہننے کو ہے تو اُسی پر قناعت کریں۔ لیکن جو دولت مند ہونا چاہتے ہیں۔وہ ایسی آزمائش اور پھندے اور بہت سی بیہودہ اور نقصان پہنچانے والی خواہشوں میں پھنستے ہیں۔جو آدمیوں کو تباہی اور ہلاکت کے دریا میں غرق کردیتی ہیں"(ا۔تیمتھیس ۷:۶-۹؛زبور ۱۶:۴۹-۱۷؛ واعظ ۵:۱۵-۱۶؛صفنیاہ ۱۸:۱)۔"تُم پہلے اُس کی بادشاہت اور اُس کی راست بازی کی تلاش کرو تو یہ سب چیزیں بھی تمہیں مل جائیں گی"(متی ۶:۳۳)۔ پس امورِ معاشرت کوئی نیکی نہیں ہیں اور نہ ان کو تیاگ دینا(چھوڑنا)ہی نیکی ہے۔"کیونکہ کھانا ہمیں خُدا سے نہیں ملائے گا۔اگر نہ کھائیں تو ہمارا کچھ نقصان نہیں اور اگر کھائیں تو کچھ نفع نہیں"(ا۔کرنتھیوں ۸:۸)۔پس نجات نہ تو ترکِ دُنیا اور تزکیہ نفس(نفس کو پاک کرنا)پر منحصر ہے اور نہ ہی دُنیا میں اُلجھے رہنے پر۔خُدا نے نہ تو دُنیا تیاگنے کے لئے بنائی ہے اور نہ اس لئے کہ اِنسان زخارف(بھری) دُنیا کا غُلام ہو جائے اور عاقبت کی طرف سے قطعی آنکھیں بند کرلے۔اِن اِنسانی بناوٹوں اور واہی(بےہودہ) خیالات کو نجات سے کوئی سروکار نہیں اور دور کا بھی واسطہ نہیں۔ نجات کے متعلق جو طریقے اب تک ہم نے پیش کئے وہ سب لوگوں کی اپنی گھڑت ہیں۔اسی واسطے لوگوں نے مرض گناہ سے رہائی نہیں پائی اور اُن کا قلبی اضطراب(دل کی بیقراری)اور روحانی بے چینی دور نہیں ہوئی۔

اعمالِ حسنہ

واضح ہو کہ نیک اعمالِ انسان کے لئے ضروری ہیں۔ خُدا اُس سے ان کا مطالبہ کرتا ہے۔"تمہاری روشنی آدمیوں کے سامنے چمکے۔تا کہ وہ تمہارے نیک کاموں کو دیکھ کر تمہارے باپ کی جو آسمان پر ہے بڑائی کریں"(متی ۱۶:۵)۔کیونکہ ہم اُسی کی کاریگری ہیں۔"اور مسیح یسوع میں اُن نیک اعمال کے واسطے مخلوق ہوئے جن کو خُدا نے پہلے سے ہمارے کرنے کے لئے تیار کیا تھا"(افسیوں ۱۰:۲)۔اور شرع الہٰی کے مطابق چلنے ہی کا دوسرا نام اعمالِ حسنہ(نیکی کے کام)ہے۔کتب مقدسہ کیا ہیں؟ شرع الہٰی! شرع الہٰی کیا ہے؟ خُدا کے احکام وفرامین اور اوامر ونواہی کا مجموعہ! یہ شرعِ الہٰی کس کے لئے ہے؟ اِنسان کے لئے! کیا اِنسان اس پر پورا عمل کرتا یا کرسکتا ہے یا نہیں؟ اس سوال کا جواب اس جگہ دیا جائے گا۔اگر اعمالِ حسنہ وحصولِ نجات کی شرط قرار دیا جائے تو اس صورت میں اِنسان سے شریعت کی کامل فرماں برداری مطلوب ہے۔ایسی کامل اور بے نقص نیکی جس میں گناہ کا قطعی امکان نہ ہو۔اگر کوئی ایسا کرنے پر قادر ہو تو اُس کو توبہ واستغفار کی ذرا بھی حاجت نہیں وہ بلا روک ٹوک سیدھا جنت میں جاسکتا ہے۔اور ایسے کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ"تندرستوں کو حکیم درکار نہیں"۔اور وہ خُدا کی بخشش کا بھی محتاج نہیں۔ بلکہ نجات کو اُس نے اپنی ذاتی قوت سے خود کما کر اپنا حق بنا لیا ہے۔ جس سے کوئی اُسے محروم نہیں رکھ سکتا۔"کام کرنے والے کی مزدوری بخشش نہیں بلکہ حق سمجھی جاتی ہے"(رومیوں ۴:۴)۔اس سے ایک بات یہ حاصل ہوتی ہے کہ خُدا کی بخشش کوئی شئے نہیں اور نہ اِنسان اُس کی رحمانیّت کی ضرورت رکھتا ہے کیونکہ جب نجات اعمال سے کمائی جاسکتی ہے تو خُدا کے رَحم

وفضل سے فائدہ اُٹھانے کی احتیاج ہی نہیں رہتی۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اِنسان کی واقعی ایسی مبارک حالت ہے کہ وہ جُزی وکلی طور پر من وعن شریعت پر عمل کر سکتا ہے؟ مشاہدہ اور تجربہ نوعی (بنی آدم) کی بناپر کوئی اس سوال کا جواب اثبات میں دینے کے قابل نہیں ہے۔ مسئلہ گناہ کے بیان میں ہم نے بدیہی (ظاہر) دلائل سے اس حقیقت کو ثابت کر دیا ہے کہ کوئی فردِ بشر گناہ کی قید سے آزاد نہیں ہے۔ مرضِ گناہ ہمہ گیر ہے اور یہ بھی ثابت کر دیا کہ اِنسان اپنی تجاویز وعوامل کے ذریعے اُس کی قیود سے ہرگز آزاد نہیں ہو سکتا۔ جیسے جسمانی صحت جسم کی اصل حالت ہے نہ کہ بیماری اور بیماری کی مدافعت کی تدابیر سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ مریض کو اصل حالت پر لایا جائے۔ اسی طرح رُوح کی اصل پاکیزگی اور گناہ ایک غیر فطری شے اور رُوحانی مرض ہے۔ اس سے رہائی پانا بھی ضروری اور اصلی فطرت کا واجبی تقاضا ہے۔ اور گناہ کی طبیعت سے آزادی اور نیک وپاک طبیعت کا حصول ہی نجات ہے۔ مسیحیت کے علاوہ قریب قریب تمام مذاہب وفلسفے اعمالِ حسنہ کو نجات کی شرط قرار دیتے ہیں۔ لیکن انجیلی فلسفہِ نجات اُن کے بالکل برعکس ہے۔

۱۔ غیر مذاہب کا عقیدہ ہے کہ نیک اعمال کرنے سے نجات حاصل ہوتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ نیک اعمال شرط اور نجات مشروط ہے۔

۲۔ مسیحی مذہب کا عقیدہ ہے کہ نجات حاصل ہونے سے نیک اعمال ہو سکتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ نجات شرط اور نیک اعمال مشروط ہیں۔

نجات کے معنی ہی گناہ کی قیود سے آزاد ہونا ہے۔ اس لئے جب تک گناہ کی طبیعت سے کامل رہائی نہ ہے نیک اعمال کرنا محال ٹھہرے گا۔ دوسری بات قابلِ غور یہ ہے کہ جب حضرت ابوالبشر (آدم) سے باوجود ایک ہی گناہ سرزد ہونے کے یہ نہ ہو سکا کہ حقیقی نیکی (اعمال حسنہ) کرکے دوبارہ جنت العدن (خُدا کی قُربت) کو حاصل کر لیتا تو اب مدتوں تک طبائع اِنسانی کے ساتھ عناصرِ گناہ کے باہم تاثر وتاثیر اور انجذاب وتجذیب (جذب کرنا یا ہونا) کرتے رہنے کے بعد کہاں ممکن ہے کہ اِنسان ضعیف البیان (کمزور آدم) اور پتلہ سہو ونسیان (بھول چُوک) حقیقی نیکی کر سکے۔ جب چندروز کے بخار کے بعد مریض دو من بوجھ اُٹھانے کی استعداد (قابلیت) نہیں رکھتا۔ تو بھلا برسوں مرضِ موذی کے تھپیڑے کھانے کے بعد کہاں ممکن ہے کہ وہ دو من بوجھ اُٹھا سکے۔ جب مصدر اور مخرج (طبع اِنسانی) ہی ناپاک ہے تو اُس سے نیکی وپاکی کا صدور چہ معنی وارد؟ "کیا کھاری چشمے سے آبِ شریں برآمد ہو سکتا ہے؟" (یعقوب ۱۲:۳)۔ گناہ آلود طبیعت سے بے نقص نیکی کا صدور ایسا ہی محال ہے جیسے جُون اور دسمبر کے مہینوں کو ملا کر ایک مُعتدل موسم پیدا کرنا محال ہے۔ پس اعمالِ حسنہ کو نجات کی شرط قرار دیان باطل ٹھہرا۔ اور خُدا کی یہ آواز ہے کہ " شریعت کے اعمال سے کوئی بشر راستباز نہ ٹھہرے گا" (گلتیوں ۱۶:۲)۔ اور گناہ سے نجات حاصل کئے بغیر شریعت پر عمل کرنا ہی ناممکن ہے۔ "کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ شریعت تورُوحانی ہے مگر میں جسمانی اور گناہ کے ہاتھ بکا ہوا ہوں" (رُومیوں ۱۴:۷)۔ اور اگر فرامینِ الٰہی پر عمل کرنے کے لئے کمرہمت کس بھی لیتا ہے اور چند نیک کام کرکے اپنے دل میں خوش ہوتا ہے۔ تو آوازِ الٰہی یہ کہہ کر اُس کی کمرہمت کو توڑ دیتی ہے کہ ابھی "ایک بات کی تجھ میں کمی ہے" (مرقس ۲۱:۱۰)۔ "کیونکہ زمین پر کوئی ایسا راستباز اِنسان نہیں کہ نیکی ہی کرے اور خطا نہ کرے" (واعظ ۲۰:۷)۔

خُدائے قدوس وبرحق جو نیکی وپاکیزگی کا سرچشمہ ہے ہم سے ایسی بے نقص لیبے داغ اور کامل نیکی طلب کرتا ہے جس میں "ایک بات کی بھی کمی نہ ہو"۔ اور اس قسم کی اعلیٰ درجہ کی پاکیزگی ونیکی کا نمونہ خُداوند مسیح کی بیداغ رفتار وگفتار اور بے عیب زندگی میں ملتا ہے۔ ایسی نیکی بلاشبہ نجات کا استحقاق (حق) دلا سکتی ہے۔ مگر کون ایسی نیکی کا سرمایہ دار ہے؟ کوئی بھی نہیں۔ یہ مانا کہ بعض خُداپرست اور پرہیزگار لوگ عملی وفعلی گناہوں سے کسی حد تک بچے رہ سکتے ہیں۔ لیکن ارادی اور خیالی گناہوں سے کسی کو تنزہِ تام (تمام عیبوں سے پاک ہونا) حاصل نہیں ہے۔ چوری، خون ریزی، حق تلفی، بدگوئی اور بددیانتی وغیرہ بدافعال تو گناہ کا عملی ظہور ہیں۔ گناہ اِنسان کی طبیعت کو عارض (لاحق ہونا) ہے۔ اگر یہ افعال ظہور میں نہ بھی آئیں تو بھی اِنسان کی طبیعت ک سفلیت وکراہیت کا انکار محال ہے۔ گناہ کا منبع اِنسان کے اعماقِ قلب (دل کی گہرائی) میں ہے۔ اور خُدا باطن کی صفائی چاہتا ہے نہ کہ ظاہر

کی۔ ''دیکھ تو باطن کی سچائی پسند کرتا ہے'' (زبور ۶:۵۱)۔اس لئے خُدا ہماری باطنی ناپاکی۔ بداندیشی اور بدخیالی سے سخت نفرت کرتا ہے۔ جب تک اِنسان اور خُدا میں طبعی مطابقت و موافقت نہ ہو جائے اِنسان خُدا کو پسند نہیں آسکتا۔ اِنسان کا ارادہ کیسا ہی نیک کیوں نہ ہو۔ پھر کبھی اُس سے طبعی ناپاکی کا ازالہ محال ہے۔ ''کیونکہ میں جانتا ہوں کہ مجھ میں یعنی میرے جسم میں کوئی نیکی بسی ہوئی نہیں۔ البتہ ارادہ تو مجھ میں موجود ہے مگر نیک کام مجھ سے بن نہیں پڑتے۔ چنانچہ جس نیکی کا ارادہ کرتا ہوں وہ تو نہیں کرتا مگر جس بدی کا ارادہ نہیں کرتا اُسے کرلیتا ہوں'' (رُومیوں ۱۸:۷-۱۹)۔ یہ ہے اِنسان کی باطنی مکروہ حالت کی اقرب (بہت نزدیک) الی الفطرت تصویر۔ اکثر لوگ اوامر (وہ فعل جس کا حکم کرنے میں ہو) پر عمل کرتے اور نواہی (وہ فعل جس کا حکم نہ کرنے میں ہو) کو نظر انداز کردیتے ہیں۔ خُدا کہتا ہے کہ ''دُشمنوں سے محبت کرو''۔ یہ امر ہے لوگ اپنے بدخواہوں سے ظاہری محبت کا اظہار کرکے سمجھتے ہیں کہ ہم اپنے اخلاقی فرض سے سبکدوش ہوگئے ہیں۔ پھر خُدا کہتا ہے کہ ''نیکی کرکے جتاو نہ''۔ یہ نہی ہے۔ لیکن اس پر عمل درآمد نہیں کیا جاتا۔ بعض اوامر کی تعمیل کرتے اور نواہی کو ٹال دیتے۔ اور بعض نواہی کو مان لیتے اور اوامر کو نظر انداز کردیتے ہیں۔ اور کلام کا فرمان ہے کہ ''جو کوئی بھلائی کرنی جانتا ہے اور نہیں کرتا اُس کے لئے یہ گناہ ہے'' (یعقوب ۱۷:۴)۔ ایسی جامع اور کامل نیکی اِنسان سے ہرگز نہیں ہوسکتی۔ ''کیونکہ جس نے ساری شریعت پر عمل کیا اور ایک ہی بات میں خطا کی وہ ساری باتوں میں قصور وار ٹھہرا۔ اس لئے کہ جس نے یہ کہا کہ زنا نہ کر۔ اُسی نے یہ بھی کہا کہ خون نہ کر۔ پس اگر تونے زِنا تو نہ کیا مگر خون کیا تو بھی تو شریعت کا عدول کرنے والا ٹھہرا'' (یعقوب ۱۰:۲-۱۱)۔ یہ درست ہے کہ نیک عمل کرنا ہر اِنسان کا فرض ہے۔ لیکن یہ غلط ہے کہ نجات نیک اعمال سے حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے جو لوگ اعمالِ حسنہ کو حصول نجات کی لازمی شرط قرار دیتے ہیں اُن کے متعلق انجیلِ مقدس کا یہ فرمان ہے کہ ''جتنے شریعت کے اعمال پر تکیہ کرتے ہیں وہ سب لعنت کے ماتحت ہیں۔ چنانچہ لکھا ہے کہ جو کوئی اُن سب باتوں کے کرنے پر قائم نہیں رہتا جو شریعت کی کتاب میں لکھی ہیں۔ وہ لعنتی ہے'' (گلتیوں ۱۷:۳)۔ شریعت سے گنہگار کو کوئی فائدہ نہیں بلکہ نقصان ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ اُس کی مددگار نہیں بلکہ مجرم ٹھہرانے والی ہے۔ ایک خُونی جب خون کرچکا تو تعزیرات ہند سے اُس کو کیا حاصل ہوتا ہے؟ وہ اُسے مجرم ٹھہرا کر موت کا فتویٰ اُس پر لگاتی ہے۔ ''کیونکہ شریعت تو غضب پیدا کرتی ہے اور جہاں شریعت نہیں وہاں عدول حکمی بھی نہیں'' (رومیوں ۱۵:۴)۔ شریعت ساہول ہے۔ جس طرح ساہول دیوار کا ٹیڑھا پن دِکھا سکتا ہے اور اُس کو سیدھی نہیں کرسکتا۔ اسی طرح شریعت اِنسان کی کجروی (ٹیڑھی چال چلنا) کو ظاہر کرسکتی ہے اور اُس کی درستی واصلاح ہرگز نہیں کرسکتی۔ شریعت آئینہ ہے جس طرح آئینہ چہرے کے بدنما داغ دِکھا دیتا ہے پر اُن داغوں کو دور نہیں کرسکتا۔ اسی طرح ''شریعت کے وسیلے تو گناہ کی پہچان ہی ہوتی ہے'' (رومیوں ۲۰:۳؛ یعقوب ۲۳:۱-۲۴)۔ شریعت ترازو ہے۔ ترازو کسی وزن کی کمی بیشی کو ظاہر کردیتا ہے لیکن خود اُسے پورا نہیں کرسکتا۔ اس لئے شریعت کا فرمان گنہگار اِنسان کے حق میں یہ ہے کہ ''تو ترازو میں تولا گیا اور کم نکلا'' (دانی ایل ۲۷:۵)۔ شریعت چراغ ہے۔ ''کیونکہ فرمان چراغ ہے اور تعلیم نور'' (امثال ۲۳:۶؛ زبور ۱۰۵:۱۱۹)۔ اگر چراغ کورات کے وقت کسی گندے اور غلیظ مکان میں لایا جائے تو وہ اُس کی گندگی اور غلاظت وغیرہ کو ظاہر کردیتا ہے اُسے دور نہیں کرسکتا۔ اسی طرح شریعت چراغ کی مانند انسان کی باطنی گناہ آلودہ مکروہ حالت سے اُسے آزاد نہیں کرسکتی۔ جس طرح تھرمامیٹر صرف یہ دِکھا دیتا ہے کہ بخُار کتنے درجہ کا ہے اور بُخا کو دُور نہیں کرتا۔ اسی طرح شریعت اِنسان پر یہ روشن کردیتی ہے کہ وہ گناہ کا مریض ہے، لیکن مرض گناہ سے آزاد نہیں کرسکتی۔ البتہ وہ گنہگار کو گناہ کا قائل کرکے اور نجات (گناہ سے رہائی) کی ضرورت محسوس کرواکے کسی طبیبِ رُوحانی کا متلاشی بنادیتی ہے اور ''شریعت کے بغیر گناہ مردہ ہے'' (رومیوں ۱۳:۵)۔ چنانچہ شریعت اگر دُنیا جو مُجرم نہیں ٹھہراتی تو اور کیا کرتی ہے؟ اور کیا یہ حماقت نہیں کہ جس شرع (قوانینِ الٰہی) کا عدول کیا اُسی کا پھر سہارا ڈھونڈا جائے؟ جب ایک شخص نے چوری کرلی تو تعزیرات (تعزیر کی جمع، سزائیں) کی عدولی کی۔ اب اگر وہ تعزیرات کی کتاب کو ہاتھ میں لے کر خوشی کے نعرے لگاتا پھرے تو کون ہے جو

اُس کو سڑی اور دیوانہ سمجھے گا؟ جس کتاب پر وہ فخر کرتا ہے وہی اُس کو مجرم ٹھہرا کر تین سال کی سزا دلواتی ہے۔ پس کوئی دھوکے میں نہ رہے۔ کُتب مقدسہ یا شریعت کسی کی حمایت ورعایت نہ کرے گی اور وہ کمزور ہونے کے باعث گنہگار کی مدد کرنے میں قاصر ہے۔ ''اس لئے کہ جو کام شریعت جسم کے سبب کمزور ہو کر نہ کرسکی وہ خُدا نے کیا'' (رومیوں ۸:۳)۔ کیونکہ اگر کوئی ایسی شریعت دی جاتی جو زندگی بخش سکتی، تو البتہ راست بازی شریعت کے سبب سے ہوتی''۔ ''مگر کتابِ مقدس نے سب کو گناہ کا ماتحت کر دیا'' (گلتیوں ۲۱:۳-۲۲)۔ پس شریعت زندگی نہیں بخش سکتی بلکہ سب کو ایک ساتھ مجرم ٹھہرا کر غضبِ الٰہی کے ماتحت کرتی ہے اور کہتی ہے۔ ''اس لئے کہ سب نے گناہ کیا اور خُدا کے جلال سے محروم ہیں'' (رومیوں ۲۳:۳)۔

اب شاہد کوئی کہے کہ پھر تو شریعت بہت بُری چیز ہے جو انسان کے ساتھ ایسا شدید ظالمانہ برتاو کرتی ہے۔ اور سب کو غضبِ الٰہی کے ماتحت کر کے سزاوار دوزخ بناتی ہے۔ جنابِ من! شریعت ہر گز بُری نہیں بلکہ شریعت کو عدول کرنے والے بُرے ہیں۔ جس طرح تعزیرات ہند (حکومت ہند کی فوج داری کی سزائیں) بُری چیز نہیں بلکہ چور، زانی، فریبی، باغی، خونی اور ظالم بُرے ہیں۔ آئینہ بُرا نہیں زنگی (حبشی، شیدی) کی شکل بُری ہے۔ بخار کے مریض کی طبیعت بگڑ جانے کے باعث اُس کو پانی اور کھانا کڑوے معلوم ہوتے ہیں۔ پر در اصل پانی اور کھانے میں کوئی نقص نہیں ہوتا بلکہ مریض کی اپنی طبیعت میں فساد کے باعث وہ کڑوے معلوم ہوتے ہیں۔ اسی طرح اگر مریضانِ گناہ کو شریعتِ الٰہی خلافِ طبع اور بُری معلوم ہو تو کیا تعجب ہے۔ یہ اُن کی اپنی روحانی فطرت کے فساد کا نتیجہ ہے۔ شریعت گنہگار کے لئے اس لئے فائدہ مند نہیں کہ وہ اُس کی اپنی حالت اور طبیعت کے مخالف ہے۔ مثلاً سورج اچھی چیز ہے پر الو کو اُس سے کچھ فائدہ نہیں۔ بجلی کی روشنی اچھی چیز ہے مگر اندھے کو اُس سے کیا فاعدہ ہو سکتا ہے۔ موسیقی ایک رُوح پرور اور جان نواز شئے ہے مگر بہرہ اُس سے لُطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ ''مگر ہم جانتے ہیں کہ شریعت اچھی ہے۔ بشر طیکہ کوئی اُسے شریعت کے طور پر کام میں لائے۔ یعنی یہ سمجھ کر کہ شریعت راست بازوں کے لئے مقرر نہیں ہوئی۔ بلکہ بے شرع اور سرکش لوگوں اور بے دینوں اور گنہگاروں اور ناپاکوں اور زندوں اور ماں باپ کے قاتلوں اور خونیوں اور حرام کاروں اور لونڈے بازوں اور بردہ فروشوں اور جھوٹوں اور جھوٹی قسم کھانے والوں اوران کے سوا صحیح تعلیم کے اور برخلاف کام کرنے والوں کے واسطے ہے'' (۱۔ تیمتھیس ۸:۱-۱۰)۔ پس شریعت تو گناہ کی کراہیت کو انسان پر روشن کرتی ہے اور گناہ کو مٹا نہیں سکتی۔ ناظرین سے درخواست ہے کہ وہ (رومیوں ۷:۷-۲۵)۔ تک ضرور غور سے مطالعہ کریں۔ شریعت خُدا کی طبیعت اور مرضی کا آئینہ ہے۔ اور اُس کا ایک ادنیٰ سے ادنیٰ تجاوز بھی سزا لازمی ٹھہراتا ہے۔ جس نے شریعت کے تمام احکام کا عدول کیا وہ خُدا کا مخالف ٹھہرا۔ اور جس نے صرف ایک حکم سے تجاوز کیا وہ بھی مخالفِ خُدا ٹھہرا۔ پس اَے ناظرین اعمالِ حسنہ سے نجات کی اُمید رکھنا اپنے آپ کو فریب دینا ہے۔

اہلِ سلام کا خیال ہے کہ ''نیکیاں دور کرتی ہیں بدیوں کو'' (سورۃ ہود آیت ۱۱۵)۔ چونکہ یہ مضمون ہمارے اس مبحث (بحث) سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے مناسب ہے کہ ہم اس جگہ اس خیال کو بھی پرکھیں۔ اور دیکھیں کہ نیکیوں کو بدیوں کا مبادلہ ٹھہرانا نیکیوں کے ذریعے بدیوں کو مٹانا کہاں تک ممکن ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نیکی کرنا ہر اِنسان کا فرض ہے۔ مگر یہ خیال خلافِ عقل ہے کہ ''نیکیاں بدیوں کو دور کرتی ہیں''۔ کیونکہ جہاں تک اِنسان نیکی کرتا ہے وہ اپنا واجبی فرض ادا کرتا ہے نہ کہ کچھ زائد الفرض۔ نیکی کرنا تو اِنسان کا فرض عین ہے۔ نہ کہ خُدا پر احسان۔ ''اگر تو صادق ہے تو اُس کو کیا دے دیتا ہے۔ یا اُسے تیرے ہاتھ سے کیا مل جاتا ہے؟'' (ایوب ۷:۳۵)۔ خُداوند مسیح نے فرمایا۔ ''تُم بھی جب اُن سب باتوں کی جن کا تمہیں حکم ہوا تعمیل کر چکو۔ تو کہو کہ ہم نکمے نوکر ہیں۔ جو ہم پر کرنا فرض تھا وہی کیا ہے'' (لوقا ۱۰:۱۷)۔ گناہ اپنی جگہ رہ کر انسان کو مجرم ٹھہراتا ہے اور نیکی اپنی واجبی جگہ پر رہ کر محض ادائیگی فرض ہے۔

نہ کہ زائدالفرض کام۔فرض کروکہ ایک شخص ایک وقت دیانتداری سے دس روپے کماتاہے۔اور دوسرے وقت بدیانتی سے دس روپے چُرالیتاہے توعدالت اُس کواس خیال سے رہانہ کرے گی کہ اُس نے چوری سے پہلے دس روپے محنت کرکے کمائے تھے۔یااسی مثال کواُلٹ کرلوکہ پہلے وہ دس روپے چرائےاوراُس کے بعد ہی محنت سے دس روپے کمالے۔تواُس کاموخر(آخرکار)فعل مقدم فعل کابدل نہیں ہوسکتا۔اُس کی نیک کمائی سے حاکم پرکچھ احسان نہیں ہوا۔بلکہ اُس کاذاتی فائدہ ہوا۔لیکن اُس کی چوری اُس کی سزاکاموجب ٹھہری۔دونوں قسم کے نیک وبدافعال ایک دوسرے کابدل نہیں ہوسکتے۔بلکہ اپنی اپنی جگہ پررہ کریاتومُجرم ٹھہراتے ہیں اوریابے قصور۔تعزیرات ہندپرعمل کرناہرہندوپاکستانی فرض ہے نہ کہ زائدالفرض کام۔عاملِ تعزیرات کاسرکارانعام نہیں دیتی لیکن قانون شکن(قانون توڑنے والا)کوضرورسزادیتی ہے۔اگریہ درست مان لیاجائے کہ نیکیاں بدیوں کودورکرتی ہیں تووہ چورراست بازسمجھاجاناچاہئے جوچوری کرکے اُسی مال مسروفہ میں سے کچھ حصہ غرباء کوخیرات کردیتا۔یامسجدومندرکی تعمیرپرلگاتاہے۔ایک کسبی(فاحشہ)اگراپنی ناپاک آمدنی میں سے ایک خاص رقم کسی مسجدکی مرمت پرخرچ کرتی یامحتاجوں کوکھاناکھلادیتی ہے توکیااُس کی ایسی خیرات اُس کی حرام کاری کے گناہ کودورکرسکتی ہے؟اورکیاخُدااُس کی پلیداورنفرتی حالت کے باوجودصرف ایسی گناہ آلودہ نیکی کے عوض میں اُسے جنت میں داخل کرلے گا؟اگرنیکیاں یہی ہیں توکسی کودوزخ کے خیال سے حواس باختہ نہ ہوناچاہیئے۔کیونکہ اس صورت میں یقیناً حصول نجات کے کام سے آسان ترکام دُنیامیں کوئی نہیں ہے۔اَے ناظرین!اگرآپ ایسے بےبُنیادخیالات کے حامی ہیں تویقیناً آپ اپنی جانوں پرظلم کررہے ہیں۔نجات کے صراط المستقیم (سیدھاراستہ)کوچھوڑکرایک ہلاکت خیزراستہ پرگامزن ہیں۔

پھریہ بھی یادرکھنے کے لائق بات ہے کہ نجات سے صرف بہشت کی خوشیاں ہی مراد نہیں ہیں۔بلکہ نجات کے معنی ہیں ناپاک طبیعت سے رہائی اورپاک طبیعت کاحصول۔بہشت کی رُوحانی وغیرفانی خوشیاں تونجات کے ساتھ مشروط ہیں۔یعنی بہشت(قُربتِ الٰہی)میں داخل ہونے سے پیشتر پاک طبیعت(نجات)کوحاصل کرلیناضروری ہے تاکہ اِنسان اورخُداکی طبائع(طبیعت کی جمع،طبیعتیں)میں مطابقت قائم ہوجائے۔ہمارے اس دعویٰ کے کہ نجات اعمالِ حسنہ سے حاصل نہیں ہوسکتی۔یہ معنی ہوئے کہ نیک اعمال کرنے سے پاک طبیعت(نجات)حاصل نہیں ہوتی۔بلکہ اگرپاک طبیعت حاصل ہوجائے تونیک اعمال خودبخودلازمی نتیجہ کے اُس سے صادرہوں گے۔اوریہ بھی یادرکھیے کہ صرف گناہ کے نتائج(سزائے دوزخ)سے بچناہی نجات نہیں۔بلکہ خودگناہ کے قبضہ سے ناپاک طبیعت سے آزادہونانجات ہے۔اب شائدکوئی یہ کہے کہ نجات تواعمالِ حسنہ کے ساتھ مشروط ہے۔اوراگر کچھ بدیاں بھی ہوتی رہیں توخُدارحیم وآمرزگارہے وہ اُن کوبخش دے گا۔اورنیکیوں کونجات کے حسابِ میں محسوب کرلے گا۔تو واضح ہوکہ کوئی فخراعمال کے ساتھ خُداکے رحم وبخشش کااُمیدوارہوتووہ رحم کاحقدارنہیں۔رحم کاحقداروہ ہوسکتاہے جوواقعی قابلِ رحم ہو۔اورجواپنی لاچاری وبےکسی کااظہارخُدا کے سامنے یوں کرکے کہ "اَے خُداوندکریم۔توجورحم وفضل کاسرچشمہ ہے مجھے اپنے فضل ہی سے نجات دے"۔کیونکہ میرے اپنے اعمال اس قابل نہیں کہ میں اُن کے ذریعے نجات کاحقدارہوسکوں"۔اگرنجات کونیک اعمال کے ساتھ مشروط ٹھہرایاجائے تواس کامحال ہوناہم اچھی طرح ثابت کرچکے اوراگرفضل سے مانوتواعمالِ حسنہ کوشرطِ نجات ٹھہرانامحال ہوگاکیونکہ "اگرفضل سے برگزیدہ ہیں تواعمال سے نہیں۔ورنہ فضل فضل نہ رہا" (رومیوں۱۱:۶)۔اگرکوئی اس تمام بیان سے یہ نتیجہ نکالے کہ ہم نے اعمالِ حسنہ کوبُراقراردے کراُن سے پرہیزکرنے کی ہدایت کی ہے۔تووہ سخت غلطی میں مبتلاہے۔اوراُس نے ہمارے منشاء(خواہش)کوسمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔واضح ہوکہ نیک اعمال کرناہراِنسان کافرض عین ہے۔حق اِنسانیت ہے اوراگرکوئی نیکی سے نفرت کرے تووہ ضرورگناہ کوپیارکرتاہےاورایساشخص خُداکامخالف ہے۔لیکن ساتھ ہی یہ بھی یادرکھیں کہ نجات اعمال حسنہ کاپھل نہیں ہے۔بلکہ اعمال حسنہ نجات کاپھل ہیں۔اس لئے جب تک نجات(گناہ سے رہائی)حاصل نہ ہوحقیقی نیکی اِنسان سے نہیں ہوسکتی۔اورگناہ آلودہ

طبیعت سے رہائی (نجات) حاصل کرنا اِنسانی کوشش سے محال ہے۔ اعمالِ حسنہ سے نجات کے امکان کا سامعہ فریب جُملہ ہماری تسلی نہیں کر واسکتا۔ اس لئے اس غلط خیال کو پہلی فُرصت میں اپنے ذہن ودِل سے خارج کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

توبہ محض

مذہبیات میں توبہ کا درجہ تمام باتوں سے افضل ہے اور طالبِ نجات کے لئے از بس ضروری ہے کہ وہ اپنے گناہوں سے توبہ کر کے خُدا کی طرف مائل ہو۔ جب گنہگار انسان شریعت کی روشنی میں اپنی باطنی مکروہ حالت کو دیکھتا ہے تو اُس کو اپنی اُس حالت سے نفرت ہو جاتی اور وہ اپنے گناہوں سے دل شکستہ ہو کر پچھتاتا اور آیندہ اُس حالت میں رہنا نہیں چاہتا۔ بلکہ اُس سے آزاد ہونا چاہتا ہے۔

ایوب نبی فرمایا ہے "اس لئے مجھے اپنے آپ سے نفرت ہے۔ اور میں خاک اور راکھ میں توبہ کرتا ہوں" (ایوب ۶:۴۲)۔ اور خُدا توبہ سے بہت خوش ہوتا اور تائبِ دلوں کو پسند کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو (یسعیاہ ۷:۵۵؛ حزقی ایل ۲۱:۱۸-۲۳؛ یوایل ۱۲:۲-۱۳؛ ملاکی ۷:۳؛ لوقا ۱۷:۱۵؛ اعمال ۱۹:۳؛ ۲۔کرنتھیوں ۱۰:۷؛ ۲۔ پطرس ۹:۳)۔ توبہ ایک ایسی چیز ہے جو خُدا کے رحم وفضل کو جوش میں لاتی ہے۔ لیکن اگر کوئی گناہ پر اس لئے کمر بستہ ہو جائے کہ وہ دم نزع (قریب المرگ، مرتے ہوئے) توبہ کر کے نجات کا حقدار ہو جائے گا تو جان لیجئے کہ وہ ایک سنگین غلطی میں مبتلا ہے۔ توبہ کے معنی میں سابقہ بد کرداریوں پر پچھتانا اور آیندہ اُن سے باز رہنے کا تہیہ کرنا۔ توبہ محض حصولِ نجات کے لئے کافی نہیں ہے۔ قوانینِ طبعیہ کا مقنن (قانون بنانے والا) خُدا تعالیٰ ہے۔ اس لئے وہ خُدا کی ذاتی طبیعت کے مخالف نہیں بلکہ مطابق ہیں۔ اور اُن سے خُدا کی صفت ِعدل کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر قوانینِ طبعیہ کو خُدا کی طبیعت کے نقیض (اُلٹا، مخالف) مانا جائے تو خُدا اُن کا مقنن ہر گز نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ایک نقیض دوسرے نقیض کی علت نہیں ہو سکتا۔ اب فرض کیجئے کہ ایک شخص قانون کشش زمین سے اس صورت میں تجاوز کرے کہ کسی بلندی سے اپنے آپ کو گرادے تو اُس کی ٹانگ ٹوٹ جائے گی۔ اب اگر وہ اپنے اس فعلِ ناکردنی (نہ کرنے کے لائق کام) پر متاسف (افسوس کرنے والا) ہو کر پچھتائے اور آیندہ ایسے فعل سے باز رہنے کا تہیہ کرے اور احتیاط کو کام میں لائے تو اُس کی اس توبہ اور پچھتاوے سے اُس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ تو بحال نہ ہو جائے گی، بلکہ تادمِ مرگ وہ لنگڑا رہے گا۔ ہاں اگر آیندہ محتاط رہے تو مزید نقصان سے بچا رہے گا۔ اسی طرح توبہ محض سے گذشتہ گناہوں کا فدیہ نہیں ہو سکتا۔ کوئی ہزار روپے کا قرضدار ہے اور بباعث ناداری (غریبی کی وجہ) ادا کرنے کے ناقابل ہے۔ اب وہ پچھتاتا ہے کہ کیوں قرض لیا۔ لیکن اس پچھتاوے سے اتنا تو ہو سکتا ہے کہ وہ آیندہ کو قرض سے احتراز (کنارہ کشی، پرہیز) کرے۔ تاہم توبہ سے ہزار روپیہ کو قرض دور نہیں ہو سکتا۔ وہ ادا کرے اور آیندہ قرض سے پرہیز کرے۔ پس اِنسان کے توبہ سے پہلے کے گناہوں کو خُدا عدل میں لائے گا۔ کیونکہ "خُداوند قہر کرنے میں دھیما اور قدرت میں بڑھ کر ہے۔ اور مجرم کو ہر گز بری نہ کرے گا" (ناحوم ۳:۱؛ خروج ۷:۳۴)۔ اور یہ بھی ناممکن ہے کہ کسی تائب کی بعد کی زندگی ایسی بے نقص، بے داغ اور کامل ہو کہ جس میں خطا کا مطلق امکان نہ رہے۔ سابقہ قرض اِنسان ادا نہیں کر سکتا اور توبہ کے بعد کامل نیکی اُس سے صادر نہیں ہو سکتی تو کس صورت خُدائے قدوس وتبارک وتعالیٰ سے ملاپ ممکن ہے؟ لہٰذا توبہ محض سے جُدائی کی وہ سنگین دیوار جو گناہ کے باعث اِنسان اور خُدا کے درمیان حائل ہے ٹوٹ نہیں سکتی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ توبہ کرنا بُرا کام ہے۔ ہر گز نہیں بلکہ نجات کو مشروط بالتوبہ محض ماننا غلطی ہے۔ ہم آغاز ہی میں عرض کر چکے کہ مذہب میں توبہ سے بہتر کوئی شے نہیں۔ جس طرح نیکی کرنا ہر اِنسان کا فرض ہے اُسی طرح توبہ کرنا بھی ہر گنہگار کے لئے ضروری ہے۔ توبہ کے ذریعے ہم نجات کو اپنا حق نہیں بنا سکتے، بلکہ خُدا اپنے رحم وفضل سے ہمیں اُس کے حقدار بنا

سکتا ہے۔اور تائب اِنسان خُدا کی بخشش کا اُمیدوار تو ہو سکتا ہے مگر حقدار نہیں ہو سکتا۔ ’’پس توبہ کرو اور رجوع لاؤ۔ تاکہ تمُہارے گناہ مٹائے جائیں اور اِس طرح خُداوند کے حضور سے تازگی کے دن آئیں‘‘ (اعمال ۳:۱۹)۔ توبہ نجات کی تمہید ہے۔ توبہ ابتدا اور نجات اُس کی انتہا ہے بشرطیکہ توبہ حقیقی ہو۔

عدل ورحم

خُدا عادل ہے رحیم ومہربان بھی، اُس کی جتنی بھی صفات ہیں وہ سب ذاتی اور قدیم ہیں اکتسابی اور حادث نہیں۔ وہ کبھی اپنی ایک صفت کو چھوڑ کر دوسری صفت کا اظہار نہیں کرتا۔ جب وہ کسی پر رَحم فرماتا ہے تو عدل کو چھوڑ کر رَحم نہیں فرماتا۔ بلکہ اُس کا رحم وعدل دوش بدوش (کندھے سے کندھا ملا کر) چلتے ہیں۔ ’’لیکن جو فخر کرتا ہے اُس پر فخر کرے کہ وہ سمجھتا اور مجھے جانتا ہے۔ کہ میں ہی خُداوند ہوں جو دُنیا میں شفقت وعدل اور راست بازی کو عمل میں لاتا ہوں۔ کیونکہ میری خوشنودی اِن ہی باتوں میں ہے۔ خُداوند فرماتا ہے‘‘ (یرمیاہ ۹:۲۴)۔ آپ اپنی تمام فصاحت وبلاغت کو تمام فلسفہ ومنطق کو صرف کر دینے کے باوجود بھی خُدا کی صفات کو ہرگز تبدیل نہیں کر سکتے۔ خُدا عادل ہے اور اُس کی صفت عدل ہرگز رَحم میں تبدیل نہیں ہو سکتی۔ خُدا رَحیم ہے اور اُس کی صفتِ رحمانیت ہرگز عدل میں تبدیل نہیں کی جا سکتی۔ جس طرح خُدا کا سمیع وبصیر ہونا واحد مفہوم نہیں رکھتا، اُسی طرح عدل ورحم کا مفہوم واحد نہیں۔ اور اسی طرح خُدا کا عادل ہونا اور بات ہے رحیم ہونا اور بات۔ اور دونوں صفات کا تقاضا پورا ہونا ضروری ہے۔ خُدا کی یہ دونوں صفاتِ اپنا اپنا عمل برمحل (موقع پر) دکھاتی ہیں۔ اگر گناہ وسزا لازم وملزوم ہیں تو کوئی شخص بھی سزائے دوزخ سے بچ نہیں سکتا۔ اگر لازم ملزوم نہیں تو سزا اور عدالتِ الٰہی کا انکار لازم آئے گا۔ اور گناہ کوئی مکروہ اور قابلِ نفرت شے نہ رہے گا۔ اِس صورت میں ایک تو عدلِ الٰہی پر دھبہ پڑتا ہے اور دوسرے راستبازوں وخُدا ترسوں کو راہِ خُدا میں ریاضت کرنا اور دُکھ اُٹھانا فضول اور لاحاصل ٹھہرتا ہے۔ اور کوئی گنہگار گناہ سے ہرگز نفرت نہیں کر سکتا۔ پس گناہ وسزا ضرور لازم وملزوم ہیں۔ اسی واسطے سب دُنیا عدلِ الٰہی کے ماتحت سزائے دوزخ کی مستحق ہے۔ اگر خُدائے عادل گنہگار کو بلا معاوضہ مُعاف کرے تو وہ عادل نہ رہا بلکہ راحم (رحم کرنے والا) محض۔ اگر عدل کرے تو تمام دُنیا سزائے دوزخ کی مستحق ہے۔ ایک بھی بچ نہیں سکتا۔ اور خُدا عادل محض ٹھہرا۔ بے شک رَحم کا درجہ عدل سے افضل ہے (یعقوب ۲:۱۳)۔ تاہم حقیقی راحم کے لئے عادل ہونا شرط ہے۔ یعنی رحم بلا عدل نہ صرف راستی نہیں بلکہ ظُلم ہے۔ مثلاً زید نے تلوار سے بکر کا بازو کاٹ دیا اور بکر نے عدالت میں زید پر نالش کر دی۔ اب اگر حاکم ازرُوئے رحم زید کو بلا مبادلہ (بغیر بدلے کے) رہا کر دے تو بکر پر ظُلم ہو گا۔ یعنی زید پر رحم بلا مبادلہ کرنا بکر پر ظلم کرنا ٹھہرے گا۔ اور اگر زید کو سزا دے تو یہ محض عدل ہو گا۔ کیونکہ مجرم کو سزا دینا کوئی رَحم نہیں۔ عدل کے معنی ہیں طرفین کے حالات کو اعتدال (درمیانی درجہ) پر لانا۔ یعنی ظالم ومظلوم کی حیثیات کو مساوی (معتدل) رکھنا اسی طرح انصاف (مادہ نِصف) کے معنی ہیں نصفا نصفی (آدھا آدھا، آپس میں برابر کی تقسیم) کر دینا۔ تاکہ ظالم ومظلوم کی حیثیات مساوی رہیں۔ پس اگر خُدا اِنسان کے کل گناہ کا بدلہ لے تو یہ عدل ہی ہو گا۔ اور اگر بلا مبادلہ سب کو بری کر دے تو یہ رَحم بلا عدل ہو گا۔ اگر کچھ گناہوں کا بدلہ لے اور کچھ معاف کر دے تو یہ عدل نہ ہو گا نہ رحم۔ اب ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے کہ تقاضائے عدل بھی پورا ہو اور گنہگار پر رَحم بھی ہو۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ذاتِ راحم اپنی طرف سے کچھ ایثار کرے۔ کیونکہ رحیم ہونے کے لئے ایثار (دوسرے کو اپنے نفع پر ترجیح دینا) شرط ہے۔ یعنی اگر حاکم مجرم پر رَحم کرنا چاہئے تو ضرور ہے کہ اُس کا فدیہ (معاوضہ) اپنی طرف سے دے اور یہی اُس کا ایثار ہو گا۔ خُدائے عادل ورحیم کے اس ایثار کا پورا بیان آگے چل کر ’’نجات بالکفارہ‘‘ کے زیر عنوان کیا جائے گا۔ جس سے خُدا کی عدالت ورحمانیّت کا بھید ناظرین پر کھل جائے گا۔ اصل مقصد کو سمجھنے کے لئے خیالات کے سلسلے وترتیب کو یاد رکھیں۔

قسری مِلاپ

اب شاہد کوئی یہ سوچے کہ کیوں نہ خُدائے پاک جبری وہ قسری طور پر اپنی قدرتِ کاملہ سے اِنسان کو پاک بنالے اور اپنی قربت سے اُسے قسری طور پر بہرہ اندوز (خوش نصیب) فرمائے۔ واضح ہو کہ اس خیال میں یہ بھی بھاری نقص (کمی) ہے کہ اِنسان کی فعل مختاری قائم نہیں رہتی۔ خُدا نے اُسے فاعل مختار بنایا۔ نیکی وبدی کی تمیز بخشی تاکہ اپنی آزاد مرضی سے دونوں میں سے جس کو چاہے پسند کرے۔ اور اوامر ونواہی (ایسے احکام جن میں نہ کرنے کا حکم ہو) بخش دیئے۔ جن کے عدول کی سزا اور تعمیل کی جزا ٹھہرائی۔ اگر انسان کی فعل مختاری اور آزادی میں دخل دیا جائے تو نیکی نیکی نہ رہے گی اور نہ بدی بدی۔ اور جب نیکی بدی نہ رہی تو عدالت نہ رہی۔ جب عدالت نہ رہی تو سزا و جزا نہ رہی اور دوزخ و بہشت دو ایسے مفہوم ہوں گے جن کا کوئی مصداق (وہ چیز جو کسی کی صفائی ثابت کرے، گواہ) نہ ہو۔ اور خُدا کے احکام در بارہ ترکِ گناہ اور اختیار نیکی باطل ٹھہریں گے۔ اور نجات بے معنی لفظ ہو گا۔ حتیٰ کہ خُدا کی خُدائی سے ہاتھ دھونے پڑیں گے اور پھر اگر خُدا نے اِنسان کو بالجبر ہی پاک وراست بنانا ہوتا آدم وحوا کو اوائل (شروع) ہی میں بنالیتا۔ اور اس موجودہ دِل لگی کی بہ نسبت یہ بہتر ہوتا کہ تمام دُنیا میں یہ مرض نہ پھیلتا۔ فعل مختاری ہی تو ہے جو اِنسان کو تمام مخلوقات سے اشرف ٹھہراتی ہے۔ ورنہ حیوان واِنسان میں کیا مابہ الامتیاز ہوتا اور اس قسم کے اِنسان کو خُدا کی قُربت سے کیا فائدہ ہوتا۔ اگر خوشی ہوتی تو جس قدر ایک بیل کو شاہی محلوں میں رہنے سے ہو سکتی ہے۔ لہٰذا یہ خیال سراسر غیر معقول ثابت ہوتا ہے اور اس سے کنارہ کرنا لازمی ہے۔

طبعی مِلاپ

بالفرض محال اگر ہم یہ مان لیں کہ خُدائے قدوس اِنسان خاطی وعاصی (گنہگار) کو اُس کی گناہ آلودہ طبیعت کے ساتھ ہی اپنی قُربت ورفاقت میں قبول فرمائے گا تو بھی یہ عُقدہ حل نہ ہو گا۔ کیونکہ متضاد طبائع (پاک وناپاک) کے مِلاپ کا انجام خُوشی کی بجائے نفرت ہو گا۔ جس طرح اُلو کی طبیعت کی آفتاب کی تجلی کی ساتھ موافقت ومُناسبت نہ ہونے کے باعث الو کو سورج کی قُربت سے خُوشی کی بجائے دُکھ اور تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ اسی طرح انسان کو ناپاک طبیعت کو خُدائے قدوس کے تقریب سے بجائے مسرت وشادمانی کے انتہائی دُکھ محسوس ہو گا۔ اور ایسے مِلاپ کی بہ نسبت زخارفِ (بھری) دُنیا اور جیفہ (سڑا ہوا، مرِدار) جہان ہی اطمینان بخش اور مسرت افروز معلوم ہوں گے۔ اور خُدا کی قُربت ایک اطمینان سوز اور دلاوز حالت جس میں وہ ایک لمحہ بھر رہنے کی برداشت نہ کر سکے گا۔ جب تک خُدا اور اِنسان کی طبائع میں باہم گر (آپس میں) موافقت ومطابقت تام (تمام) نہ ہو جائے مِلاپ قطعی ناممکن ہے۔ جب تک مغنی (گیت گانے والا) اور ساز کی آواز میں ہم آہنگی نہ ہو مغنی کبھی خُوش نہیں ہو سکتا۔ ایک ڈاکو حاکم کے سایہ سے بھاگتا ہے کیونکہ ڈاکو کی طبیعت اور حاکم کی طبیعت میں اختلاف ہے۔ محبوب اپنے محب اور عاشق اپنے معشوق میں ہمیشہ وہی طبیعت اور خصلت دیکھنا چاہتا ہے جو وہ اپنی ذات میں خود رکھتا ہے۔ رحمدل سنگدل وظالم سے نفرت کرتا ہے۔ خلیق بد خلق کو پسند نہیں کرتا۔ مُنصف مزاج بے انصاف سے راضی نہیں ہوتا۔ پرہیز گار عیاش کے سایہ سے بھاگتا ہے۔ اسی طرح اِنسان اور خُدا کی طبعی ناموافقت کو یسعیاہ نبی یوں بیان کرتا ہے۔ ''تمہاری بدکرداری نے تمہارے اور تمہارے خُدا کے درمیان جُدائی کر دی ہے۔ اور تمہارے گناہوں نے اُسے تُم سے رُوپوش کیا'' (یسعیاہ ۵۹:۲)۔ اب طبعی ملاپ کی دو صورتوں میں سے ایک صورت ہی ممکن ہو سکتی ہے۔

ا۔ خُدا کی طبیعت گناہ آلودہ ہو جائے تاکہ اِنسان کی طبیعت کے ساتھ اُس کی موافقت ہو سکے۔

۲۔ یاانسان کی طبیعت خُدا کی سی پاک ہو جائے تاکہ اُس کی طبیعت کے ساتھ مطابقت ہو سکے۔

توبہ توبہ! خُدائے قدوس وبرتر تو کبھی ناپاک نہیں ہو سکتا۔ یہ اُس کی صفت قدوسیت اور الوہیت کے سراسر منافی ہے۔" یہ ہر گز ہو نہیں سکتا کہ خُدا شرارت کا کام کرے۔اور قادرِ مطلق بدی کرے"(ایوب ۱۰:۳۴)۔اورانسان ضعیف البنیان (کمزور، بنی آدم) جو گناہ کا کیڑا ہے اپنی ذاتی کوشش اور جد وجہد سے پاک ہو نہیں سکتا۔ "اِنسان ہے کہ کہ وہ پاک ہو؟اور وہ جو عورت سے پیدا ہوا کیا ہے کہ صادق ٹھہرے؟"(ایوب ۱۴:۱۵)۔ غرض یہ کہ جیسے خُدا کا ناپاک ہونا ممتنع (منع کرنے والا) ہے ویسے ہی اِنسان کا پاک ہونا محال ہے۔ اگر ملاپ ممکن ہے تو صرف طبعی ملاپ۔ اَے ناظرین! آپ نے خوب جان لیا کہ اگر خُدا اپنی جگہ رہ کر انسان کی نجات کا کوئی انتظام نہ کرے تواِنسان میں یہ صلاحیت مفقود (لاپتہ) ہے کہ "اُس پاکیزگی کو حاصل کرجس کے بغیر کوئی خُدا کو نہ دیکھے گا"۔ ہر شخص اپنے باطن میں اپنی ایسی بے بسی اور لاچاری کا وجدانی احساس ضرور رکھتا ہے۔ یہ اِنسان کی واقعی ناگفتہ بہ حالت کی اقرب (بہت نزدیک) الی الفطرت تصویر ہے۔ اس لئے طفل تسلیوں (بچوں کی طرح دلاسا دینے) سے کام نہیں چل سکتا۔ اپنی عیب دار اور گناہ آلودہ زندگی پر رحم کھانا چھوڑ دیجئے۔ اپنے آپ کو برابر ملامت کریں۔ اپنے آپ پر رحم کھانے اور اپنی بُری حالت کو رعایت کرنے سے زیادہ رُوح کی ہلاکت کا اور کوئی موجب نہیں۔ شریعتِ الٰہی اِنسان کی اسی مکروہ حالت کو اُس پر روشن کرتی ہے۔ "تاکہ اُس کا گناہ ہو نا ظاہر ہو۔ اور حکم کے ذریعے سے گناہ حد سے زیادہ مکروہ معلوم ہو"(رومیوں ۱۳:۷)۔ تاکہ وہ ایک طبیبِ رُوحانی کی ضرورت کا قائل ہو کر اُس کا متلاشی بن جائے۔

نجات بالکفارہ

ہم نے دلائل وبُراہین سے یقینی اور قطعی طور سے اس امر کو پایہ ثبوت تک پہنچا دیا کہ اِنسان اپنی ذاتی جد وجہد سے وہ پاکیزگی اور تنزیہہ (برہ باتوں سے دور رکھنا، عیب سے پاک کرنا) وتبریہہ (چھوڑنا) عن الخطا (خطا کے ساتھ) حاصل نہیں کر سکتا جو اُسے اَبدی زندگی غیر فانی خوشی اور خُدا کی مواصلت ومقاربت (نزدیکی وپیوستگی) کا استحقاق دلا سکے (امثال ۹:۲۰)۔ اور منقولی (نقل کیا گیا، لکھا ہوا) شہادت سے بھی اس دعویٰ کی صداقت و حقیقت کو خوب ثابت کر دیا۔ ایک دفعہ جب خُداوند مسیح نے اِنسانی جد وجہد کو حصول نجات کے متعلق ناکافی ومحال ثابت کیا تو لوگ حیران ہو کر کہنے لگے کہ "پھر کون نجات پا سکتا ہے؟" تو آپ نے فرمایا۔ "یہ آدمیوں سے تو نہیں ہو سکتا لیکن خُدا سے ہو سکتا ہے کیونکہ خُدا سے سب کچھ ہو سکتا ہے"(لوقا ۱۸:۲۷)۔ چنانچہ خُدائے رَحیم والعادل نے اِنسان خاطی وعاصی اور فاسد الخیال (بیہودہ خیال) کی ذاتی لاچاری وبے بسی کی حالت پر رحم فرمایا۔ اور اُس کے گناہوں کا مبادلہ اپنی طرف سے پیش کیا۔ "کیونکہ وہ کسی کی ہلاکت نہیں چاہتا۔ بلکہ یہ چاہتا ہے کہ سب کی توبہ تک نوبت پہنچے"(۲۔ پطرس ۳:۹)۔ اور یہی ایک آخری اور معقول طریقہ ہے جس سے خُدا عادل بھی اور رَحیم بھی ثابت ہو۔ اور انسان خاصی وعاصی (خطاکار اور گنہگار) کو نجات بھی دے۔" اُسے (مسیح کو) خُدا نے اُس کے خُون کے باعث ایک ایسا کفارہ ٹھہرایا جو ایمان لانے سے فائدہ مند ہو تاکہ جو گناہ پیشتر (مسیح سے پہلے) ہو چکے تھے۔ اور جن سے خُدا نے تحمل کر کے طرح دی تھی اُن کے بارے میں وہ اپنی راست بازی ظاہر کرے۔ بلکہ اسی وقت اُس کی راستبازی ظاہر ہو۔ تاکہ وہ خود بھی عادل رہے۔ اور جو یسوع پر ایمان لائے اُس کو بھی راست باز ٹھہرانے والا ہو" (رومیوں ۳:۲۵-۳۱)۔ اِنسان دُنی الُہمت اور فاسد الطبع کی ناداری استعداد (انسان دُنیا میں خراب طبیعت اور کسی لیاقت کے بغیر کوشش کرتا ہے) در بارہ (پھر سے) حصولِ نجات نے خُدا کی محبت کو مجبور کر دیا کہ وہ خود اُس کا فدیہ دے۔ اور اُس کو تمام آلودگیوں سے پاک کر کے اپنی قربت میں قبول فرمائے اور ابدی عذاب وہلاکت سے بچائے۔ چنانچہ "خُدا نے دُنیا سے ایسی محبت رکھی کہ اُس نے اپنا اکلوتا بیٹا بخش دیا۔ تاکہ جو کوئی اُس پر ایمان لائے ہلاک نہ ہو بلکہ ہمیشہ کی زندگی پائے"(یوحنا ۱۶:۳)۔ "کسی راست باز کی

خاطر بھی مشکل سے کوئی اپنی جان دے گا۔ مگر شائد کسی نیک آدمی کے لئے کوئی اپنی جان تک دے دینے کی جُرات کرے۔ لیکن خُدا اپنی محبت کی خوبی ہم پر یوں ظاہر کرتا ہے کہ جب ہم گنہگار ہی تھے تو مسیح ہماری خاطر موا"(رومیوں ۷:۵-۸)۔ایک بچہ جب گندگی سے اپنے لباس اور تن کو آلودہ کرلیتا ہے توماں اُس کی اس گندگی سے نفرت کرتی ہے۔اور اگرچہ بچہ آغوشِ مادر(ماں کی گود) میں جانے کے لئے ہاتھ پسارتا اور روتا ہے۔تاہم ماں اُس کی غلاظت کو دھوئے بغیر اُسے گود میں نہیں لیتی۔ لیکن ماں کو بچہ کی ذات سے نفرت نہیں ہوتی پر اُس کی غلاظت سے۔اور بچے میں خود کو صاف کرنے کی قابلیت نہیں ہوتی، بلکہ ماں خود اُسے دھوکر اپنی آغوش میں لے لیتی ہے۔اسی طرح خُدا اِنسان کی گناہ آلودہ و مکروہ حالت سے نفرت و گھِن کرتا ہے۔ کیونکہ وہ پاک و قُدوس ہے۔اور اُس کی محبت یہ گوارا نہیں کرسکتی کہ اِنسان ایسی مکروہ حالت میں مبتلا رہ کر ابد تک اُس سے جُدا رہے۔اور انسان میں خود کو پاک بنا لینے کی قابلیت وصلاحیت مفقود(لاپتہ) ہے۔اس لئے خُدائے رَحیم اور سرچشمہ الطاف واکرام نے خود اُس کی ناپاکی کو مسیح کے پاک ترین لہو سے دھویا۔اور وہ وعدہ جو اُس نے بنی نوعِ اِنسان کے ساتھ مسیح کے ظہور سے صدیوں پیشتر کیا تھا مسیح کی قُربانی میں پورا کیا۔ وہ وعدہ یہ تھا"میں نے تیری خطاوں کو گھٹا کی مانند اور تیرے گناہوں کو بادل کی مانند مٹاڈالا میرے پاس واپس آجا۔ کیونکہ میں نے تیرا فدیہ دیا ہے"(یسعیاہ ۲۲:۲۴؛۲۵:۴۳)۔خُداوند مسیح نے خُدا کے عدل کو اس صورت میں پورا کیا۔ کہ جو موت گناہ کے باعث اِنسان نے کمائی تھی وہ اپنے جسم پر لے لی۔اور یوں اُس کا کامل فدیہ دے کر تقاضائے عدلِ الٰہی کو پورا کیا۔اور رحم ومحبت الٰہی کو اس صورت میں پورا کیا کہ گنہگار جو ابدی ہلاکت کے حقدار تھے ہمیشہ کی زندگی کے وارث ٹھہرے۔ کہاں ابدی عذاب اور کہاں ابدی زندگی وخوشی۔"مگر اُس کے فضل کے سبب اُس مخلصی کے وسیلے سے جو اُس یسوع میں ہے مفت راستباز ٹھہرائے جاتے ہیں" (رومیوں ۲۴:۳)۔ کفارہ کے معنی میں"ڈھانپ دینا"۔خُداوند مسیح نے اپنے پاک کفارہ کے ذریعے اِنسان خاطی وعاصی کے گناہوں پر پردہ ڈالا۔ اور اُنہیں خُدا کی نظر سے چھپا دیا۔ کفارہ کی تعریف داؤد نبی یوں کرتا ہے"مبارک ہے وہ جس کی خطا بخشی گئی۔ اور جس کا گناہ ڈھانپا گیا"(زبور ۱:۳۲؛۲:۸۵)۔ آفرینشِ عالم(دُنیا کی پیدائش) کے اوائل(شروع) ہی میں جب آدم اور حوا گناہ میں گرنے کے باعث ننگے پائے گئے کفارہ کی ایک علامت ملتی ہے۔ وہ مجازی کفارہ تھا اور مسیح کے اس حقیقی اور عالمگیر کفارہ کی گویا تمثیل لکھا ہے۔"اور خُداوند خُدا نے آدم اور اُس کی بیوی کے واسطے چمڑے کے کرتے بنا کر اُنہیں پہنائے"(پیدائش ۲۱:۳)۔ وہ چمڑا کسی جانور کو مار کر لیا گیا تھا۔اور اُس سے اُن کی عریانی کو جو گناہ کے باعث محسوس ہوئی تھی ڈھانپا گیا۔اس سے ایک طرف تو اُنہیں دکھایا گیا کہ وہ موت جو تُم نے گناہ کرکے کمائی ہے کیا چیز ہے۔ کیونکہ اب تک اُنہیں موت کی کیفیت کا علم نہ تھا اور وہ عبرت ناک کیفیت حیوان کی موت سے اُن پر روشن کی گئی کہ تمہاری موت اس طرح ہوگی۔اور دوسری طرف چمڑے سے خود اُن کا ننگ ڈھانپ کر یہ ظاہر کیا کہ باوجود تمہاری اپنی خطا اور شقاوتِ قلبی(سنگدلی، دل کی بدمعاشی) کے میں خُود(خُدا) تمہاری عُریانی کو ڈھانپوں گا۔ مگر دُوسرے کی موت کے وسیلے جو تمہارے گناہ کا شریک نہ تھا۔"تمہاری خلاصی فانی چیزوں یعنی سونے چاندی کے ذریعے سے نہیں ہوئی۔ بلکہ ایک بے عیب اور بے داغ برّے یعنی مسیح کے بیش قیمت خون سے"(۱۔پطرس ۱۸:۱-۱۹)۔ مسیح پر درمیانی ہونے کی حیثیت سے جو سزاوار دھوئی وہ یہ طاقت رکھتی ہے کہ گویا گنہگاروں نے خود وہ سزا اُٹھالی جیسے دوا مریض و مریض دونوں کے درمیان آکر فنا ہوجاتی اور اپنی ہستی کھودیتی ہے۔اور مرض کو مریض سے جُدا کردیتی ہے۔اسی طرح مریضانِ گناہ اور مرضِ گناہ کے درمیان میں آکر مسیح نے اپنی ہستی کھودی۔اور ان دونوں کو ایک دوسرے سے یکسر جدا کردیا۔اگر مسیح ہر دو کے درمیان میں آکر دوا کی طرح اپنی ہستی نہ مٹادیتا تو گناہ و گنہگار کے مابین جدائی کا ہونا ناممکن ومحال تھا۔اور جیسے مریض کسی طویل عرصہ کی شدید مرض سے شفا پالینے کے بعد بہت عرصہ تک کمزور ونحیف(لاغر) رہتا ہے اور اُس کو مقوی ولحم پرواغذیہ(ایسی غذا جس سے قوت حاصل ہو) کی ضرورت ہوتی ہے۔اسی طرح خُداوند مسیح نے اپنی قُربانی کے ذریعے مریضانِ گناہ کو شفا کُلی تو بخش دی۔اب بعض بعض میں صرف کمزوری باقی رہتی ہے۔ وہ

کمزوری (رُوحانی کمزوری) رفتہ رفتہ رُوح القدس کے طفیل جو طاقت رُوحانی کا سرچشمہ ہے دور ہو جائے گی۔ "جب رُوح القدس نازل ہو گا تو تُم قوت پاؤ گے" (اعمال ۸:۱)۔ "رُوح بھی ہماری کمزوری میں مدد کرتا ہے" (رومیوں ۸:۲۶)۔ اُس کا پاک کفارہ گنہگاروں کے گناہوں کو ڈھانپ لیتا اور چھپا دیتا ہے۔ اُس کا پاک خون توبہ سے پہلے اور بعد کے تمام گناہوں کو دھوتا ہے۔ "اور اُس کے بیٹے یسوع کا خُون ہمیں تمام گناہ سے پاک کرتا ہے" (۱۔ یوحنا ۱:۷)۔ اور اُس کی قیمتی ولاثانی قُربانی گنہگاروں کو پاک وصاف کر کے خُدائے قدوس کی قُربت میں لے جاتی ہے۔ "مگر تُم جو پہلے دور تھے اب مسیح یسوع میں مسیح کے خون کے سبب سے نزدیک ہو گئے ہو۔ کیونہ وہی ہماری صلح ہے جس نے دونوں کو ایک کر لیا۔ اور جُدائی کی دیوار کو جو بیچ میں تھی ڈھا دیا" (افسیوں ۱۳:۲-۱۴)۔ ہم نے مسئلہ گناہ کے آخر میں گناہ کے تین نتائج بیان کئے ہیں۔ یعنی اوّل، طبعی بگاڑ، دوم، خُدا سے جُدائی اور سوم سزائے عدالت۔ پس خُداوند مسیح کا کفارہ گنہگار کو ان ہر سہ نتائج سے بلکل آزاد کرتا ہے اور بُری خواہش جو گناہ کی علت ہے اُس پر اثر انداز ہو کر اُس کو نیکی و پاکیزگی میں تبدیل کر دیتا ہے۔ تاکہ علّت کی تبدیلی سے معلول (صدور گناہ) میں تبدیلی ہو جائے۔ اور جب تک اِنسان کی طبعی خرابی کو معدوم (ناپید، ختم) کر کے اُس میں حصول کمال کی استعداد (لیاقت) پیدا نہ کی جائے وہ حقیقی اور بے نقص نیکی کرنے کے قطعی ناقابل ہے۔ عمل سے پہلے قوتِ عمل کی ضرورت ہے اور جب طبیعت پاک ہو گئی تو خُدا سے خود بخود میل ہو گیا۔ اور جب میل ہو گیا تو جُدائی نہ رہی اور نہ سزائے عدالت۔ جیسے ایک جنگلی انگور کے ساتھ ایک اصلی اور شیریں انگور کی شاخ کا پیوند لگانے سے اُس کی تُرش خاصیت رفتہ رفتہ شریں ہو جاتی ہے۔ اور انگور کی پُرانی فطرت مٹ کر ایک نئی فطرت اُس میں پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح خُداوند مسیح کے ساتھ جو خُدا واِنسان کا درمیانی اور پاک ہے ایمانی رنگ میں پیوند ہو جانے سے ایماندار لوگ درجہ بدرجہ خُدا کی صورت پر بدلتے جاتے ہیں۔ اور اُن کی پُرانی اِنسانیت (گناہ آلودہ طبیعت) مسیح کی قدرت وقدوسیت کی تاثیر سے زائل ہو کر نئی اِنسانیت (پاکیزہ طبیعت) پیدا ہوتی جاتی ہے۔ "وہ اپنی اُس قوت کی تاثیر کے موافق جس سے سب چیزیں اپنے تابع کر سکتا ہے ہماری پست حالی کے بدن کی شکل بدل کر اپنے جلال کے بدن کی صورت پر بنائے گا" (فلپیوں ۲۱:۳؛ عبرانیوں ۲:۱۲)۔

آپ نے فرمایا "میں انگور کا حقیقی درخت ہوں تُم ڈالیاں ہو۔ جو مجھ میں قائم رہتا ہے اور میں اُس میں وہی بہت پھل لاتا ہے۔ کیونکہ مجھ سے جُدا ہو کر تُم کچھ نہیں کر سکتے" (یوحنا ۵:۱۵)۔ "اس لئے کہ جب تو زیتون کے اُس درخت سے کٹ کر جس کیا اصل جنگلی ہے اصل کے برخلاف اچھے زیتون میں پیوند ہو گیا"۔ "اور جب جڑ پاک ہے تو ڈالیاں بھی ایسی ہی ہیں" (رومیوں ۲۴،۱۶:۱۱)۔ مسیح کے ساتھ پیوند ہونے سے مراد ہے دُعا میں لگے رہنا۔ کلام کی تلاوت کرتے رہنا اور مراقبہ (سب چیزوں کو چھوڑ کر خُدا کا دھیان کرنا) میں بیٹھ کر ہر روز مسیح کی حضوری کو محسوس کرنا اور اُس کی قُربانی اور لاانتہا محبت کا تصور کرتے رہنا۔ شبانہ روز (ہر وقت) مسیح کے ساتھ ایسا زندہ ایمانی تعلق رکھنا رُوحانی اصطلاح میں اُس کے ساتھ پیوند ہونا کہلاتا ہے۔ اور ایماندار کی رُوحانی تبدیلی کا راز اسی تعلق میں پوشیدہ ہے۔ رُوح القدس ایماندار کے اندر رہ کر اُس کو درجہ بدرجہ خُدا کی صورت پر بناتی ہے۔ اور وہ الوہیت نُما اِنسانیت جو اِنسان نے گناہ کی تاریکی میں کھودی تھی دوبارہ اِنسان کے اندر پیدا کرتی ہے۔ اس کے بگڑے ہوئے خدّ وخال (شکل و صورت)، بگڑی ہوئی طبیعت اور بگڑی ہوئی صورت کو نئے سرے سے خُدا کی صورت پر بناتی ہے اور رفتہ رفتہ اِنسان کے اندر گناہ مردہ ہوتا جاتا ہے، اور رُوح جو گناہ کے باعث مردہ تھی زندہ ہوتی جاتی ہے۔ "اگر مسیح تُم میں ہے تو بدن تو گناہ کے سبب سے مردہ مگر رُوح راست بازی کے سبب سے زندہ ہے" (رومیوں ۸:۱۰)۔ اور رُوح القدس ایک خارجی موثر (بیرونی اثر رکھنے والا) ہے اور مسیح کا قائم مقام۔ مسیح نے گنہگاروں کا مبادلہ ومعاوضہ عدلِ الٰہی کو دے دیا۔ اور وہ پچھلے قرضہ سے تو آزاد ہو گئے۔ لیکن اگر اُن میں آیندہ کے لئے حصول کمال کی استعداد (لیاقت) پیدا نہ کی جائے تو ضرور وہ پُرانی کمزوری کے زیر اثر پھر گناہ کریں گے۔ اس لئے اُن کی طبعی خرابی کو مٹانے اور ایک نئی پاکیزہ طبیعت اُن کے اندر پیدا کرنے کے لئے ضرور ایک زبردست

خارجی فاعل (باہر سے کام کرنے والا) درکار ہے اور وہ رُوح القدس ہے۔ چنانچہ رُوح القدس یہ کام کرتی ہے اور ایماندار کے باطن میں درجہ بدرجہ ایک نئی اِنسانیت کی تعمیر کرتی ہے۔ جیسے کوئی شخص اپنی تمام زندگی ایک ہی دن میں بسر نہیں کر سکتا۔ بلکہ رفتہ رفتہ عمر کے ابتدائی وسطی اور انتہائی مدراج کو طے کرتا جاتا ہے۔ اسی طرح اِنسان کی رُوحانی زندگی بھی بتدریج تمام عمر ترقی کرتی آخری کار رُوحانی کمالیت کو حاصل کرتی ہے۔ "اُس خُداوند کے وسیلے سے جو رُوح ہے ہم اُسی جلالی صورت میں درجہ بدرجہ بدلتے جاتے ہیں" (۲۔ کرنتھیوں ۱۸:۳؛ ۱۔ کرنتھیوں ۱۵:۴۹)۔

اس چمنستانِ فطرت (قدرت کا گلزار) میں پیدائش دو طرح کی ہے۔ ایک بیج کی اور دوسری پیوند کی۔ ہر شے بیج سے پیدا ہوتی ہے۔ یعنی جس جنس کا بیج بویا جاتا ہے اس سے اسی جنس کے پھل پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر گیہوں بویا جائے تو اُس کے پودے میں انگور نہیں اُگ سکتے بلکہ گیہوں۔ "کیا انجیر کے درخت میں زیتون اور انگور میں انجیر پیدا ہو سکتے ہیں؟" (یعقوب ۳:۱۲)۔ اور یہ بدیہی (ظاہر) حقیقت ہے کہ بیج کی خاصیت بھی بتمام وکمال (ساری کی ساری) پھل میں ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً اگر ایک تُرش خاصیت کا بیج بویا جائے تو اُس کے پودے میں ضرور تُرش پھل ہی لگیں گے۔ یہ تو ہے بیج کی پیدائش اب دوسری پیوند کی پیدائش ہے۔ یہ امر زیادہ تشریح کا محتاج نہیں کہ پیوند لگانے سے کسی بھی پھل کی خاصیت تبدیل کی جا سکتی ہے۔ وہ درخت جو تُرش خاصیت کے بیج کی پیدائش ہے اور جس میں ہمیشہ تُرش پھل کا لگنا ضروری ہے، شیریں خاصیت کی شاخ سے پیوند لگانے سے یکسر تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور آیندہ اُس میں کبھی کھٹے پھل نہیں لگتے۔ اس مثال سے ہمیں اِنسان کی نئی پیدائش کا ثبوتی تصور حاصل ہوتا ہے۔ اِنسان کی پیدائش بھی دو طرح پر ہے۔ جسمانی یا تخمی پیدائش۔ اور روحانی پیدائش (نئی پیدائش) حضرت ابوالبشر (آدم) جنسِ اِنسانی کا گویا بیج تھا جس سے تمام نوعِ اِنسانی کی پیدائش ہوئی۔ وہ خاکی تھا اور اُس کی طبیعت گناہ آلودہ ہو گئی۔ اس لئے اُس کی ناپاک طبیعت کا اثر اُس کی تمام نسل میں پشت در پشت متوارث (وراثت) طور پر چلا آیا۔ "جس طرح ایک آدمی کے سبب سے گناہ دُنیا میں آیا۔ اور گناہ کے سبب موت آئی اور یوں موت سب آدمیوں میں پھیل گئی۔ اس لئے کہ سب نے گناہ کیا" (رومیوں ۵:۱۲)۔ "پہلا آدم زمین سے یعنی خاکی تھا۔۔۔۔ اور جس طرح ہم اُس خاکی کی صورت پر ہوئے" (۱۔ کرنتھیوں ۱۵:۴۷، ۴۹)۔ یہ ہے اِنسان کی جسمانی (تخمی) پیدائش کا حال جس میں گناہ کا متوارث میلان (رجحان) اور نوعِ اِنسان کے فردِ اوّل کی طبعی ناپاکی کا اثر بدیہی (ظاہر) طور پر ظاہر ہے۔ اس لئے کلامِ الٰہی کا یہ فرمان حقیقت پر مبنی ہے کہ "سب نے گناہ کیا اور خُدا کے جلال سے محروم ہیں" (رومیوں ۳:۲۳؛ واعظ ۷:۲۰)۔ اسی واسطے اِنسان میں حقیقی نیکی کرنے کی طاقت نہیں ہے۔

اب رہی رُوحانی پیدائش وہ گویا پیوند کی پیدائش ہے جس طرح تُرش پھل کو بدلنے کے لئے ایک شیریں شاخ کا پیوند لازمی ہے۔ کیونکہ تُرش کے ساتھ تُرش ہی پیوند لگانا تحصیل حاصل ہے۔ اس سے کوئی تبدیلی واقع نہ ہو گی۔ اسی طرح اِنسان کی موروثی گناہ آلودہ طبیعت کو تبدیل کرنے کے لئے ایک بے گناہ اور پاکیزہ شخصیت کی ضرورت ہے جس کے ساتھ رُوحانی طور پر پیوند ہو جانے سے اِنسان کی پُرانی مائل بہ بدی طبیعت ایک نیک و پاک طبیعت میں تبدیل ہو جائے۔ اس کے متعلق کلام کا فرمان ملاحظہ ہو۔ "کیونکہ جس طرح ایک ہی شخص (آدم) کی نافرمانی سے بہت سے لوگ گنہگار ٹھہرے اُسی طرح ایک کی فرماں برداری سے بہت سے لوگ راستباز ٹھہریں گے" (رومیوں ۵:۱۹)۔ پس لا محالہ (یقیناً، بالضرور) وہ نئی پیدائش ہمیں خُداوند مسیح کے ساتھ پیوند ہونے سے حاصل ہوتی ہے۔ اُس نے فرمایا "میں انگور کا درخت ہوں تم ڈالیاں ہو جو مجھ میں قائم رہتا ہے اور میں اس میں وہی بہت پھل لاتا ہے کیونکہ مجھ سے جُدا ہو کر تُم کچھ نہیں کر سکتے" (یوحنا ۱۵:۵)۔ "اس لئے کہ جب تو زیتون کے اُس درخت سے کٹ کر جس کی اصل جنگلی ہے اصل کے برخلاف اچھے زیتون میں پیوند ہو گیا تو وہ جو اصل ڈالیاں ہیں اپنے زیتون میں ضرور ہی پیوند ہو جائیں گی" (رومیوں ۱۱:۲۴)۔

بیج والی پیدائش ہمیشہ نیچے سے ہوتی ہے اور پیوند والی اُوپر سے خُداوند مسیح نے فرمایا۔ ''تُم نیچے کے ہو میں اُوپر کا ہوں۔ تُم دُنیا کے ہو میں دُنیا کا نہیں ہوں'' (یوحنا۸: ۲۳)۔ ''جس طرح ہم اُس خاکی کی صورت پر ہوئے اُسی طرح اُس آسمانی کی صورت پر بھی ہوں گے'' (۱۔کرنتھیوں۱۵: ۴۹)۔ اور جو لوگ اپنے گذشتہ گناہوں سے سچی توبہ کرکے خُداوند مسیح پر ایمان لاکر اُس کے ساتھ روحانی رنگ میں پیوند ہو جاتے اور نئی پیدائش حاصل کرتے ہیں اُن کے متعلق کلام فرماتا ہے۔ ''تُم فانی تخم سے نہیں بلکہ غیر فانی سے، خُدا کے کلام (مسیح) کے وسیلے جو زندہ اور قائم ہے۔نئے سرے سے پیدا ہوئے ہو'' (۱۔پطرس ۱: ۲۳)۔ ''جو کوئی خُدا سے پیدا ہوا ہے وہ گناہ نہیں کرتا۔کیونکہ اُس کا تخم اُس میں بنا رہتا ہے بلکہ وہ گناہ کر ہی نہیں سکتا۔کیونکہ خُدا سے پیدا ہوا ہے۔(۱۔یوحنا۳: ۹؛کلسیوں ۳: ۹-۱۰؛فلپیوں ۳: ۲۱؛۲۔کرنتھیوں ۴: ۱۶)۔''جو جسم سے پیدا ہوا ہے جسم ہے۔اور جو روح سے پیدا ہوا ہے رُوح ہے'' (یوحنا۳: ۶)۔ جس بیج (آدم) سے نسلِ انسانی کی پیدائش ہوئی وہ ناپاک تھا۔اس لئے تمام نسل کا ناپاک ہونا عقلی ونقلی ہر دو طریق سے ثابت ہے۔ اس لئے خُدا کا فرمان اِنسان کے لئے ہے۔ ''میں جانتا تھا کہ تُو بالکل بے وفا ہے اور رَحم ہی سے خطاکار کہلاتا ہے'' (یسعیاہ ۴۸: ۸؛ زبور ۵۱: ۵؛۵۸: ۳؛پیدائش ۸: ۲۱)اور بغیر نئی پیدائش حاصل کئے اِنسان کا خُدا سے ملاپ ممتنع (منع کرنے والا) ہے کیونکہ اجتماعِ ضدین بحال ہے۔اس لئے خُداوند مسیح نے نیکدیمس سے کہا۔ ''میں تجھ سے سچ سچ کہتا ہوں کہ جب تک کوئی نئے سے پیدا نہ ہو وہ خُدا کی بادشاہت کو دیکھ نہیں سکتا'' (یوحنا۳: ۳)۔

اور جس طرح وضاحات مافوق سے ظاہر ہے نئی پیدائش خُداوند مسیح کے ساتھ ایمانی ورُوحانی رنگ میں پیوند ہونے سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ ایزد (خُدا) تعالیٰ کا مقرر کردہ واحد ذریعہ ہے جس سے نوعِ اِنسان کو مرضِ گناہ سے نجات اور خُدا کی مقاربت ومواصلت (نزدیکی) حاصل ہو سکتی ہے۔ ہم نے مسئلہ گناہ کے بیان میں یہ بھی ذکر کیا تھا کہ چونکہ ہمیشہ اشرف کے بگاڑ سے ادنیٰ کا بگاڑ لازم آتا ہے۔ لہٰذا گناہ نے اِنسان کی رُوحانی زندگی پر اثرانداز ہو کر رُوح کو مردہ کر دیا۔ جس سے جسم بھی بطورِ لازمی نتیجہ کے قبضہ موت میں آگیا۔اگر گناہ زندہ رہے تو روح مردہ رہے گی اور جب رُوح مردہ ہوگی تو جسم بھی موت کے قبضہ میں رہے گا (رومیوں ۷: ۹)۔خُداوند مسیح کے ساتھ پیوند ہونے سے گناہ مردہ ہو جاتا اور رُوح زندہ ہو جاتی ہے۔اور رُوح کے طور پر زندہ ہونے سے جسم بھی قبضہ موت سے چھوٹ کر بقا کو حاصل کرتا ہے۔ ''وہ پھر مرنے کے بھی نہیں'' (لوقا۲۰: ۳۶)''اس لئے ''اگر کوئی مسیح میں ہے تو وہ نیا مخلوق ہے۔پرانی چیزیں جاتی رہیں۔دیکھو وہ نئی ہو گئیں (۲۔کرنتھیوں۵: ۱۷)۔

خُلاصہ مطلب

۱۔اختیاری طریقہ سے گناہ کا ازالہ اور نجات محال ہے۔

۲۔جبری طریقہ سے گناہ کا ازالہ اور نجات محال ہے۔

۳۔بذریعہ تناسخ (آواگون، روح کا ایک قالب سے دوسرے قالب میں جانا) حقیقی نجات اس لئے محال ہے کہ اس کا تمام تردارومدار کرموں (اعمال) پر ہے۔ لیکن عمل سے پہلے قوتِ عمل درکار ہے۔

۴۔تزکیہ نفس (نفس کو پاک کرنا) وریاضتِ جسمانی سے نجات محال ہے۔

۵۔اعمال حسنہ سے نجات ملتی ہے۔ اس عقیدہ کے حامی اعمالِ حسنہ کو شرط ار نجات کو مشروط ٹھہراتے ہیں۔ لیکن دراصل نجات شرط اور اعمالِ حسنہ مشروط ہیں۔یعنی نیک اعمال سے نجات حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ نجات حاصل ہونے سے نیک اعمال ہو سکتے ہیں۔

۶۔توبہ محض سے نجات محال ہے۔اگرچہ حصولِ نجات کے لئے توبہ ضروری ہے۔

۷۔ خُدا کی صفات عدل و رحم کو ملحوظ رکھتے ہوئے اِنسان خود اپنی نجات کا انتظام نہیں کر سکتا۔

۸۔ قسری ملاپ سے اِنسان کی فعل مختاری قائم نہیں رہتی۔ الہٰذا حصول نجات کا یہ طریقہ غیر معقول ہے۔

۹۔ طبعی موافقت نجات کے لئے ضروری ہے لیکن پاک طبیعت کو حاصل کو لینا اِنسان کی دسترس (پہنچ) سے باہر ہے۔

۱۰۔ نجات بالکفارہ حصولِ نجات کے لئے آخری صحیح اور معقول طریقہ یہی ہو سکتا ہے۔

ایک اعتراض کا جواب

اکثر غیر مسیحی لوگ ہمارے معتقدات (اعتقاد رکھنے والے) سے عدم واقفیت کے باعث یہ اعتراض کیا کرتے ہیں۔ کہ جب خُداوند مسیح نے خطاکاروں کے عوض میں اپنی جان بطور مبادلہ کے دے دی تو اب وہ آزاد ہیں کہ کفارہ مسیح کی آڑ میں رُوسیاہی (بدکاری) کے کام کیا کریں۔ کیونکہ کفارہ ہو چکا اور یہ سوال ہمیشہ مقلدانِ مسیح (مسیح کے پیرو) پر ہی کیا جاتا ہے۔ واضح ہو کہ مقدس پولُس رسول خود ہی اس سوال کو پیدا کر کے اُس کا معقول جواب دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو (رومیوں ۱: ۶-۴؛ ۱۵-۱۸) ہم ایسے معترضوں سے مودبانہ طور سے پوچھتے ہیں کہ ایک مریض جو مرض سے تندرست کیا گیا کیا وہ اس لئے بار بار بیمار ہونے کی کوشش کرے کہ ادویہ اور حکیم اُس کے علاج کے لئے موجود ہیں؟ ہر گز نہیں۔ کوئی صحت یافتہ آدمی کبھی دوبارہ بیمار ہونے کی خواہش نہیں کرتا اگرچہ اُس کی شفاء کے سامان بکثرت موجود ہوں۔ اور اگر کوئی اسی غلط فہمی کے زیر اثر مسیح پر ایمان لانے کے بعد بھی دیدہ ودانستہ گناہ پر دلیر ہو جائے تو مسیح کا کفارہ اُس کو پناہ نہیں دے سکتا۔ وہ سزائے عدالت سے ہر گز بچ نہیں سکتا۔ ''کیونکہ جن لوگوں کے دل ایک بار روشن ہو گئے اور وہ آسمانی بخشش کا مزہ چکھ چکے اور رُوح القدس میں شریک ہو گئے اور خُدا کے عمدہ کلام اور آئندہ جہان کی قوتوں کا ذائقہ لے چکے۔ اگر وہ برگشتہ ہو جائیں تو اُنہیں توبہ کے لئے پھر نیا بنانا ناممکن ہے'' (عبرانیوں ۶: ۴-۸)۔ ''کیونکہ حق کی پہچان حاصل کرنے کے بعد اگر ہم جان بوجھ کر گناہ کریں تو گناہوں کی کوئی اور قُربانی باقی نہیں رہی'' (عبرانیوں ۲۶: ۱۰)۔ ''اُن پر یہ سچی مثل صادق آتی ہے کہ کتا اپنی قے کی طرف رجوع کرتا ہے اور نہلائی ہوئی سؤرنی دلدل میں لوٹنے کی طرف'' (۲۔ پطرس ۲۲: ۲)۔

جب ایک مُفلس و نادار کا ایک ہزار روپے کا قرضہ کسی رحمدل صاحبِ حیثیت نے ایک دفعہ بھر دیا اور اُس سے تاکید آکہہ دیا کہ جا پھر قرض نہ لینا ورنہ میں ذمہ دار نہ ہوں گا۔ تو باوجود اس احسان اور تاکید کے اگر وہ دیدہ ودانستہ پھر مقروض ہو جائے تو اپنے کئے کا پھل پائے گا۔ بقول

''ہر روز عید نیست کہ حلوہ خورد کسے''۔

خُداوند مسیح اپنی زمینی زندگی میں جب کبھی کسی کے گناہ معاف کرتے تھے تو فرماتے تھے۔ ''جا پھر گناہ نہ کرنا'' (یوحنا ۱۱: ۸)۔ ''پھر گناہ نہ کرنا ایسا نہ ہو کہ تجھ پر اس سے بھی زیادہ آفت آئے'' (یوحنا ۱۴: ۵)۔

ایک اور اعتراض کی امکانی گنجائش نظر آتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ شاید کوئی موجودہ مسیحیوں کی کوتاہیوں اور خامیوں کو دیکھ کر یہ کہے کہ جب کہ مسیح کے ساتھ پیوند ہونے سے اِنسان نیا مخلوق ہو جاتا ہے اور پُرانی ناپاک طبیعت سے اُس کو کُلی نجات حاصل ہو جاتی ہے تو کیا وجہ ہے کہ مسیحیوں کی عملی زندگیوں سے اس دعویٰ کا عملی ثبوت نہیں ملتا؟ اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ یہ تو صاف ظاہر ہے کہ تبدیلی پورے طور پر پیوند ہوئے بغیر نہیں ہوا کرتی۔ اگر پیوند میں کوئی نقص رہ جائے تو تبدیلی محال ہے۔ بے شمار ایسے مسیحی بھی موجود ہیں جو صرف نام کے مسیحی ہیں اور اُن کا چلن وہی ہے جو مسیح پر ایمان لانے سے پیشتر تھا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ وہ حقیقی معنوں میں مسیح کے ساتھ پیوند نہیں ہوئے۔ ایک تُرش انگور کا پودا شیریں انگور کے نزدیک لگا دیا

جاتا ہے۔اوراُس میں مطلق تبدیلی واقع نہیں ہوتی اور دوسرے ترش پودے کو شیریں انگور کے ساتھ پیوند کر دیا جاتا ہے۔اُس میں رفتہ رفتہ تبدیلی ہونی شروع ہو جاتی ہے یہی فرق نقلی اوراصلی مسیحی کا ہے۔ پس بعض نام نہاد نقلی مسیحیوں کی بُری سیرت کو ملحوظ رکھتے ہوئے لاکھوں دیندار مسیحیوں کو بھی ویسے ہی گندم نما جو فروش سمجھنا جائز نہیں۔ایک ضعیف البصر کی قلتِ بصارت (دیکھنے کی کمی) کے لحاظ سے اصحابِ بصارت قویہ کے مرئیات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ایک مفقود السماعت (سننے سے بے خبر) کے مسموعات کے انکار سے ایک صاحبِ سماعت صحیحہ کی قوتِ سماعت کا انکار لازم نہیں آتا۔ کھوٹے اور کھرے روپے میں بناوٹ وزن، مقدار اور چہرہ شاہی کے لحاظ سے مطلق فرق نہیں ہوتا۔ لیکن اُن کی آوازوں سے اُن کا کھوٹا یا کھرا ہونا ثابت ہوتا ہے۔اسی طرح نقلی اور مسیحی میں وجہ امتیاز اُن کی بدسیرتی اور خُوش سیرتی ہے۔"اچھا درخت اچھا پھل لاتا ہے۔اور بُرا درخت بُرا پھل لاتا ہے" (متی ۷:۱۷)۔

علاوہ ازیں ایسے مسیحی بھی ہیں جو مسیح کے ساتھ اچھی طرح پیوند ہو چکے۔اوراُس کی پیوند کی تاثیر واقعی اُن کی عملی زندگیوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ تبدیل شُدہ ہیں۔ لیکن بعض دفعہ پُرانی طبیعت کا خفیف سا (تھوڑا سا) اثر اُن میں باقی رہ جاتا ہے۔اوراُسی اثر کے ماتحت وہ شاذ و نادر ناکردنی افعال (نہ کرنے والے کاموں) کے مرتکب بھی ہو جاتے ہیں۔ مسیح کے ساتھ پیوند ہو جانے کے بعد بھی اکثر اُن میں پرانی طبیعت کی کوئی جڑ پھوٹ نکلتی ہے۔جیسا پولُس رسول فرماتا ہے۔"ایسا نہ ہو کہ کوئی کڑوی جڑ پھوٹ کر تمہیں دُکھ دے اوراُس کے سبب سے اکثر لوگ ناپاک ہو جائیں" (عبرانیوں ۱۵:۱۲؛استثنا ۱۸:۲۹)۔اگرچہ چراغ بجھا دیا جائے تاہم اُس کی کالک کا نشان چراغدان پر رہ جاتا ہے۔ لیکن جب مکان کی سفیدی کرنے کا وقت آتا ہے تو وہ کالک بھی مٹ جاتی ہے۔اگرچہ ایک قلعہ توڑ دیا جائے تاہم اُس کے کھنڈرات کچھ دیر تک پڑے رہتے ہیں۔ لیکن کھنڈرات میں قلعہ کی شان موجود نہیں ہوتی۔ایک وقت آتا ہے کہ وہ کھنڈرات بھی اُٹھادئے جاتے ہیں۔اگرچہ کمان میں سے تیر نکل جاتا ہے پر کچھ دیر تک سابقہ قوت کے اثر سے پھر بھی چلا متحرک رہتا ہے۔ وقت پاکر خود ہی ساکن ہو جاتا ہے۔پیوند لگانے کے بعد اُسی روز درخت تبدیل ہو کر اچھے پھل دینے نہیں لگ جاتا بلکہ اُس کی تبدیلی بتدریج (آہستہ آہستہ) ہوتے ہوتے ایک خاص اور مقررہ وقت میں انجام کو پہنچتی ہے۔یہی حال اِنسانی طبیعت کی تبدیلی کا ہے۔ نجات ایک مسلسل تدریجی حالت کا نام ہے۔ جس طرح کوئی شخص اپنی تمام عمر ایک ہی دن میں بسر نہیں کر سکتا۔اُسی طرح روحانی کمالیت، کامل پاکیزگی اور الوہیت نما اِنسانیت نجات یافتہ لوگوں کے اندر فوراً پیدا نہیں ہو جاتی۔ نجات کے بھی مدراج ہیں۔"مگر جب ہم سب کے بے نقاب چہروں سے خُداوند کا جلال اس طرح منعکس ہوتا ہے جس طرح آئینے میں تو اُس خُداوند کے وسیلے سے جو رُوح ہے ہم اُسی جلالی صورت میں درجہ بدرجہ بدلتے جاتے ہیں" (۲۔کرنتھیوں ۱۸:۳)۔

نجات کے مدارج

اِنسان کے اندر چار قوتیں مسلم ہیں۔ یعنی قوتِ شہوانی (قوتِ باہ، جنسی خواہش کی قوت)، قوتِ بہیمی (حیوانیت کی قوت)، قوتِ سبعی اور قوتِ ملکی (نیکی و پاکیزگی کی قوت)۔ مسیح پر ایمان لانے سے پیشتر اُس کی قوتِ ملکی ہر سہ قوتوں سے یہاں تک دبی ہوئی ہوتی ہے کہ اصلی نیکی و پاکیزگی کی صورت اُس سے پوشیدہ رہتی ہے۔اور وہ بت پرستی، گور پرستی، عناصر پرستی اور فطرت پرستی کا والا و شیدا (عاشق، فریفتہ) اور خالص توحید پرستی سے کوسوں دور ہوتا ہے۔اور ایسی باطل پرستی اور ہر قسم کا گناہ اُس کا مرغوب (پسندیدہ) معلوم ہوتا ہے۔اور ایسی مکروہ زندگی بسر کرتے ہوئے بھی وہ اپنے آپ کو پاک سمجھا کرتا ہے۔ لیکن مسیح پر ایمان لاتے ہی اُس کی زندگی میں ایک انقلابِ عظیم برپا ہو جاتا ہے اوراُس کی زندگی بتدریج مندرجہ ذیل چار مدراج کو طے کرتی ہے۔

درجہ اول۔ اس پہلے درجہ میں ایماندار کے اندر نیکی ایک حصہ اور گناہ تین حصہ ہوتا ہے۔ اور وہ ہمیشہ یہ محسوس کرتا رہتا ہے کہ میں بڑا گنہگار ہوں۔ یہاں تک کہ ''جس نیکی کا ارادہ کرتا ہوں وہ تو نہیں کرتا۔ مگر جس بدی کا ارادہ نہیں کرتا اُسے کرلیتا ہوں'' (رومیوں ۱۹:۷)۔ وہ اپنی گناہ آلود مکروہ زندگی سے نفرت کرتا اور اپنے آپ کو سب سے بڑا گنہگار سمجھتا ہے (۱۔ تیمتھیس ۱۵:۱)۔ اور مسیح کی نزدیکی میں رہنا زیادہ پسند کرتا ہے۔

درجہ دوم۔ اس درجہ میں ایماندار کے اندر نیکی دو حصہ اور گناہ بھی دو حصہ ہوتا ہے۔ یعنی نیکی اور گناہ کا میزان (ترازو) مساوی ہوتا ہے۔ اور ایماندار مسیح کے ساتھ پیوند ہو کر اپنے اندر پہلے کی بہ نسبت زیادہ قوت محسوس کرتا ہے۔ اور گناہ پر غالب آنے کے لئے رُوح القدس کی امداد حاصل کرتا ہے (رومیوں ۸:۲۶) اور کمزوری میں زور آور ہوتا جاتا اور گناہ کی کراہیت کو بزور محسوس کرتا ہے۔ اس درجہ میں رُوح کے اندرِ سفلی وعلوی (پستی اور عروج) عناصر میں جنگ ہوتی ہے۔ اور وہ گاہے گناہ پر غالب اور گاہے اُس سے مغلوب ہوتا رہتا ہے۔

درجہ سوم۔ اس درجہ میں ایماندار کے اندر نیکی تین حصہ اور گناہ صرف ایک حصہ رہ جاتا ہے۔ یعنی مسیح کی قوت کی تاثیر سے وہ روحانی طور پر کافی قوی ہو جاتا اور بہت شاذونادر ہی گناہ سے مغلوب ہوتا ہے۔ اور جب کبھی کسی خفیف سے خفیف گناہ کا ارتکاب بھی اُس سے ہو جاتا ہے تو اُس کے دل میں اس قدر اضطراب پشیمانی اور پچھتاوا پیدا ہوتا ہے کہ وہ پھر کبھی اُس گناہ کے نزدیک نہیں پھٹکتا۔ اور رُوح القدس ضمیر کو گناہ کے زنگ سے صاف کر کے اس قدر ذکی الحس (زود فہم، ذہین) بنا دیتا ہے کہ وہ معمولی کوتاہیوں پر بھی اپنے فرائض کو نہایت سختی سے انجام دینے لگتا ہے۔ اس درجہ میں پہنچ کر ایماندار کو خیالی گناہوں سے بھی جنگ کرنا پڑتا ہے۔ اُس کی نفسانی خواہش قریب قریب مردہ ہو جاتی ہے۔ اُس کا میلانِ طبع گناہ کی طرف سے ہٹ کر نیکی کی طرف لگ جاتا ہے۔ پھر اُس سے عملی گناہ تو شاذونادر ہی سرزد ہوتا ہے۔ صرف خیالی گناہ کبھی کبھی اُس کی ضمیر کو ٹھوکر لگاتا ہے۔ اور ضمیر بدی کے خیال ہی چونک اُٹھتا ہے۔ اور اس قدر قوی اور سریع الحس (جلدی کرنے والا، شتاب) ہو جاتا ہے کہ اِنسان کو کبھی دائرہ جائز سے نکل کر دائرہ ناجائز وناواجب میں جانے نہیں دیتا۔ اور انسان کی ہر سہ سفلی (پستی) قویٰ قوتِ ملکی کے تابع ہو جاتی ہیں۔ اور وہ اپنی زندگی کو ایک غالب زندگی سمجھتا ہے۔ تو بھی پُرانی اِنسانیت کا خفیف سا اثر اُس کے اندر باقی رہ جاتا اور اکثر اوقات اُس کی رُوح پر خلش لگاتا ہے۔ لیکن ایماندار اب گناہ کا غلام نہیں بلکہ راست بازی کا غلام ہو جاتا ہے۔ اور دیگر گناہ زدہ رُوحوں کو بچانے کی تڑپ اُس کے اندر بہت بڑھ جاتی ہے۔

درجہ چہارم۔ اس درجہ میں ایماندار کے اندر نیکی چار حصہ اور گناہ صفر ہوتا ہے۔ یعنی وہ سراسر پاک وراست بن کر خُدا کی طبیعت پر مطبوع ہو جاتا اور گناہ و نفسانیت کی غُلامی سے کُلی طور پر آزاد ہو جاتا ہے۔ اب خیالی گناہ کا بھی امکان مٹ جاتا ہے۔ بداندیشی اور بدخیالی کے لئے اُس کے دل میں مطلق گنجائش ہی نہیں رہتی اور وہ کاملِ اِنسان اور خُدا کے بیٹے کا ہم شکل بن جاتا ہے۔ تمام سفلی طاقتیں اُس کی قوتِ ملکی کے تابع ہو جاتی ہیں۔ اور خیالی یا عملی گناہ کا پھر کوئی امکان نہیں رہتا۔ اور اس چوتھے درجہ کے کامل ایماندار کے متعلق کلام یہ فرماتا ہے ''جو کوئی خُدا سے پیدا ہوا ہے وہ گناہ نہیں کرتا۔ کیونکہ اُس کا تخم اُس میں بنا رہتا ہے بلکہ وہ گناہ کر ہی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ خُدا سے پیدا ہوا ہے'' (۱۔ یوحنا ۹:۳)۔ وہ الوہیت نما اِنسانیت یا خُدا کی صورت جو

گناہ کے باعث مٹ چکی تھی۔ ایسے ایمانداروں کو پوری کمالیت کے ساتھ حاصل ہوجاتی ہے۔ اور وہ پھر خُدا کی مانند اور خُدا کی صورت پر بن کر اُس کے فرزند کہلاتے اور وصالِ الٰہی و مقاربتِ وجود لا متناہی (لامحدود خدا سے قربت) سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ یہ نجات کا کمال ہے۔

کفارہ مسیح کی وسعت بلحاظ تاثیر

خُداوند مسیح نے تمام جہان کے گناہوں کی معافی کی خاطر کفارہ دیا۔ یہ نہیں کہ اُس کی قربانی کے وقت سے لے کر قیامت کے زمانے تک کے درمیانی عرصہ کی دُنیا کے لئے بلکہ آدم سے لے کر یوم الحشر تک کی تمام دُنیا کے لئے اُس نے اپنی قیمتی قُربانی دی۔ کوئی ایسا زمانہ نہیں جس کے گناہوں پر اُس کی قُربانی اثرانداز نہ ہوسکے۔ یعنی اُس کا کفارہ آفرینشِ عالم (دُنیا کی پیدائش) سے لے کر روزِ عدالت تک کے گناہوں کو ڈھانپ دینے اور دھودینے کے لئے خُدائے حکیم وقدیر کے ازلی ارادہ میں موجود تھا۔ لیکن اُس کا ظہور ایک خاص زمانہ میں ہوا۔ چونکہ تقدم وتاخر زمانی (پہلا یا آخری زمانہ) خُدا کے لئے بے حقیقت ہیں۔ یہ تین زمانے تو محدودات و محدثات ہی سے متعلق ہیں۔ خُدا کے لئے ہمیشہ حال ہی حال ہے۔ اس لئے اُس کی وسیع العلمی کے مطابق مسیح کا کفارہ ازل سے ہوچکا تھا۔ ''اور زمین کے وہ سب رہنے والے جن کے نام اُس برّے (مسیح) کی کتابِ حیات میں لکھے نہیں گئے جو بنائے عالم کے وقت سے ذبح ہوا ہے۔ اُس حیوان (ابلیس) کی پرستش کریں گے'' (مکاشفہ ۱۳:۸)۔ ''جس نے ہمیں نجات دی اور پاک بُلاوے سے بلایا۔ ہمارے کاموں کے موافق نہیں بلکہ اپنے خاص ارادے اور اُس فضل کے موافق جو مسیح یُسوع میں ہم پر ازل سے ہوا۔ مگر اب ہمارے منجی مسیح یُسوع کے ظہور سے ظاہر ہوا جس نے موت کو نیست اور زندگی اور بقا کو اُس خُوش خبری (انجیل) کے وسیلے سے روشن کردیا'' (۲۔ کرنتھیوں ۹:۹–۱۰؛ ۱۔ پطرس ۱:۲۰؛ کلسیوں ۱:۲۶؛ رومیوں ۱۶:۲۵-۲۶؛ افسیوں ۳:۹؛ ططس ۱:۲؛ افسیوں ۱:۹-۱۰؛ رومیوں ۳:۲۵)۔

کفارہ مسیح کے تحقق خارجی سے پیشتر کی دُنیا اُس الٰہی انتظام پر جو اُن کی مغفرت ونجات کے لئے خُدا کی رحمانیت عامہ اور فیضان تامہ (ہر ایک کے لیے فیض) سے ظہور پذیر ہوا، ایمان لاکر اپنے گناہوں کی بخشش اور تقرب الٰہی (خُدا کی قربت) کو حاصل کرسکتی ہے۔ ''اُسے خُدا نے اُس کے خون کے باعث ایک ایسا کفارہ ٹھہرایا جو ایمان لانے سے فائدہ مند ہوتا کہ جو گناہ پیشتر (قبل از کفارہ مسیح) ہوچکے تھے۔ اور جن سے خُدا نے تحمل کرکے طرح دی تھی اُن کے بارے میں وہ اپنی راستبازی ظاہر کرے۔ بلکہ اسی وقت اُس کی راستبازی ظاہر ہو۔ تاکہ وہ خود بھی عادل رہے۔ اور یُسوع پر ایمان لائے اُس کو بھی راستباز ٹھہرانے والا ہو'' (رومیوں ۳:۲۵-۲۶)۔ اب کوئی سوال کرے گا کہ مسیح کے ظہور سے پہلے کی دُنیا اُس کے کفارہ پر کیسے ایمان لاسکتی ہے جس حال کہ وہ اُن کے زمانہ میں موجود ہی نہ تھا۔ واضح ہو کہ ہم مسیحی یہ مانتے ہیں اور کلام بھی اس کی شہادت دیتا ہے کہ خُداوند مسیح نے مردوں میں سے زندہ ہوکر اور عالمِ ارواح میں پہنچ کر اپنے ظہور سے پہلے کی تمام دُنیا کو بشارت دی۔ ''اِسی میں اُس نے جا کر اُن قیدی رُوحوں میں مُنادی کی جو اُس اگلے زمانہ میں نافرمان تھیں۔ جب خُدا نُوح کے وقت میں تحمل کرکے ٹھہرا رہا تھا'' (۱۔ پطرس ۳:۱۹-۲۰؛ ۴:۶)۔ چُنانچہ اُن روحوں میں سے جو خُداوند مسیح کے پاک کفارہ پر ایمان لائی ہوں گی وہ بچ جائیں گی اور نجات پائیں گی۔ اور جو ایمان نہ لائیں وہ سزائے عدالت کی مستوجب ٹھہریں گی۔ عدالت کا ایک خاص دن ہے اُس میں تمام باغی اور نافرمان رُوحیں سزا پائیں گی۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ ازمنہ سابقہ (قدیم زمانہ) کی ارواح نیست ہوچکیں ہر گز نہیں۔ بلکہ خُدا نے ہر زمانے کی ارواح کو عدالت کے دن کے لئے قائم رکھا ہے۔ ''مگر اس وقت کے آسمان اور زمین اُسی کلام (کلمتہ اللہ) کے ذریعے سے اس لئے رکھے ہیں کہ جلائے جائیں۔ اور وہ بے دین آدمیوں کی عدالت اور ہلاکت کے دن تک محفوظ رہیں گے'' (۲۔ پطرس ۳:۷)۔ ''وہ بدکاروں کو عدالت کے دن تک سزا میں رکھنا جانتا ہے'' (۲۔ پطرس ۲:۹؛ ۲:۴؛ یہوداہ ۱:۶)۔ پس خُداوند مسیح کی قُربانی تمام زمانوں کے گنہگاروں کے واسطے دی گئی اور جیسے ایک قیمتی لعل

اکیلا ہی لاکھوں روپے کے قرض سے سبکدوش(آزاد) کر دیتا ہے اُسی طرح اُس واحد پاکیزہ اور بیش بہاالٰہی شخصیت کا فدیہ تمام زمانوں اور جہانوں کے قرضوں اور گناہوں کے لئے کافی ٹھہرا۔ ''جس طرح ایک ہی شخص کی نافرمانی سے بہت سے لوگ گنہگار ٹھہرے اُسی طرح ایک کی فرماں برداری سے بہت سے لوگ راستباز ٹھہریں گے''(رومیوں۱۹:۵)۔

خُداوند مسیح کی قُربانی میں دُنیا کی وہ سب قُربانیاں جو کسی نیک اور راست اصول کی وفاداری اور حمایت میں دی گئیں ایسے چھپ جاتی ہیں جیسے آفتاب کے لاانتہانُور میں ستاروں کی ننھی ضیا پاشی (روشنی) چھپ جاتی ہے۔ مسیح کی موت میں ابدی اور غیر فانی زندگی کا راز سربستہ تھا، جواُس کے زندہ ہونے پر بے نقاب ہو گیا۔ جو موت نالائق حرکات اور ناراست افعال کے ارتکاب کا نتیجہ ہو وہ واقعی قابلِ نفرت اور لعنتی موت ہو سکتی ہے لیکن وہ موت جو ناراستوں اور گنہگاروں کو بچانے کے لئے ایک راست باز پر آتی ہے وہ بذاتہٖ لعنتی موت نہیں جو زرِ فدیہ کسی قیدی کی آزادی کی خاطر دیا جاتا ہے۔ وہ روپیہ لعنتی نہیں ہوتا بلکہ اُس کی لعنت کو دھو دینے اور مٹا دینے والا۔ لعنت بلحاظ جُرم کے ہوتی ہے نہ کہ فدیہ کے لحاظ سے۔ مسیح کی موت کو لعنتی موت گنہگاروں کی لعنتی حالت کی نسبت سے کہا گیا ہے۔ لعنت کے اصل مفہوم کا اُس کی ذات پاک پر اطلاق مطابقی اور واقعی نہیں ہے۔ اُس ''راست باز نے ناراستوں کی خاطر دُکھ اُٹھایا''(۱۔پطرس۱۸:۳)۔نہ کہ اپنی کسی ناراستی کے باعث۔اسی واسطے ''موت کا دُکھ سہنے کے سبب جلال اور عزت کا تاج اُسے پہنایا گیا ہے''(عبرانیوں ۹:۲؛فلپیوں ۹:۲–۱۱)۔ پس اَے مریضان گناہ! اور عاصیان بے پناہ! آج ہی پنبہ (روئی) غفلت کانوں سے نکالئے۔اور ذرا ہوش سنبھالئے۔ ''دیکھو اب قبولیت کا وقت ہے دیکھو یہ نجات کا دن ہے''(۲۔کرنتھیوں ۲:۶)۔

ابدی زندگی اور ابدی سزا

اکثر غیر مسیحی لوگ ہمارے متعقدات و مسلمات سے عدم واقفیت کے باعث ابدی زندگی اور ابدی سزا(بہشت و دوزخ) کے مسئلہ کے متعلق غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں۔ ہم نہایت اختصار (مختصر طور پر) سے اس مسئلہ لاجواب اور طریقِ صواب (نیک کام) پر روشنی ڈالیں گے۔ جس سے شکوک و شبہات کی تاریکی دور ہو کر مطلع صاف ہو جائے گا۔ بشر طیکہ معترضین و مشککین (اعتراض اور شک کرنے والے) تعصب وہٹ دھرمی (بے ایمانی، بے انصافی) کی سیاہ عینکوں کو چشم بصیرت (دیکھنے والی آنکھ) سے اُتار کو امورِ غیبیہ (پوشیدہ کاموں) اور حقائق مخفیہ (پوشیدہ حقیقتیں) کی جستجو صدق دلی سے کریں۔

واضح ہو کہ ''جو لوگ اس لائق ٹھہریں گے کہ اُس جہان کو حاصل کریں اور مردوں میں سے جی اُٹھیں اُن میں بیاہ شادی نہ ہو گی۔ کیونکہ وہ پھر مرنے کے بھی نہیں۔ اس لئے کہ فرشتوں کے برابر ہوں گے اور قیامت کے فرزند ہو کر خُدا کے بھی فرزند ہوں گے''(لوقا۳۵:۲۰-۳۶)۔ اور اُن کی سکونت کے لئے ''نیا آسمان اور نئی زمین ہو گی جن میں راستبازی بستی رہے گی''(۲۔پطرس ۱۳:۳)۔ ''اُن کو بھوک اور پیاس نہ لگے گی۔ نہ دھوپ اور گرمی ستائے گی''(مکاشفہ ۶:۷)۔ ''پھر وہاں موت نہ ماتم نہ درد نہ آہ نالہ رہے گا۔ پُرانی چیزیں جاتی رہیں گی اور سب کچھ نیا ہی ہو گا''(مکاشفہ ۳:۲۱-۴)۔ وہاں اس مادی دُنیا کے لذائذ و حظائظ (لذتیں)، خواہشات و عادات، گناہ و ظلمت، مصائب و شدائد اور رنج وآلام (الم کی جمع، رنج و غم) وغیرہ ان کی لازوال ابدی اور غیر فانی رُوحانی خوشیوں میں رخنہ اندازی (مزاحمت، خلل) نہ کر سکیں گے۔ بلکہ اِن تمام کدوراتِ سِفلیہ (پستی کی نفرتیں)۔ اغشیہ جسمانیہ اور اہویہ نفسانیہ (جسم کی خواہش) کا وہاں قطعی امکان و گنجائش نہ ہو گی۔ اور راستباز جنتی لوگ خُدا کی عین ذات نہ ہوں گے بلکہ غیر ذات۔ اور طبائع قدسیہ وصفاتِ ملکوتیہ (فرشتے صوفیوں کی اصطلاح میں عالم ارواح) کے باعث خُدائے قدوس سے مشابہت و مماثلت قریبی رکھیں گے۔ ''اُس

وقت راستباز اپنے باپ کی بادشاہت میں آفتاب کی مانند چمکیں گے"(متی۴۳:۱۳)۔اور وہ تاابد خُدا کی مقاربت ومجالست (قربت کی مجلس) میں رہیں گے اور اُس کی عبادت کریں گے (مکاشفہ ۳:۲۲-۵)۔ جب راستباز اس فانی زندگی کو چھوڑ کر ابدیت کی پُر سرور ولاانتہا عملداری میں داخل ہو کر اس جسمانی زمانہ کی طرف دیکھیں گے تو وہ ایسا ہی مختصر نظر آئے گا گا جیسا وہ دو اڑھائی گھنٹہ کا عرصہ جس میں فلم کے اداکار ایک طول طویل زندگی کے واقعات دکھا کر ڈراپ سین کر دیتے ہیں۔ اور تمام اشیاء غیر فانی ہو کر خُداوند مسیح میں اُن کا مجموعہ ہو جائے گا (افسیوں ۱۰:۱)۔ لیکن خبیث الطینت (ناپاک طبیعت) وشریر النفس (برے لوگ) لوگ اسفل السافلین (پاتال، جہنم) میں گرائے جائیں گے۔ اور راستبازوں سے بالکل الگ رہ کر ابدی عذاب میں دانت پیسیں گے اور روئیں گے۔ اور کلامِ مقدس میں جو دوزخ کی ہولناک تصویر آگ گندھک اور دیگر ضرر رساں اشیاء کے پیرائے پیش کی گئی ہے۔ وہ محض تشبیہی و تمثیلی بیانات ہیں۔ دراصل منکران خُدا کی طبائع کدوراتِ سفلیہ اور خواہشات ذمیمہ وقبیحہ (برائی اور خرابی کی خواہش) کے باعث خُدا کی پاکیزہ طبیعت کے مخالف ومتضاد ہوں گی۔ اُن کا دُکھ وعذاب یہی ہو گا کہ جس طرح الو اور چمگادڑ بباعثِ تخالف طبائع (طبیعت کے خلاف) آفتاب کے طلوع سے خوش نہیں ہوتے بلکہ بہت دکھ محسوس کرتے اور اندھیرے میں چھپ جاتے ہیں۔ اسی طرح بلکہ اس سے بدرجہا زیادہ سیاہ کار لوگ اپنی چُغد طینتی (الو کی خصلت) وخفاش (چمگادڑ) فطرتی کے باعث خُدا کے جلال کی تجلی کی برداشت نہ کر سکیں گے۔ اور جب جب خُدا کی تجلی کا ظہور ہوا کرے گا تو راستباز تو تطابق وتوافق طبائع کے باعث اس سے بے حد خُوشی حاصل کیا کریں گے۔ اور دوزخی لوگ بباعث تخالف وتضاد طبائع (طبیعت کے خلاف کام ہونے کے باعث) اس سے بے حد دُکھ وعذاب محسوس کریں گے۔ اور انتہائی بے چینی وبے قراری میں ایسے تڑپیں گے جیسے مچھلی دہکتے ہوئے کوئلوں پر۔ اور راست بازوں کے نورانی چہروں کی تجلی کو بھی وہ برداشت نہ کر سکیں گے۔ جیسے جب موسیٰ کا چہرہ خُدا کی حضوری میں رہنے کے باعث نہایت نورانی ہو گیا تھا تو لوگ اُس سے دہشت کھاتے تھے۔ یہاں تک موسیٰ کو اپنے چہرے پر نقاب ڈالنا پڑا (خروج ۲۹:۳۴-۳۵؛ ۲۔کرنتھیوں ۷:۳)۔ اور خُداوند مسیح کی شبیہ مبارک جب کوہ حرمون پر نورانی ہو گئی تو شاگرد بہت ڈر گئے تھے (متی ۶:۱۷؛ مرقس ۶:۹)۔ اسی طرح راست بازوں کے نورانی چہرے بھی ہلاکت کے فرزندوں کے خرمنِ (کھلیان، غلہ کا انبار) امن وطمانیت (اطمینان، تسلّی) پر بجلیاں گرائیں گے۔ خُدا کی زندگی سے خارج ہونا ہی اُن کی ہلاکت ہے۔ اور خُدا کی طبیعت کے اُن کی طبائع کا مخالف ہونا ہی اُن کا انتہائی دُکھ ہے۔ اسی وجہ سے خُدا کی تشبیہاً بھسم کرنے والی آگ کہا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو (استثنا ۲۴:۴؛ ۳:۹؛ خروج ۱۷:۲۴؛ یسعیاہ ۱۴:۳۳؛ عبرانیوں ۱۲:۲۹)۔ وہی آگ تھی جو جھاڑی میں لگی ہوئی موسیٰ کو نظر آئی۔ وہی آگ کا ستون بدلی میں ہو کر رات کو بنی اسرائیل کی رہبری کرتا تھا۔ وہی آگ تھی جس کے متعلق مسیح نے فرمایا کہ میں دُنیا میں آگ لگانے آیا ہوں۔ وہی آگ عیدِ پنتکوست کے دن شاگردوں پر ظاہر ہوئی۔ اُسی نور نے دمشق کی راہ پر ظاہر ہو کر پولُس رسول کی ہدایت فرمائی تھی۔ وہی آگ تھی جو جزیرہ پتمس میں یوحنا پر ظاہر ہوئی۔ اور اُسی آگ (خُدا کی تجلی) کا بیان منکرانِ خُدا کے خلاف یوں ہے۔ "ہاں عدالت کا ایک ہولناک انتظار اور غضب ناک آتش باقی ہے جو مخالفوں کو کھائے گی" (عبرانیوں ۲۷:۱۰)۔ صرف تضاد طبائع (اُلٹ طبیعت) کی بات ہے ورنہ دوزخ کسی آگ کی بھٹی کا نام نہیں ہے۔ بندہ ان خیالات کا خود ذمہ دار ہے اور اس تعلیم کی جواز یا عدم جواز کی ذمہ داری میرے سوا اور کسی پر عائد نہیں ہوتی۔

آخری التماس

پیارے ناظرین! آپ نے اس کتاب کے مطالعہ سے انجیل کے اسرارِ سربستہ (پوشیدہ) اور رموز دقیقہ (مشکل بھید) کو کافی طور پر سمجھ لیا۔ اب نہایت غور طلب امر یہ ہے کہ جس قدر رُوح جسم سے اعلیٰ ہے اُسی قدر رُوحانی غلامی بھی جسمانی غلامی سے بڑی ہے۔ جسمانی امراض تو جسم کے فنا ہونے

پر مِٹ جاتے ہیں۔ لیکن رُوح غیر فانی ہے۔ اس لئے رُوحانی مرض (گناہ) رُوح کے ساتھ تاابد رہ کر اُس کو خُدائے قدوس سے ہمیشہ کے لئے جُدا رکھے گا۔ اور ابدی سزا کا مستوجب (لازم) ٹھہرائے گا۔ تمام مذاہب کی غرضِ مشترک نجات ہے۔ اور سب نجات نجات پکارتے بھی ہیں۔ لیکن حقیقی نجات دلانے کی صلاحیت سے بے نصیب ہیں۔ جس طرح ہماری مادی وجسمانی زندگی کو قائم رکھنے کے لئے خُدائے قدیر وحکیم نے کارخانہ فطرت میں ایک ہی سے سامان پیدا کردئے ہیں۔ اور وہ ہماری جسمانی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اس قدر مکتفی (کافی) ہیں کہ ان سے بہتر کی حاجت نہیں۔ اُسی طرح ہماری رُوحانی زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے بھی ایک ہی ایسا کافی ووافی اور کامل انتظام ہونا چاہئے کہ جس سے بہتر کا امکان نہ ہو۔ اور وہ مسیحیت اور اُس کا ہیرو خُداوند مسیح ہے۔ واضح ہو کہ گھڑی اپنے بگڑے ہوئے پُرزوں کو خود ہی درست نہیں کرسکتی بلکہ گھڑی ساز جس کے ہاتھوں نے اُس کو بنایا۔ اسی طرح جس قدرت نے اس اِنسانی مشینری کو بنایا وہی قدرت اُس کے بگڑے ہوئے پرزوں کو درست کرسکتی ہے۔ پس کلمۃ اللہ (مسیح) تمام کائنات کا آفرنیندہ (پیدا کرنے والا) ہے (یوحنا ۱: ۱-۳؛ کلسیوں ۱۵:۱-۱۷) اور وہی اِنسانی مشینری کے زنگ خوردہ (گناہ آلودہ) پُرزوں کو درست کرکے دوبارہ اُس کو شبیہ اللہ پر بحال اور خُدا کی طبیعت پر مطبوع (چھپاہوا، پسند کیا گیا، دل پسند) کرنے والا ہے (فلپیوں ۲۱:۳؛ ۱۔کرنتھیوں ۱۵: ۴۹)۔ مرِدہ نبیوں اور پیغمبروں اور اوتاروں سے اپنی نجات وشفاعت کی اُمید رکھنا ایسا ہی عبث ہے جیسے کوئی مجرم مردہ وکیل کی قبر پر جاکر اُس سے اپنے مقدمے کی پیروی کی التجائیں کیا کرے۔ مرِدہ زندہ کی وکالت نہیں کرسکتا۔ خُداوند مسیح ابد تک گنہگاروں کی شفاعت ورستگاری (نجات) کے لئے زندہ ہے۔ ''اسی لئے جو اُس کے وسیلے سے خُدا کے پاس آتے ہیں۔ وہ اُنہیں پوری پوری نجات دے سکتا ہے کیونکہ وہ اُن کی شفاعت کے لئے ہمیشہ زندہ ہے'' (عبرانیوں ۲۵:۷)۔

پس اَے مُتلاشیانِ جادہ حق (حق کی تلاش کرنے والو) اور طالبان راہِ نجات (نجات کی راہ کے طالبو) صحرائے ضلالت (صحرا میں گمراہ) کی بادیہ پیمائی (جنگلوں میں پھرنا) سے باز آیئے۔ تعصب، ہٹ دھرمی اور فضول کی نکتہ چینیوں کی گردوغبار کو اپنے دامن دل سے جھاڑیئے۔ اور مسیحیت کی مخالفت ہمیشہ اندھے ہو کر نہ کیجئے۔ کب تک آپ سچائی کی تحقیر پر کمربستہ رہیں گے اور ملک کی یہ ذلیل وپست ذہنیت کب تک فضائے امن کو مکدر (گدلا، میلا، ناراض) بنائے رکھے گی۔ یاد رکھو مسیحیت کی مخالفت کرنا خُدا کی ہستی سے منکر ہونے کے مترادف ہے۔ آیئے اور اپنے گناہوں سے توبہ کیجئے۔ خُداوند مسیح پر جو خُدا کے رَحم وفضل کا ظہور ہے صدقِ دل سے ایمان لاکر بپتسمہ پایئے۔ تو آپ نجات پائیں گے اور کسی دوسرے کے وسیلے سے نجات نہیں ''کیونکہ اس آسمان کے تلے آدمیوں کو کوئی دوسرا نام نہیں بخشا گیا۔ جس کے وسیلے سے ہم نجات پاسکیں'' (اعمال ۱۲:۴)۔ خُدا آپ کی ہدایت ورہنمائی فرمائے۔

آمین!